## انٹرویو



## ناول



## مکمل ناول



## ناولٹ



## افسانے






ستمبر 2022
جلد 36 شمارہ 01
قیمت 120 روپے




زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک
پاکستان (سالانہ) ——— 1,440 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ ——— 21000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ——— 24000 روپے
subscriptions@khawateendigest.com



MEMBER APNS CPNE
رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپر ایڈیٹرز


## مستقل سلسلے




رضیہ جمیل نے ... پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔
Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872.
Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com

ستمبر کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔

بارش اور سیلاب نے تقریباً پورے ملک میں جو تباہی مچائی ہے، اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ سندھ، بلوچستان اور جنوبی پنجاب ڈوب رہے ہیں۔ کھڑی فصلیں تباہ ہو گئیں۔ مویشی سیلاب کی نذر ہوئے۔ وہاں کے باسی بے یارومددگار ہیں، ان کے قدموں تلے زمین نہیں پانی ہے اور سر پر چھت نہیں آسمان سے برستا پانی ہے۔ مین اسٹریم میڈیا تو خیر اس صورت حال سے بے خبر ہے لیکن سوشل میڈیا پر سیلاب کی جو ویڈیوز وائرل ہو رہی ہیں، انہیں دیکھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ دل لرز اٹھتا ہے۔

پانی کے ریلے میں بہتی مٹی میں لت پت پھول جیسے بچوں کی لاشیں، کہیں بھوک کی شدت سے روتے بلکتے بچے اور کہیں سیلابی پانی کے بہاؤ سے ٹوٹتے گرتے پکے مکان۔

بے یارومددگار یہ لوگ بھوک سے بلبلا رہے ہیں۔ ان کے تن پر کپڑے نہیں ہیں۔ ان کی ساری پونجی پانی کا ریلا بہا کر لے گیا ہے۔ اتنی بڑی افتاد، اتنی بڑی تباہی ہمارے اپنے لوگوں پر اور ہماری بے حسی کی حدوں کو چھوتی بے اعتنائی۔

ایک طرف شدید سیاسی انتشار ہے۔ دوسری طرف شدید معاشی مشکلات اور مالی معاملات کے دوران ملک کو سنبھالا دینے کی کوششوں میں مصروف حکومت سے غریب عوام جو مہنگائی کے ہاتھوں پہلے ہی تنگ تھے۔ اب ان کی ہمت جواب دے رہی ہے۔

قوموں پر مشکلات آتی رہتی ہیں۔ ان مشکلات کا ہمت اور کوشش سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ یہ وقت اقتدار کے لیے رسہ کشی کا نہیں ہے۔ متحد ہو کر ان مجبور و بے بس لوگوں کی مدد کرنے کا ہے، ان کی مشکلوں کو سننے کا ہے۔ ان کے زخموں پر مرہم رکھنے کا ہے۔ ان لوگوں کی مدد کرنا، ان پر احسان نہیں، ہمارا فرض ہے۔

ہم سے جس قدر ہو سکے، جتنا ممکن ہو، ہم ان کے لیے جو کر سکتے ہیں، وہ ضرور کرنا چاہیے۔ نیکی چھوٹی یا بڑی نہیں ہوتی، کبھی کبھی چھوٹی سی نیکی بھی قبولیت پا کر بڑے درجات کا باعث بن جاتی ہے۔ دس روپے کا ایک ایس ایم ایس تو ہم سب ہی کر سکتے ہیں۔ فنڈ لکھ کر 9999 پر ایس ایم ایس کر دیں۔ ممکن ہے یہ چھوٹی سی مدد کسی کی زندگی بن جائے۔

## اس شمارے میں،

- نبیلہ ناز کا مکمل ناول۔ راستے مل ہی جاتے ہیں، حسنہ حسین کا مکمل ناول۔ عسر یسرا،
- شازیہ جمال کا مکمل ناول۔ برے کام لوٹ کر،
- شازیہ الطاف ہاشمی کا ناولٹ۔ چاہتوں کے درمیان،
- سنیعہ عمیر، ذیلہ ظفر، حمرا امروش، حوریہ مریم اور فرحت ناز ملک کے افسانے،
- تنزیلہ ریاض اور امت العزیز شہزاد کے ناول،
- معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ۔ دستک،
- پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

ستمبر کا شمارہ آپ کو کیسا لگا؟ اپنی رائے سے ضرور نوازیے گا۔



جو مالک ہے سب کا وہ مالک ہے میرا
اسی نے بنایا اُجالا اندھیرا

وہ سارے جہانوں کا واحد خدا ہے
وہ مشکل کشا ہے، وہ حاجت روا ہے

اسی نے بنائے چمن زار سارے
اسی کی ہیں تخلیق چاند اور تارے

فلک ہیں مرے کبریا کی نشانی
زمیں ہے اسی ذات کی مہربانی

وہ پتھر میں مخلوق کو پالتا ہے
وہ سب پر نگاہِ کرم ڈالتا ہے

وہ سب سے مکرم وہ سب سے بڑا ہے
وہ سارے جہانوں کا فرماں روا ہے

ریاض حسین قمر

## نعت رسول مقبول

دل میں اُترتے حرف سے مجھ کو ملا پتا ترا
معجزۂ حسنِ صوت کا، زمزمۂ صدا ترا

اے مرے شاہِ شرق و غرب! نانِ جویں غذا تری
اے مرے بوریا نشیں! سارا جہاں گدا ترا

سنگ زنوں میں گھر کے بھی تو نے انہیں دعا ہی دی
دشتِ بلا سے بارہا، گزرا ہے قافلہ ترا

کوئی نہیں تری نظیر، روزِ ازل سے آج تک
تا بہ ابد نہیں مثیل کوئی ترے سوا، ترا

یوں تو تری رسائیاں فرش سے عرش تک محیط
میں نے تو اپنے دل میں بھی پایا ہے نقشِ پا ترا

دُور سہی دیارِ نور، چُور سہی مرا شعور
تُو مرا حوصلہ تو دیکھ، میں بھی ہوں مبتلا ترا

احمد ندیم قاسمی

## خرچ کرنے کی ترغیب

حضرت جریر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں" ہم لوگ دن کے شروع حصہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بیٹھے ہوئے تھے کہ اتنے میں کچھ لوگ آئے جو ننگے بدن اور ننگے پاؤں اور دھاری دار اونی چادریں اور عبا پہنے ہوئے تھے اور تلواریں گردنوں میں لٹک رہی تھیں۔ ان میں سے اکثر لوگ قبیلہ مضر کے تھے بلکہ سارے ہی لوگ مضر کے تھے۔ ان کے فاقہ کی حالت دیکھ کر آپ کا چہرہ مبارک بدل گیا پھر آپ گھر تشریف لے گئے (کہ شاید وہاں ان کے لیے کچھ مل جائے لیکن وہاں بھی کچھ نہ ملا یا)

پھر باہر تشریف لا کر حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حکم فرمایا۔ انہوں نے پہلے اذان دی (ظہر یا جمعہ کی نماز تھی) پھر اقامت کہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھائی پھر بیان فرمایا اور یہ آیت تلاوت فرمائی۔

ترجمہ: "اے لوگوں! اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تم کو ایک جاندار سے پیدا کیا اور اس جان دار سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلائیں اور تم خدائے تعالیٰ سے ڈرو جس کے نام سے ایک دوسرے سے مطالبہ کیا کرتے ہو اور قرابت سے بھی ڈرو، بالیقین اللہ تعالیٰ تم سب کی اطلاع رکھتے ہیں۔" (سورۃ النساء آیت ۱)

اور سورۃ حشر میں ہے۔

ترجمہ: "اور اللہ سے ڈرتے رہو اور ہر شخص دیکھ بھال لے کہ کل (قیامت) کے واسطے اس نے کیا ذخیرہ بھیجا ہے۔" (سورۃ حشر آیت ۱۸)

آدمی کو چاہیے کہ اپنے دینار، درہم، کپڑے، ایک صاع گندم اور ایک صاع کھجور میں سے کچھ ضرور صدقہ کرے۔ حتیٰ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اگرچہ کھجور کا ایک ٹکڑا ہی ہو تو اسے ہی صدقہ کردے۔

(یعنی یہ ضروری نہیں ہے کہ جس کے پاس زیادہ ہو، صرف وہی صدقہ کرے بلکہ جس کے پاس تھوڑا ہے، وہ بھی اس میں سے خرچ کرے) راوی کہتے ہیں۔

چنانچہ ایک انصاری ایک تھیلی لے کر آئے (وہ اتنی وزنی تھی کہ) ان کا ہاتھ اسے اٹھانے سے عاجز ہونے لگا بلکہ عاجز ہو ہی گیا تھا پھر تو لوگوں کا تانتا بندھ گیا (اور لوگ بہت سامان لائے) حتیٰ کہ میں نے غلہ اور کپڑے (اور درہم و دینار) کے دو بڑے ڈھیر دیکھے۔ یہاں تک کہ میں نے دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ انور (خوشی سے) ایسا چمک رہا ہے کہ گویا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرے پر سونے کا پانی پھیرا ہوا ہے (اس کام کی فضیلت سناتے ہوئے) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جو شخص اسلام میں اچھا طریقہ جاری کرتا ہے تو اسے اپنا اجر ملے گا و ران کے اجر میں سے کچھ کم نہیں ہوگا اور جو اسلام میں برا طریقہ جاری کرتا ہے تو اسے اتنا گناہ ملے گا اور اس کے بعد جتنے لوگ اس طریقہ پر عمل کریں گے، ان سب کے برابر گناہ اسے ملے گا اور ان کے گناہ میں سے کچھ کم نہیں ہوگا۔"

(اخرجہ مسلم والنسائی وغیرہما کہذا فی الترغیب ۱/۵۳)

### اللہ کی راہ میں خرچ کرنا

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں" حضور صلی اللہ علیہ وسلم بدھ کے دن قبیلہ بنی عمرو بن عوف کے پاس تشریف لے گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اے جماعت انصار! انہوں نے عرض "لبیک یا رسول اللہ!" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"زمانہ جاہلیت میں تم لوگ اللہ کی عبادت نہیں کیا کرتے تھے لیکن اس زمانہ میں تم میں یہ خوبیاں تھیں کہ تم



یتیموں کا بوجھ اٹھاتے تھے، اپنا مال دوسروں پر خرچ کرتے تھے اور مسافروں کی ہر طرح کی خدمت کرتے تھے۔ یہاں تک کہ جب اللہ تعالیٰ نے تمہیں اسلام کی دولت عطا فرما کر اور اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیج کر تم پر بہت بڑا احسان کیا تو اب تم اپنے مال سنبھال کر رکھنے لگ گئے ہو (حالانکہ مسلمان ہونے کے بعد اور زیادہ خرچ کرنا چاہیے تھا کیونکہ اسلام تو دوسروں پر خرچ کرنے کی ترغیب دیتا ہے) لہٰذا انسان جو کچھ کھاتا ہے، اس پر اجر ملتا ہے بلکہ درندے اور پرندے جو کچھ (باغوں کھیتوں وغیرہ میں سے) کھا جاتے ہیں، اس پر بھی اسے اجر ملتا ہے۔"

(بس یہ فضیلت سننے کی دیر تھی کہ) وہ حضرات انصار ایک دم (اپنے باغوں کو) واپس گئے اور ہر ایک نے اپنے باغ کی دیوار میں تیس دروازے کھول دیے۔

(اخرجہ الحاکم وصححہ کذافی الترغیب ۲/۱۵۶)

### سخاوت

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں" حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے جو بیان فرمایا اس کی صورت یہ ہوئی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر تشریف لے گئے اور اللہ کی حمد و ثنا بیان کی اور فرمایا۔

"اے لوگو! اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے اسلام کو بطور دین کے پسند فرمایا ہے، لہٰذا اسلام میں سخاوت اور حسن اخلاق کے ساتھ اچھی زندگی گزارو۔ غور سے سنو! سخاوت جنت کا ایک درخت ہے اور اس کی ٹہنیاں دنیا میں جھکی ہوئی ہیں۔ لہٰذا تم میں سے جو آدمی سخی ہوگا۔ وہ اس درخت کی ایک ٹہنی کو مضبوطی سے پکڑنے والا ہوگا اور وہ یونہی اسے پکڑے رہے گا۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اسے جنت میں پہنچا دیں گے۔

غور سے سنو! کنجوسی دوزخ کا ایک درخت ہے اور اس کی ٹہنیاں دنیا میں جھکی ہوئی ہیں، لہٰذا تم میں سے جو آدمی کنجوس ہوگا۔ وہ اس درخت کی ایک ٹہنی کو مضبوطی سے پکڑنے والا ہوگا اور وہ یونہی اسے پکڑے رہے گا۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اسے دوزخ میں پہنچا دیں گے۔

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو مرتبہ فرمایا۔ "تم لوگ اللہ کی وجہ سے سخاوت کو اختیار کرو۔ اللہ کی وجہ سے سخاوت کو اختیار کرو۔"

(اخرجہ ابن عساکر کذافی کنز العمال ۳/۲۱۰)

### نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کا مال خرچ کرنے کا شوق

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں" ایک آدمی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر سوال کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسے کچھ عطا فرما دیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "تمہیں دینے کے لیے اس وقت میرے پاس کوئی چیز نہیں ہے۔ تم ایسا کرو کہ میری طرف سے کوئی چیز ادھار خرید لو۔ جب میرے پاس کچھ آئے گا تو میں وہ ادھار ادا کر دوں گا۔"

(اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دوسروں کو دینے کا بہت زیادہ شوق تھا)

اس پر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے (ازراہ شفقت) کہا۔ "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! آپ اسے پہلے دے چکے ہیں (اب مزید دینے کے لیے کیوں اس کا ادھار اپنے ذمہ لے رہے ہیں) جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بس میں نہیں ہے، اس کا اللہ نے آپ کو مکلف نہیں بنایا۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یہ بات پسند نہ آئی۔

ایک انصاری نے عرض کیا۔ "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ خرچ کریں اور عرش والے سے کمی کا ڈر نہ رکھیں۔"

اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم مسکرائے۔ انصاری کو اس بات پر خوشی اور مسکراہٹ کے آثار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرے پر نظر آنے لگے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اسی کا مجھے (اللہ کی طرف سے) حکم دیا گیا ہے۔"

(اخرجہ الترمذی کذافی البدایۃ ۶/۵۶)

## خرچ کرنے سے پہلے مرجانا

حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے پاس تشریف لے گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ ان کے پاس کھجور کے چند ڈھیر ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا۔ ''اے بلال رضی اللہ عنہ! یہ کیا ہے؟''

انہوں نے عرض کیا۔ ''آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مہمانوں کے لیے یہ انتظام کیا ہے۔''

(کہ جب بھی وہ آئیں تو ان کے کھلانے کا سامان پہلے سے موجود ہو)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تمہیں اس بات کا ڈر نہیں ہے کہ دوزخ کی آگ کا دھواں تم تک پہنچ جائے؟'' (یعنی اگر تم ان کے خرچ کرنے سے پہلے ہی مرگئے تو پھر ان کے بارے میں اللہ کے ہاں سوال ہوگا۔)

''اے بلال رضی اللہ عنہ! خرچ کرو اور عرش والے سے کمی کا ڈر نہ رکھو۔''

(اخرجہ البزار باسناد حسن والطبرانی واخرجہ ابونعیم فی الحلیۃ ۱۴۹/۱)

## سات دینار

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں۔ ایک مرتبہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس تشریف لائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ مبارک کا رنگ بدلا ہوا تھا۔ مجھے ڈر ہوا کہ کہیں یہ کسی درد کی وجہ سے نہ ہو۔

میں نے کہا۔ ''یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! آپ کو کیا ہوا؟ آپ کے چہرے کا رنگ بدلا ہوا ہے۔''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ''ان سات دیناروں کی وجہ سے جو کل ہمارے پاس آئے ہیں اور آج شام ہوگئی ہے اور وہ ابھی تک بستر کے کنارے پر پڑے ہوئے ہیں۔''

ایک روایت میں یہ ہے کہ ''وہ سات دینار ہمارے پاس آئے اور ہم ابھی تک ان کو خرچ نہیں کر سکے۔''

(اخرجہ احمد ابو یعلیٰ قال الہیثمی ۲۳۸/۱۰ ورجال ہما رجال الصحیح)

## نزع کے وقت

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سات دینار تھے جو آپ نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس رکھوائے ہوئے تھے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم زیادہ بیمار ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ''اے عائشہ! یہ سونا علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس بھجوادو۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم بے ہوش ہوگئے تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنبھالنے میں ایسی مشغول ہوئیں کہ وہ دینار بھجوا نہ سکیں۔ یہ بات حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی مرتبہ ارشاد فرمائی لیکن ہر مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمانے کے بعد بے ہوش ہوجاتے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا آپ کو سنبھالنے میں مشغول ہوجاتیں اور وہ دینار نہ بھجوا پاتیں۔

آخر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ دینار خود حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بھجوائے اور انہوں نے انہیں صدقہ کردیا۔

پیر کی رات کو شام کے وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نزع کی کیفیت طاری ہونے لگی تو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اپنا چراغ اپنے پڑوس کی ایک عورت کے پاس بھیجا (جو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ محترمہ تھیں) اور ان سے کہا۔ ''ہمارے اس چراغ میں اپنے گھی کے ڈبے میں سے کچھ گھی ڈال دو کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نزع کی کیفیت طاری ہوچکی ہے۔''

(اخرجہ الطبرانی فی الکبیر ورواتہ ثقات محتج بھم فی الصحیح ابن حبان ۱۷۸/۲)

## اللہ سے ملاقات

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں۔ حضور



صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مرض الوفات میں مجھے حکم دیا کہ جو سونا ہمارے پاس ہے میں اسے صدقہ کردوں۔ (لیکن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مشغول رہی اور صدقہ نہ کرسکی) پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو افاقہ ہوا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم نے اس سونے کا کیا کیا؟''

میں نے کہا۔ ''میں نے دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بہت زیادہ بیمار ہوگئے ہیں، اس لیے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایسی لگی کہ بھول گئی۔''

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وہ سونا لے آؤ۔''

چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں سات یا نو دینار لائیں۔ ابو حازم راوی کو شک ہوا کہ دینار کتنے تھے؟ جب حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ لے آئیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اللہ سے ملاقات اس حال میں ہوتی (یعنی اگر ان کا انتقال اس حال میں ہوتا) کہ یہ دینار ان کے پاس ہوتے تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کیا گمان کرسکتے ہیں؟ (یعنی ان کو بہت ندامت ہوتی) اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اللہ سے ملاقات اس حال میں ہوتی کہ یہ دینار ان کے پاس ہوتے تو یہ دینار محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بھروسے کو اللہ پر نہ رہنے دیتے۔''

(اخرجہ احمد قال الہیثمی ۲۴۰/۱۰)

## غریب کا صدقہ کرنا

حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں۔ ایک آدمی نے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا۔ ''اے مال والو! نیکیاں تو تم لے گئے ہو کہ تم لوگ صدقہ کرتے ہو، غلاموں کو آزاد کرتے ہو، حج کرتے ہو اور اللہ کے راستے میں مال خرچ کرتے ہو۔''

حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا۔ ''اور تم لوگ ہم پر رشک کرتے ہو۔''

اس آدمی نے کہا۔ ''ہم لوگ آپ رضی اللہ عنہ لوگوں پر رشک کرتے ہیں۔''

حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا۔ ''اللہ کی قسم! کوئی آدمی تنگ دستی کی حالت میں ایک درہم خرچ کرے، وہ ہم مال داروں کے دس ہزار سے بہتر ہے کیونکہ ہم بہت زیادہ میں سے تھوڑا سا دے رہے ہیں۔''

(اخرجہ البیہقی فی شعب الایمان کذافی الکنز ۳۲۰/۳)

## حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی سخاوت

حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ ''میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور حضرت اسماء رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے زیادہ سخی کوئی عورت نہیں دیکھی۔ البتہ ان دونوں کی سخاوت کا طریقہ الگ الگ تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ تھوڑی تھوڑی چیز جمع کرتی رہتیں۔ جب کافی چیزیں جمع ہوجاتیں تو پھر ان کو تقسیم فرمادیتیں اور حضرت اسماء رضی اللہ تعالیٰ عنہا تو اگلے دن کے لیے کوئی چیز نہ رکھتیں۔ یعنی جو کچھ تھوڑا بہت آتا، اسی دن تقسیم کردیتیں۔

(اخرجہ البخاری فی الادب المفرد ۴۳)

## اپنی پیاری چیزوں کو خرچ کرنا

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خیبر میں ایک زمین ملی۔ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کیا۔ ''مجھے ایک ایسی زمین ملی ہے کہ اس سے زیادہ عمدہ مال مجھے کبھی نہیں ملا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کیا رائے ہے کہ میں اس کے بارے میں کیا کروں؟''

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ''اگر تم چاہو تو زمین کو وقف کردو اور اس کی آمدنی کو صدقہ کردو۔''

چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان شرائط پر اس زمین کی آمدنی کو صدقہ کیا کہ نہ تو یہ زمین بیچی جاسکے گی، نہ کسی کو ہدیہ کی جاسکے گی اور نہ کسی کو وراثت میں مل سکے گی۔ اور اس کی آمدنی، فقیروں، رشتہ داروں، غلاموں کے آزاد کرنے، جہاد فی سبیل اللہ میں اور مہمانوں پر خرچ کی جائے گی اور جو اس زمین کا متولی بنے اسے اجازت ہے کہ وہ عام دستور

کے مطابق اس کی آمدنی میں سے خود کھالے اور اپنے دوست کو کھلا دے لیکن اسے اس میں سے اپنے لیے مال جمع کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

(اخرجہ الائمۃ الستہ کذا فی نصب الرایۃ ۴/۲۷۶)

## پسندیدہ ترین

حضرت سعید بن ابی بلال رحمتہ اللہ علیہ کہتے ہیں۔ ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جحفہ مقام پر قیام فرمایا اور وہ بیمار بھی تھے۔ انہوں نے کہا "مچھلی کھانے کو میرا دل چاہ رہا ہے۔"

ان کے ساتھیوں نے بہت تلاش کیا۔ بس صرف ایک مچھلی ملی۔ ان کی بیوی حضرت صفیہ بنت ابی عبید نے اس مچھلی کو لیا اور اسے تیار کر کے ان کے سامنے رکھ دیا۔ اتنے میں ایک مسکین ان کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ انہوں نے اس مسکین سے کہا۔

"تم یہ مچھلی لے لو۔"

اس پر ان کی بیوی نے کہا۔ "سبحان اللہ! ہم نے آپ کی خاطر بڑی مشقت اٹھا کر یہ مچھلی خاص طور پر آپ کے لیے تیار کی ہے (اس لیے اسے آپ خود کھائیں) ہمارے پاس سامان سفر ہے، اس میں سے اس مسکین کو دے دیں گے۔"

انہوں نے (اپنا نام لے کر) کہا۔ "عبداللہ کو یہ مچھلی بہت پسند آ رہی ہے۔" (اس لیے اس مسکین کو یہی مچھلی دینی ہے)

(اخرجہ ابونعیم فی الحلیا ۲۹۷/۱)

## اپنی ضرورت کے باوجود مال دوسروں پر

## خرچ کرنا

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں۔ ایک عورت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک چادر لے کر آئی جو کہ بنی ہوئی تھی اور اس کا کنارہ بھی اسی کے ساتھ بُنا ہوا تھا۔ (یعنی وہ چادر کسی اور کپڑے سے کاٹ کر نہیں بنائی گئی تھی بلکہ کنارے سمیت بطور چادر کے ہی وہ بُنی گئی تھی) اور اس عورت نے عرض کیا۔ "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں یہ چادر اس لیے لائی ہوں تاکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسے پہن لیں۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عورت سے چادر لے لی اور چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس چادر کی واقعی ضرورت تھی، اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے پہن لیا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے ایک صاحب نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر وہ چادر دیکھی تو عرض کیا۔

"یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! یہ تو بہت اچھی چادر ہے۔ یہ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے پہننے کو دے دیں۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "بہت اچھا۔" (اور یہ کہہ کر چادر اسے دے دی۔ حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو خود اس کی ضرورت تھی) جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم وہاں سے تشریف لے گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے ان صاحب کو بہت ملامت کی اور یوں کہا۔

"تم نے اچھا نہیں کیا، تم خود دیکھ رہے ہو، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خود اس چادر کی ضرورت تھی، اسی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے لے کر پہن لیا پھر تم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ چادر مانگ لی اور تمہیں معلوم ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جب بھی کوئی چیز مانگی جائے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کا انکار نہیں فرماتے بلکہ دے دیتے ہیں۔"

ان صحابی نے کہا۔ "میں نے تو صرف اس لیے مانگی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پہننے سے یہ چادر بابرکت ہو گئی ہے۔ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر اسے ہمیشہ اپنے پاس سنبھال کر رکھوں تاکہ مجھے اس میں کفن دیا جائے۔"

(اخرجہ ابن جریر)



# جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے

م۔ع

1۔ شادی کب ہوئی؟

ج: "شادی 15 فروری 2008 بروز جمعہ انجام پائی۔"

2۔ "شادی سے پہلے کیا مشاغل اور دلچسپیاں تھیں؟"

ج: "شادی سے پہلے فراغت ہی فراغت تھی۔ سارا دن نیم کے سائے تلے لیٹی کبوتروں کو تکا کرتی تھی، جو کثرت سے حویلی نما مکان میں ہر وقت موجود رہتے تھے۔ فراغت کا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ میں کوئی کام نہیں کرتی تھی بلکہ کبوتروں کو تکنے کا کام کاج سے فراغت کے بعد کا تھا۔ ویسے بھی میں نے رسالے پڑھنے کا شوق اب تک نہیں چھوڑا۔ رسالے جو میری ذات کا اہم جزو ہیں، آسمان کو بہت دیر تک دیکھتے رہنا۔ پرندوں کو جذب کے عالم میں ساکت فضاؤں میں محو رقص دیکھنا بھی مجھے اب تک پسند ہے۔

رسالے پڑھنا بلکہ کچھ نہ کچھ پڑھتے رہنا میری زندگی میں روٹی پانی جیسی ہی اہمیت رکھتے تھے۔ اور رکھتے ہیں۔ دل کو ہمیشہ غبار سے پاک رکھا اور خدمت خلق کا شوق۔

بزرگوں کے فیصلے پر سر جھکاتی اگر بزرگ محبت سے رشتہ مانگتے تو (قریبی رشتہ دار ہیں) بچپن سے طے تھا رشتہ مگر بعد میں "آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے۔" کبھی ہاں کبھی ناں کبھی اقرار، کبھی انکار (میرا تایازاد سرکاری ملازم جو تھا) لوگوں نے سو روڑے اٹکائے سو حیلے سو بہانے۔ کبھی کہہ جاتے۔ لیں گے رشتہ، دوسری بار انکار کر جاتے۔ پھر وہی ہوا۔ جو اللہ کو منظور تھا میں اسی کے نصیب میں لکھی جا چکی تھی اور ہماری شادی ہو گئی۔"

س: "جیون ساتھی کے حوالے سے ذہن میں کوئی تصور تھا؟"

ج: "جیون ساتھی کے حوالے سے خواب ہی خواب کبھی اسے لمبا چوڑا ہونا چاہیے۔ کبھی کھیتوں میں کام کرتا ہو اور میں اس کے پیچھے روٹی لے کے جاؤں کبھی کوئی شہری بابو سنہری رنگت والا طاقت ور جنگجو ٹائپ، جو غلط بات پر جھڑک بھی سکے اور درست بات پر دنیا سے ٹکر بھی لے لے۔

محبت کرنے اور نبھانے کا گر آتا ہو۔ باحوصلہ ہو۔ جو دکھ میں سمیٹ لے اور تکلیف میں ڈھال بن جائے۔ جس کے پاس خود کو محفوظ سمجھوں اور ہاں اس کی آنکھیں بے حد خوب صورت ہونا چاہئیں (جو کہ ماشاء اللہ ہیں بھی) (اللہ تیرا شکر) اور کنجوس بالکل نہ ہو۔ اور رونے والے مردوں سے نفرت ہے مجھے۔"

س: "شادی سے پہلے سسرال والوں کے متعلق آپ کے ذہن میں کیا تصور تھا؟"

ج: "شادی سے پہلے سوچا تھا، بہت سوچا تھا۔ "ساس میری سہیلی" (مگر وہ پہلے سے بڑی جیٹھانی کی سہیلی نکلیں اور ہمیں سہیلی نہ بننے دیا) اور دیور میرا بھائی ہونہہ "ائے کیہڑا بھائی" انہوں نے مجھے اپنی زندگی کا حصہ ہی نہیں سمجھا (بلکہ کافی عرصہ تک شوہر کو بھی نہیں سمجھنے دیا) روٹیاں پکائیں۔ جھاڑو دی فرش دھوئے، بیمار ہوئے تو تیمارداریاں، پرہیزی کھانے، چائے، پائے خود اپنے ہاتھ سے ان کے نکلتے خون کو صاف کیا۔ مگر وہ تو میرا خون پی لینا چاہتے تھے۔

انہوں نے مجھے دل سے قبول ہی نہیں کیا (جوائنٹ فیملی سسٹم کی بیماری) ساس باقاعدہ لڑکیوں کی طرح جھگڑیں، جیٹھ دیور گھر کو لمحے سے پہلے

خالی دیکھنا چاہتے تھے۔ جیٹھانی، دیورانی (خیر سے وٹہ سٹہ ہے ان کا) انہوں نے الگ رعب جمایا۔ وٹے سٹے میں مجھے بھی غلامی میں لینے کی کوشش دن رات کی اور کررہے ہیں نندوں کی تو بات ہی اور ہے۔ رو رو کے بھائی کے گلے لگیں اور آنسو پونچھے کے بھائی، بھابھی، بھتیجوں کی وہ مٹی پلید کی کہ (الاامان الحفیظ) اور نسو ہے اللہ اللہ اور رونے جو دیکھے نہ جائیں اور باتیں تحمل میں پھنسا کے دم گھونٹیں (ہمارا سرکاری ملازم بھائی)

خود اپنے گھروں میں بھی انگارے چباتی رہتی ہیں۔ ان کی خدمت کرکر کے اور کام کرکر کے ہمارے کندھے اور جذبات دونوں جواب دے چکے ہیں۔ اتنا حسد، اتنی نفرت، سوچ کر ہمارا دل بند ہونے لگتا ہے۔

ویسے آپ کے قریبی رشتہ دار جتنی نفرت آپ سے کرسکتے ہیں اتنا سارزمانہ مل کے بھی نہیں کرسکتا۔ (صرف ذاتی تجربہ)"

س:"شادی کے لیے آپ کو تعلیم کی قربانی دینا پڑی یا کوئی اور؟"

ج:" شادی سے پہلے تعلیم کا قصہ آپ کو سنا چکی ہوں۔ میٹرک تھی اور میٹرک رہی۔ اگر شادی کے بعد پڑھتی تو اب تک ضرور کچھ نہ کچھ بن جاتی (بے وقوف ہی سہی)"

س:" شادی کے دوران رسموں یا لین دین کے معاملے پر کوئی بدمزگی ہوئی؟"

ج:" شادی کے دن لین دین نہیں ہوا۔ مطلب بدمزگی ہوتی اگر ہم ان سے کوئی ڈیمانڈ کرتے تب ناں۔ کام جنہوں نے کیا اور جو چھوٹا موٹا لینا دینا ہم نے خود کیا۔ ورنہ انہوں نے غائب ہوجانا تھا (جیسے گدھے کے سر سے سینگ) اپنے تھے ناں اس لیے رسمیں کوئی خاص نہیں ہوئیں۔ (ہمارے ہاں رسمیں وغیرہ کرنے کا رواج نہیں مہندی، مایوں وغیرہ کی)"

س:" شادی کے بعد شوہر نے آپ کو دیکھ کر کیا کہا؟"

ج:" شادی کے بعد شوہر نے السلام علیکم کہا۔ میک اپ — اپنے دوپٹے سے صاف کرلیا تھا اتنا الا بلا پتا نہیں کیا کیا تھوپ ڈال دیا تھا۔ اتنا بھاری چہرہ ہو رہا تھا۔ جیسے منہ پر مٹی کا تازہ تازہ لیپ۔"

س:" شادی کے بعد زندگی میں تبدیلیاں آئیں؟"

ج:" شادی کے بعد زندگی کو سیکھ گئی ہوں پرکھ لیا ہے کہ کتنے لوگ اندر سے کھرے ہوتے ہیں۔ اندر سے کچھ اور باہر سے کچھ۔ لیکن یہ تجربہ بہت تلخ رہا۔ جن لوگوں سے ہم بہت سی توقعات رکھتے ہیں اپنا سمجھتے ہیں۔ جنھیں بعد میں بے نقاب ہوجاتے ہیں۔ تھوڑے سے پیسوں۔ تھوڑی سی آسائش کے بدلے میں۔ سسرال والے اپنے ہوں یا پرائے امتحان لیتے ہیں صبر کا نہ جینے دیتے ہیں نہ مرنے۔ دوسرے ہمارے رشتے دار جو اپنی بیٹیوں کے لیے خوار ہورہے ہوتے ہیں۔ انہیں کسی اور کی بیٹی بسی ہوئی بھاتی ہی نہیں۔

ہمارے سر سے جب سے باپ کا سایہ اٹھا ہے زندگی لمحہ لمحہ بدل رہی ہے۔ کبھی کسی کی بات کبھی کسی کا تبصرہ، لوگ نہ جانے یہ کیوں نہیں سوچتے کہ جس کا نصیب جس کے ساتھ آسمانوں پر جڑا ہے اس کے ساتھ جڑا ہے۔ ایک دوسرے کی جگہ لینے کی زور آزمائی، دکھ بیماری اور پیسے کا آنا اور جانا سب اللہ کی مرضی ہے۔ مگر لوگ اپنی تقدیر خود لکھنا چاہتے ہیں۔ آسمان کی وسعتوں پر شاید کوئی غور ہی نہیں کرتا۔ بس اپنے دماغ پہ سب کو کامل یقین ہے اللہ کو بھول گئے ہیں لوگ۔ سسرال والے تو اپنی بیٹیوں کو خوش دیکھنا چاہتے ہیں اور دوسروں کی بیٹیوں کو ستانا حق سمجھتے ہیں۔ زندگی بہت تبدیل ہوئی ہے اور آنکھیں کھلی کی کھلی ہیں مگر اللہ پر کامل ایمان اور بڑھا ہے۔"

س:" شادی کے بعد کام کاج کب سنبھالا؟"

ج:" شادی کے بعد گھر جاتے ہی جھاڑو پکڑی اور جھاڑو سے سارا کوڑا کرکٹ ٹھکانے لگایا۔ جو صحن میں آوارہ لڑکوں کی طرح گھوم رہا تھا۔ (تیز ہوا جو تھی) ہلکا سا ساس نے ٹوکا پھر جیٹھانی کے اشارے پر گوڈوں کا درد لے کے لیٹ گئیں اور جیٹھانی چھوٹے بچوں کا بہانہ کرکے کھسکی تین چار مہینے میں ماسی بن کے رہ گئی۔ اگر نہا دھو کر (شوہر کے آنے سے پہلے) کنگھی کرنے لگتی تو کنگھی غائب اور شلوار قمیص کے ساتھ کا دوپٹہ بھی ملا ہی نہیں سو شوہر کے سامنے کبھی ڈھنگ سے آہی نہ سکی۔

یہ کالے سیاہ برتنوں کا ڈھیر اور میں اکیلی دلہن، سوچا تھا سب مجھ سے محبت کریں گے مگر کسی کو اپنے بیٹے کا زعم تو کسی کو اپنے وٹے سٹے کا۔ میری کوشش رائیگاں گئی بھی پرائے بھی اپنے ہوئے ہیں بھلا۔ انہوں نے مجھے ڈکٹیٹر سمجھا اور اپنے اقتدار پر شب خون مارنے پر جواز دیتیں ہیں اس کی تفصیل بہت طویل ہے۔ ایک طرف میں اکیلی تو دوسری طرف نندوں کے سسرال، جیٹھانی کے میکے تک کے مخالف۔

بس پھر کام بانٹ لیے گئے اور کام بانٹ کے بھی مجھے سکون نہ لینے دیا گیا۔ میں ہمیشہ زیادہ کام کرتی بلکہ پورا گھر سنبھال کر بھی مجرم ٹھہری۔ میکے اور سسرال میں کھانا تو ایک جیسا ہی تھا مگر پکاتے وہ خود تھے جیسے گوشت بریانی وغیرہ، اس کے مجھے صرف ابتدائی کام کرنا ہوتے پیاز کاٹنا وغیرہ، پکانا بانٹنا ان کا کام اور جو مل جائے، اس پر صبر شکر کرنا بھی میرے کاموں میں شامل تھا۔ میں نے ایک دن اپنے ہاتھ سے کھانا نکال کر نہیں کھایا۔ بلکہ جیٹھانی یا ساس نے ہی نکال کر دیا۔"

س:" کیا میکے اور سسرال کے کھانے پکانے کے انداز اور ذائقے مختلف محسوس ہوئے تھے؟"

ج:" میکے اور سسرال میں زمین اور بلیک ہول جتنا فرق ہے۔ سسرال بلیک ہول ہی کے جیسا ہے جس کی وسعت کی کسے خبر تھی اور تنہائی درد کو کون جانے۔

شوہر نے دفتر سے شادی کے لیے چالیس چھٹیاں لیں۔ (لگتا تھا میرے لیے صرف) مگر یہ نظر آتا تھا کہ وہ گھر میں ہیں کیونکہ وہ کام کام اور کام والے مقولے پر مکمل عمل پیرا ہوتے تھے۔ ٹونٹی ٹھیک کرنے سے لے کر، بچوں کو چپ کروانے تک ہر کام ان کے سپرد، کسی کے ساتھ بخار میں جاگنا کسی بہن کے ہاں جانا ہے، کسی کے کان میں درد ہے یا چارپائی ڈھیلی ہے۔ کسی کام سے انکار نہیں کرتے بلکہ خاموشی سے لگتے رہتے ہیں (لگے رہو منا بھائی) اور رات ہوتی تو (شادی کے ایک مہینے سے زیادہ) میری ساس اور جیٹھانی (اپنا ایک بچہ گود میں دبائے) کمرے میں موجود ہوتیں پوری رات باتوں کا وہ دور چلتا وہ گرما گرمی (حکومتی ارکان کی بحث مباحثے بھی ہار جاتے)

گاؤں کے مرے ہوئے آدمیوں سے لے کر ان کے پورے شجرہ نسب کا قصہ اور میں بھی مجبوراً ہوں کرتی رہتی ہاں۔

ان دنوں شاید (اماں) ساس کو اپنا گاؤں بہت یاد آتا ہوگا اور پرانی یادیں خوب تازہ کرتیں دوسری (جیٹھانی) بھی اپنا شوہر بھلائے دیور کے کمرے میں ڈیڑھ بجے تک بیٹھی رہتی (وہ اپنی بہن لانے کا سوچتی تھیں) چاہے نیند سے آنکھیں بند ہورہی ہوتیں۔ قصے کہانیاں وہ کہ بس اللہ دے اور بندہ لے۔

تقریباً ڈھائی تین بجے بیٹے کے سر پر بوسہ دے کر رخصت ہوتیں تو صبح صبح ناشتے میں ہاتھ بٹانے کو میں جلدی اٹھ جاتی۔ دیور، جیٹھ اور سسر سب کا موڈ خراب اور رویہ نہ سمجھ میں آنے والا کپڑے دھوتی تو پانی زیادہ خرچ کرتی ہوں اور سرف کا الگ۔

جیٹھ کو نہانے پر بھی اعتراض ہوتا۔ بل زیادہ آئے گا (کاکا اندر بیٹھ ہی جاتی ہو ٹونٹی کے نیچے)

لو جی کر لو گل، کاکے کے سر پر لگی اور تلوؤں پر بجھی۔ بہرحال کاکے نے اپنی نند تک (شادی شدہ) کے کپڑے دھوئے (اکڑا کے رکھ دیتی ہو) ان کا محبت سے لبریز حوصلہ افزا ٹوئٹ۔"

س: "کیا سسرال میں آپ کو وہ مقام ملا جو آپ کا حق تھا؟"

ج: "سسرال والوں نے مجھے کسی کام کا سمجھا نہیں تو مقام کیا دیتے (گھر میں کسی کا مقام نہیں سوائے دنے والی دیورانی، جیٹھانی اور جیٹھ کے) تو ہمارا مقام ملنا تو خارج از امکان، ہاں متاثر ہوئے تھے میرے گھر سنبھالنے سے صفائی ستھرائی سے اچھی باتوں سے مگر یہ نہ سمجھ لیجیے گا کہ انہوں نے مجھے کہا ہو یا سراہا ہوگا۔ (ان کے چہروں پر غور سے دیکھ کے جانچا تھا)

میری شادی شدہ نندیں (اللہ آباد رکھے) انہوں نے بھائی کو اور بھائی کی نوکری کو یوں مٹھی میں لیا ہوا ہے۔ دوائیوں پیچھے لکھا ہوتا ہے بچوں کی پہنچ سے دور رکھیں۔ سسرال والے بھی کسی کو مقام نہیں دیتے (تجربہ) شاید کہیں دیتے بھی ہوں مگر مجبوراً گھر میں رائے دینا یہ کیا پوچھ لیا آپ نے۔

"سب سے پہلے شوہر کی آواز آتی ہے۔" تو نہ بول تو نہ بولا کر۔

اور بس جناب ہم بولنا ہی بھول گئے بول کے کرنا ہے کیا باقی سب کی بات تو کیا ہی کرنی۔ شوہر کو اپنی بہنوں کا گھر بسا اچھا لگتا ہے بس باقی کوئی مرے یا جیے کیا ضرورت ان بکھیڑوں میں پڑنے کی۔ ارے بیوی اور مل جائے گی (بلکہ کرو میری شادی) لیکن رشتے دوبارہ نہیں ملتے (ماں، باپ بہن، بھائی) میری ساس چپکے سے (خوب آنسو بھری نگاہیں) جو سپوت سے کہہ دیں بس وہی ہوتا ہے اور ہمیں خبر تو درکنار پوچھنا کس نے ہے؟ بہنیں گھر بیٹھی ہمارے گھر کے فیصلے فرما رہی ہیں اور خود سسرال سے دور، بس فون پر بیٹھی بھائی کا مستقبل سنوار رہی ہیں۔ بس جی، ہم کیا، ہمارا مقام کیا۔ ہماری زندگی کا تو کوئی مقصد ہی نہیں۔

سسرال والوں نے جس جس طرح سے دل توڑا ہے وہاں توقعات کا تو سوال ہی نہیں۔ مجھے ان سے کوئی توقع نہیں۔ اتنی بھی کہ مرتے کو دو گھونٹ پانی بھی پلا دیں، ہم مر کر بھی اپنی غلطی کا ازالہ نہیں کر سکتے۔"

س: "بچے کی پیدائش پر کسی دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔"

ج: "پہلی بچی ہونے والی تھی مجھے شدید الٹیاں آتی تھیں۔ میں بستر پر پڑی رہتی تھی۔ ایک دن میرے سسر صاحب فرمانے لگے لے لئی آ بیمار کڑی لے رج لے ایس توں۔" ان کا یہ نفرت انگیز جملہ سن کے شوہر صاحب مسکرانے لگے۔ پھر کیا تھا جب میں الٹی کرتی بے حال ہو جاتی، سارے ادھر ادھر ہو جاتے دروازوں کے پیچھے چھپ کے تکتے رہتے۔ ادھر میں ذرا سنبھل کے بستر پر گری پھر باہر نکل کے اپنے کاموں میں لگ گئے۔

جس دن میں نے الٹراساؤنڈ کروایا تو ڈاکٹر نے کہا کہ بڑا آپریشن ہوگا۔ گھر آ کر میری ساس نے مجھے بات ہی نہیں کرنے دی کہ میں شوہر کو بتاتی کہ آپریشن کا کہہ رہے تھے۔ شوہر کو بتا بھی دیا لیکن انہوں نے سنی ان سنی کر دی۔ خاندانی دائی نے بھی جواب دے دیا، پھر بھی میری ساس نے مجھے تسلی دے کر ادھر ہی رکھا اور پاس جیٹھانی صاحبہ بچہ سنبھالے تماشا دیکھتی رہیں۔

پھر جب میں مرنے والی ہو گئی تو ہسپتال لے جایا گیا۔ تو ڈاکٹر نے کہا کہ بچہ آپریشن سے ہی ہوگا کیس نارمل نہیں ہے۔ پھر آپریشن ہوا تو مجھے کوئی دیکھنے نہیں آیا۔ نہ جیٹھ نہ دیور نہ کوئی۔ سسر صاحب نے جاتے جاتے "کی حال اے" بس شام تک (اللہ جنت نصیب کرے) میرے والد اور امی آئیں۔ ان کو بھی کسی نے ٹھیک طرح نہیں ٹریٹ کیا نہ روٹی نہ پانی۔ باسی چاول کھا کے رخصت ہو گئے۔ ہوش آنے پر بچی نا کافی کپڑوں میں بے یارومددگار پڑی تھی کیونکہ ساس باہر عورتوں کے ساتھ گپیں لگانے نکل جاتیں۔

ایک نرس نے بتایا کہ تمہاری بچی ساس کو دی تو انہوں نے کہا کہ اسے خود ہی صاف بھی کر لاؤ۔ انہوں نے اسے پکڑنا تک گوارا نہیں کیا اور یہ بات میری ساس نے مجھے خود بھی ہنس ہنس کر سنائی۔ اگر میں شوہر کو بتا بھی دیتی تو کون میرا یقین کرتا۔

یہ سن کر مجھے بے حد رونا آیا۔ پھر میں اٹھ ڈرپ سمیت بیڈ سے اٹھ کر بچی کی کاٹ تک گئی اور اسے پاس لے آئی اور سنبھالے رکھا۔ حالانکہ ابھی ٹانکے بھی نہیں کھلے تھے۔

گھر آ کے گندگی نے میرا استقبال کیا۔ بیڈ پر غلاظت کے ڈھیر برتنوں کا ستیاناس۔ ٹوٹ پھوٹ کے ادھر ہی بکھرے پڑے تھے۔ جھاڑو تو شاید بالکل نہیں دی گئی تھی اور شیلف میں ایک برتن نہیں تھا۔ ساس نے کہا بچی کے پوتڑے میں دھو دوں گی۔" (اسی بہانے میری کسی بہن کو بھی نہ آنے دیا گیا)

جب دھونے کا کہا تو کہنے لگیں گند صاف کر کے رکھ دینا دھو میں لیتی ہوں۔ گند صاف کر کے سوکھنے میں خود بھی ڈال سکتی تھی، پھر کچے ٹانکوں سمیت باتھ روم میں گھسی تو واپسی پر دونوں کمزور کندھے ڈھلے، کپڑوں سے اٹے ہوئے تھے۔ بیڈ کی چادر، بچی کے کپڑے دھو کے لوٹی تو کمرے میں آہستہ آہستہ جھک کے جھاڑو دینے کی کوشش میں مزید نڈھال ہو گئی۔

جیٹھانی صاحبہ کی کمزوری اور ساس کا بڑھاپا عود کر آیا۔ دونوں نے بستر سنبھال لیے۔ کمزوری بڑھاپا اور نجانے کیا کیا مرض چمٹ گئے۔

میرے سسر صاحب نے نئے ڈنر سیٹ سے (پلیٹوں سے) حقے میں کوئلے ڈال لیے۔ نہ وقت پہ کھانا، نہ پانی پھر (تقریباً تیسرے دن) خود ہی اٹھ کے کھانا بنا کے کھا لیا اور میاں کے لیے رکھ بھی دیا۔ آہستہ آہستہ کپڑے دھونے اور صفائی کرنے لگی۔

میرے ٹانکوں میں پس پڑ گیا تھا (گرمیوں کے دن تھے) اور میں ساری رات جاگی تھی۔"

س: "جوائنٹ فیملی سسٹم سے اتفاق کرتی ہیں یا علیحدہ رہنا پسند ہے؟"

ج: "اگر خلوص اور محبت ہو تو جوائنٹ فیملی سسٹم برا نہیں۔ جب لوگ آپ کی سانسوں سے بھی حسد کرنے لگیں اور ظالم بن جائیں پھر علیحدہ رہنا چاہیے ویسے بھی آج کل لوگ رشتوں سے زیادہ پیسوں کے پیچھے بھاگتے ہیں۔ اگر کسی کے پاس ذرہ برابر بھی بہتر ہے تو ہاتھل بننے سے گریز نہیں کرتے۔

گھر کا ماحول بہت بہتر ہے میری وجہ سے کیونکہ میں بات کو پی جاتی ہوں اور مسئلے کا حل ڈھونڈتی ہوں چیختی چلاتی نہیں۔ امید ہے میرا سچ بھرا سلسلہ آپ کو پسند آیا ہوگا۔

☆

## بندھن

# غزالہ رشید ہمراہ محمد نسیم عرشی

شاہین رشید

ایک مصنفہ، کالم نگار، ریڈیو پاکستان سے وابستہ اور بہت سی تخلیقی صلاحیتوں کی حامل غزالہ رشید کا نام خاصا جانا پہچانا ہے، ایک طویل عرصے سے وہ اپنے قلم کے ذریعے قارئین کے دلوں سے جڑی ہیں انہوں نے ایک طویل عرصہ "ماہنامہ کرن" میں کام کیا۔ وہ شعبہ ادارت سے منسلک تھیں۔ اس زمانے میں محمود بابر فیصل حیات تھے۔ ان کی زیر ادارت غزالہ کی تخلیقی صلاحیتوں کو جلا ملی انہوں نے کافی افسانے اور ناولٹ لکھے اور ان کی صلاحیتیں کھل کر سامنے آئیں، پھر شادی کے بعد مصروفیات کے باعث انہوں نے جاب چھوڑ دی اور گھر داری میں مصروف ہو گئیں۔ آج ہم نے اسی حوالے سے ان سے گفتگو کی ہے

"کیسے مزاج ہیں غزالہ رشید صاحبہ؟"

"الحمدللہ۔۔۔

"ایک زمانہ تک لوگ سمجھتے تھے کہ ہم دونوں سگی بہنیں ہیں۔ نام کے ساتھ "رشید" جو ہے تو میں کہتی کہ سگی نہیں ہیں تو کیا ہوا، پیار محبت اور دوستی سگوں جیسی ہی ہے۔ زمانہ طالب علمی سے ہماری دوستی ہے۔"

"بندھن کے سلسلے میں اس بار ہم نے اپنی ای دوست کا انتخاب کیا ہے"

"جی ...... بندھن کے لیے حاضر ہوئے ہیں آپ کے پاس؟"

"بہت شکریہ یاد آوری کا بہت پرانا ناتا ہے۔ ان میگزین سے بہت کچھ سیکھا ہے اس ادارے سے، بہت کچھ پایا ہے اس ادارے سے۔ ہم سب نے مل کر ساتھ کام بھی کیا ہے۔ لکھنے کا شوق وراثت میں ملا اور لکھا بھی بہت کچھ۔"



"آج کل کیا مصروفیات ہیں؟"

"جب تک ساس حیات تھیں تو بہت زیادہ مصروف رہتی تھی۔ ان کے انتقال کے بعد مصروفیات بدل گئیں۔ میری گھریلو مصروفیات تو گھریلو خواتین والی ہی ہیں۔ باغ بانی کا شوق ہے پودوں میں بیل بوٹے لگانے کا شوق ہے تو اسی میں کافی ٹائم گزر جاتا ہے۔

کوکنگ کا بھی بہت شوق ہے اس میں بھی مصروف رہتی ہوں۔ میرا اپنا میکہ تو امریکہ میں ہی رہتا ہے۔ جب کہ سسرال یہاں ہے اور ماشاءاللہ بھرا پرا سسرال ہے تو آنا جانا لگا رہتا ہے

لکھنے کا کام بھی جاری ہے افسانے وغیرہ ڈائجسٹ میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ریڈیو پہ کالم بھی پڑھتی ہوں۔ اپنا یوٹیوب چینل بھی شروع کیا ہے "غزالہ رشید آفیشل" کے نام سے۔ میری کتاب افسانوں کا مجموعہ ہے۔ اس میں کچھ اپنی کاوشیں، کچھ دوستوں کی کہانیاں، رشتوں کی محبتیں ان سے یوٹیوب چینل کو سجاتی رہتی ہوں وقتاً فوقتاً۔ جب تک دم میں دم ہے اور قسمت ہے تو یہ مصروفیات جاری رہیں گی۔ تفہیم کی طرف بھی رجحان ہو گیا ہے۔ قرآن کا ترجمہ پڑھنے سے دل کو سکون بھی ملتا ہے۔"

"اپنا اور اپنے میاں صاحب "محمد نسیم عرشی" صاحب کا فیملی بیک گراؤنڈ بتاؤ؟"

"میرے والد صاحب کا تعلق جالندھر سے تھا، مائیگریٹ ہو کر بمبئی میں آ گئے اپنی جاب کی وجہ سے۔ والد صاحب کی طرف سے ہمارا بہت بڑا خاندان تھا۔ دادا، دادی، چچا، چچیاں، پھوپھیاں اور سب کا رجحان پڑھائی کی طرف بہت زیادہ تھا۔ دادا جی نے آج کوچ میں اسکول کھولا تھا جو کہ آج تک قائم و دائم ہے۔ ابو جب پاکستان آئے تو انہوں نے اسپیئر پارٹس کا کام شروع کیا۔ ان کی دکانیں بھی تھیں پھر وہ دبئی چلے گئے۔

ننھیال ہمارا مختصر سا تھا' ماموں اور خالہ تھیں مگر ان کا انتقال ہو گیا تو پھر امی ہماری اکیلی رہ گئیں۔ اسی طرح میاں صاحب کی فیملی میں بھی ان کے ابو دبئی چلے گئے تھے۔ ویسے ان کا تعلق دلی سے تھا اور مائیگریٹ ہو کر لاہور آئے تھے۔ لاہور سے کراچی بہت رکھ رکھاؤ والا خاندان تھا۔ نسیم کے والد اور میرے والد کی آپس میں بہت اچھی دوستی تھی۔

ہم سات بہن بھائی ہیں۔ میں اور میری باجی یہاں کراچی میں ہیں' باقی سب امریکہ میں رہتے ہیں۔ میں دو بھائیوں سے بڑی اور چار سے چھوٹی ہوں۔ دبئی' ابو کی وجہ سے آنا جانا رہتا تھا امریکہ بھی گئی مگر دل نہیں لگا کہ امی ابو پاکستان میں تھے اور میں ان کے بغیر رہ نہیں سکتی تھی۔ ویسے بھی مجھے ہمیشہ سے اور آج بھی پاکستان میں رہنا ہی اچھا لگتا ہے۔

میرے میاں صاحب دبئی میں پیدا ہوئے۔ میٹرک وہیں سے کیا، پھر ابو کی اچانک وفات کے بعد یہ پاکستان آ گئے۔ سیلف میڈ انسان ہیں۔ انہوں نے اپنی تعلیم اور جاب کو ایک ساتھ جاری رکھا۔ بی کام کیا۔ پھر کورسز کیے۔ یہ ریڈیو پاکستان میں اکاؤنٹس ڈیپارٹمنٹ میں ہیں۔ نسیم اپنی فیملی میں سب سے چھوٹے ہیں اور ان کے پانچ بھائی اور چار بہنیں ہیں۔

میری شادی کو تقریباً اٹھائیس سال ہو گئے ہیں اور ہمارا ایک ہی بیٹا ہے جو ہماری شادی کے تقریباً چھ سال بعد ہوا ہے۔ وہ کراچی یونیورسٹی میں ویژول اسٹڈیز کا طالب علم ہے حسن نسیم اس کا نام ہے۔ گھر میں چونکہ سب سے چھوٹا ہے تو ننھیال ددھیال میں بھی سب کا لاڈلا ہے۔

اللہ میرے بیٹے کو لمبی زندگی دے۔ (آمین) کہ یہی ہماری پونجی ہے۔"

"شادی سے پہلے بھی غزالہ رشید اور شادی کے بعد بھی وجہ؟"

"ہاں، یہ سوال اکثر لوگ مجھ سے کرتے ہیں۔ میں نظریاتی طور پر تھوڑی سی اسٹرونگ تھی۔ میری تعلیم اور میرے رائیٹر بننے میں والد صاحب کا ہاتھ ہے، میں ان سے متاثر بھی بہت تھی اور ہوں۔ پھر اسلامی لحاظ سے بھی مجھے کوئی پابندی دکھائی نہیں دی۔ تو میں سوچتی تھی کہ میں ایسا کیوں کروں؟

سچ کہوں کہ سب سے پیاری بات تو یہ ہوئی کہ میری ساس نے کبھی اعتراض نہیں کیا، جب میں نے نسیم صاحب سے اجازت لی تو انہوں نے بہ خوشی اجازت دے دی اور کہا کہ تم اس نام سے لکھتی ہو تو مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا ...... تو با حیثیت رائیٹر کے میں نے اپنا نام تبدیل نہیں کیا البتہ ویسے تمام کاغذات اور پاسپورٹ پر میرے نام کے ساتھ نسیم کا ہی نام ہے۔"

"پہلی ملاقات نسیم صاحب سے کب، کہاں ہوئی، رشتہ کس طرح طے پایا؟ اور کیا بات پسند آئی آپ کی؟"

"کیا بات پسند آئی اس کا تو مجھے علم نہیں ...... میں بہت اسٹریٹ فارورڈ سی لڑکی تھی۔ کوئی بات تو پسند آئی ہوگی۔ رشتہ ان کی بڑی بھابھی اور امی لے کر آئی تھیں اور ہمارا یعنی فیملیز کا آپس میں ملنا جلنا تھا، تو ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا ہوا تو تھا۔ اور بقول میرے میاں صاحب کے کہ مجھے ہمیشہ سے خواہش تھی کہ میں کسی پڑھی لکھی لڑکی سے شادی کروں۔ شاید یہی بات ان کو پسند آئی۔ میں تو عام سی لڑکی تھی۔ تو اللہ کا بڑا شکر ادا کرتی ہوں کہ اس نے میرے حق میں جو فیصلہ کیا' وہ میرے لیے بہترین ثابت ہوا۔ ڈیڑھ سال ہماری منگنی رہی۔ کبھی بھی دیر تک باتیں نہیں ہوئیں۔ بے حد پریکٹیکل تھے۔ ہاں میری سالگرہ پر تحفہ ضرور آتا تھا۔ تو مجھے بہت خوشی ہوتی تھی۔"

"دلہن گھر پر ہی بنیں؟"

"اس زمانے میں پارلر والی گھر پر آجایا کرتی تھیں۔ تو میری ایک دوست تھی جو پارلر میں کام کرتی تھی۔ اس نے مجھے کہا کہ میں گھر آ کر تمہیں تیار کر دوں گی۔ تو میں گھر پر ہی تیار ہوئی تھی۔"

"رسمیں وغیرہ ہوئیں؟"

"میرے والد صاحب کو مہندی وغیرہ کی رسمیں پسند نہیں تھیں' جب کہ ہمیں ڈھولک اور مہندی وغیرہ کا شوق تھا۔ اس بات پر گھر میں تھوڑا اختلاف ہوا تھا۔ جب کہ نسیم کے گھر والے رسم و رواج کے قائل تھے تو ابو کہتے تھے کہ یہ فضول رسمیں ہیں کسی پر بوجھ نہ ڈالو۔ خیر ایک ہی ہال میں ہم دونوں کی مہندی مایوں کی رسم ہوئی تھی۔

ہال ڈبل اسٹوری تھا تو ابو نے کہا کہ اوپر نیچے جانے میں مسئلہ ہو جائے گا تو ایک ہی جگہ پر رسمیں کرلیں۔ لڑکی والے اوپر فلور پر تھے اور لڑکے والے نیچے تو بس اس پر تھوڑا اختلاف ہوا کہ ابو کے کہنے پر ایک ہی جگہ رسمیں ہوئی تھیں جب کہ اس زمانے کے بزرگ کمبائن نہیں چاہتے تھے۔ اب تو خیر یہ بات عام ہو گئی ہے۔"

"شاپنگ سسرال والوں کے ساتھ کی تھی؟"

"اس وقت بھی مجھے کوئی ایسا خاص شوق نہیں تھا اور نہ ہی کوئی رواج تھا۔ میں نے اپنی طرف کی شاپنگ اپنی ایک دوست فرح اور اپنی باجی کے ساتھ کی تھی، اپنی پسند کے کپڑے وغیرہ لیے تھے۔ انہوں نے عروسی جوڑا اور ولیمے کا جوڑا اپنی پسند سے تیار کیا تھا۔ اب بہت فرق آ گیا ہے۔ زمانہ بہت بدل گیا ہے۔ ہمارے زمانے میں تو بہت ڈپریشن ہوتا تھا کہ پتا نہیں ماحول کیسا ملے گا۔ اب تو سب کو سب کچھ پہلے سے ہی پتا ہوتا ہے تو ہر کوئی انجوائے کرتا ہے۔"

"پہلی اولاد ...... کیسا محسوس ہوا تھا کامیاب زندگی کا کیا پیمانہ ہے؟"

"پہلی اولاد کی خوشی ہی کچھ اور ہوتی ہے اور جب تک آپ اس تجربے سے نہ گزریں آپ اس کا اندازہ کر ہی نہیں سکتے۔ یہ ایک بہت بڑی خوشی بھی ہے اور ذمہ داری بھی۔ "حسن" سے پہلے دو تین بار یہ خوشی ادھوری رہ گئی تو کوئی نہیں سوچ سکتا کہ میں کس ڈپریشن سے گزری تھی۔ پھر جب "حسن" میری گود میں آیا تو جیسے زندگی مکمل ہو گئی۔ سب خوش تھے۔ میں نے اس کی پرورش کے دوران اس کی چھوٹی چھوٹی خوشیاں بہت انجوائے کی ہیں۔

کامیاب زندگی کا کوئی فارمولا نہیں ہے۔ تربیت اچھی ہو اور صبر کا مادہ ہو تو پھر مشکلیں آسان ہو جاتی ہیں۔ جہاں جواب دینا ہو وہاں بھی خاموشی کے ساتھ وقت گزار دیں تو بات آگے نہیں بڑھتی یہ بات دونوں کو سوچنی چاہیے۔ اچھے برے حالات میں ایک دوسرے کا ساتھ دینا بھی زندگی کو کامیاب بناتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں میں اپنی خوشیاں تلاش کریں۔"

"شادی سے پہلے جاب کرنا فارغ بیٹھنے سے بہتر ہے۔ شادی کے بعد جاب کیوں ضروری ہے؟"

"نہیں ایسا نہیں ہے۔ جب اعلا تعلیم حاصل کی ہو تو اس کو استعمال بھی کرنا چاہیے۔ جاب ضرور کرنی چاہیے سسرال میں رہنا آ جاتا ہے کیونکہ گھر میں تو بس لاڈ پیار میں اور کسی قسم کی ذمہ داری نہ پڑنے سے سسرال میں مشکل پیش آتی ہے۔ میں نے تو شادی کے بعد بھی جاب کی، کیونکہ سب دبئی میں تھے۔ ہمیں اپنا گھر بھی بنانا تھا تو اس مقصد کے لیے بھی میں نے جاب کی۔ اس کی تفصیل کسی اور وقت بتاؤں گی۔ خواتین کو جاب ضرور کرنی چاہیے تاکہ انہیں پتا چلے کہ مرد حضرات کتنی محنت سے کماتے ہیں اور وہ گھر میں وقت کو سو کر نہ گزاریں۔ جاب سے انسان بہت کچھ سیکھتا ہے۔"

"سسرال کیسا ملا ......؟"

"مجھے سسرال بہت اچھا ملا ...... میری سب نندیں اور جیٹھانیاں بہت سگھڑ اور بہت اچھا کھانا پکانا جانتی تھیں۔ مجھے تھوڑا مشکل لگتا تھا اور ڈر بھی لگتا تھا۔ ہاں مجھے سیکھنے کا بہت شوق تھا تو جو نہیں آتا تھا' وہ میں نے سیکھا۔ مجھے کوکنگ اچھی نہیں آتی تھی' روٹی پرفیکٹ پکانی نہیں آتی تھی تو سیکھا سب کچھ اور پھر میرے پکوان کی بھی بہت تعریف ہوتی تھی۔ چائنیز بھی سیکھا۔ مطلب آہستہ آہستہ ہر چیز سیکھی۔"

"جوائنٹ فیملی میں رہیں؟ کیا بہتر ہے؟"

"میں جوائنٹ فیملی سسٹم میں نہیں رہی۔ کیونکہ نندوں کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ باقی آدھی سے زیادہ فیملی دبئی میں اور دوسرے شہروں میں تھی۔ بس گھر میں جیٹھ اور جیٹھانی ملے اور بہت اچھا وقت گزرا ان کے ساتھ اور اپنی جیٹھانی سے میں نے بہت کچھ سیکھا۔ ان کی شادی بھی ہماری شادی سے کچھ ہی عرصہ پہلے ہی ہوئی تھی۔ ابو کا انتقال بہت پہلے ہو چکا تھا اور امی نے بہت اچھا ہولڈ رکھا ہوا تھا کوئی کسی سے کوئی اونچی آواز میں بات بھی نہیں کرتا تھا سسٹم دونوں ہی بہتر ہیں۔"

"شادی ہوئی / پیار محبت ہوا، پھر رشتہ ٹوٹ گیا کیوں؟"

"مشکل سوال ہے۔ عدم برداشت وجہ ہے۔ کبھی بھی میاں بیوی کو آپس میں بات چیت کرنا نہیں چھوڑنا چاہیے۔ امی ہمیشہ یہ کہتی تھیں کہ اگر ایک بول رہا ہو تو دوسرا خاموش رہے۔ اس وقت تو بات سمجھ میں نہیں آتی تھی مگر پھر آنے لگی کہ دونوں کو ایک دوسرے کو برداشت کرنا چاہیے۔"

"کچھ میاں کے بارے میں بھی باتیں ہو جائیں۔ میاں صاحب چٹورے ہیں۔ دعوتیں ہوتی ہیں؟"

"نہ صرف میاں بلکہ بیٹا بھی چٹورا ہے۔ دونوں کو کھانے پینے کا شوق ہے۔ اگر یہ دونوں اچھا کھانے پینے کے شوقین نہ ہوتے تو شاید میں سیکھ بھی نہ پاتی۔ شام کی چائے پر بھی اہتمام نسیم اور حسن کو اچھا لگتا ہے اور میں سب کچھ خود ہی کرتی ہوں۔ ہاں کوئی لمبی گیدرنگ ہو تو ایک آدھ

کھانا باہر سے پکوالیتی ہوں۔ تعریف کرتے ہیں سب تو لگتا ہے کہ میں اچھا پکالیتی ہوں ُ خوتمیں بھی ہوتی ہیں۔"

"میاں صاحب کی اچھی اور بری عادت بتائیں؟ مزاجا کیسے ہیں؟"

"بہت اچھی عادت یہ ہے کہ بات کو لمبا نہیں لے جاتے، دہراتے نہیں ہیں۔ درگزر کرتے ہیں۔ غصہ تیز ہے مگر پھر بھی باتوں کو دہراتے نہیں۔ سب سے بری عادت یہ تھی کہ اسموکنگ بہت کرتے ہیں مگر اب کچھ عرصے سے اسموکنگ چھوڑ دی ہے۔ ڈرائیونگ کے دوران انہیں بہت غصہ آتا ہے یہ عادت تو مجھے بہت بری لگتی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ اب کراچی کے ہر شہری کا مسئلہ ہے۔

مزاج کے نارمل ہیں۔ فرینڈلی ہیں۔ بہت پوزیٹو ہیں۔ والدین جب تک حیات رہے، بہت خدمت کی بہت خیال رکھا۔ کبھی بلاوجہ کے داماد نہیں بنے، میں بہت لمبی لڑائی کی قائل نہیں ہوں۔ بہت دیر تک ہم ناراض نہیں رہ سکتے۔ صلح میں / میں ہی پہل کرتی ہوں، کبھی وہ بھی کرلیتے ہیں۔"

"سالگرہ یاد رہتی ہے؟ خیال رکھتے ہیں؟ بچوں کے معاملے میں کون سخت ہے؟"

"جی سالگرہ مناتے ہیں اور تحفے تحائف کا تبادلہ بھی ہوتا ہے۔ ویسے بھی میرا بہت خیال رکھتے ہیں بلکہ بہت زیادہ خیال رکھتے ہیں۔ اب تو مجھے بھی خیال رکھنا آ گیا ہے ورنہ میں تو تھوڑی سی لاابالی تھی۔ بچے کے معاملے میں، میں سخت ہوں۔ یہ تو دوست ہیں "حسن" کے اور حسن کو بھی یہ بات پتا ہے کہ "بابا" کو کیا پسند ہے اور کیا پسند نہیں ہے۔"

"وقت کے ساتھ ساتھ شخصیت میں کافی تبدیلیاں آتی ہیں۔ محبت میں کمی ہوئی یا اضافہ؟ اور کبھی نئی اچھی لگتی تھیں؟"

"ہاں! انہیں ہمیشہ سے ہی میرا تیار رہنا پسند تھا۔ اکثر کہتے تھے کہ تمہاری سب عادتیں اچھی ہیں بس یہ بری ہے کہ تم اپنا خیال نہیں رکھتیں۔ جب کہ مجھے میک اپ کرنا کچھ خاص پسند نہیں تھا۔ بس میرا اپنا خیال ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ شخصیت میں وقار آ جانا چاہیے۔ وقت کے ساتھ ساتھ میاں بیوی میں ایک ٹھہراؤ آ جاتا ہے جو کہ اچھا لگتا ہے، ایک دوسرے کی عادت بھی ہو جاتی ہے اور محبت بچے میں منتقل ہو جاتی ہے۔"

"منہ دکھائی میں کیا ملا تھا، کبھی روٹھ کر میکے گئیں؟"

"کیا یاد دلا دیا..... منہ دکھائی میں "سونے کے کڑے" ملے تھے۔ آج کے زمانے میں تو اتنے اچھے کڑے دینا بہت ہی مشکل ہے کیونکہ مہنگائی نے طوفان مچایا ہوا ہے۔ روٹھ کر میکے جانے والی بات پر بتاؤں کہ جب میری نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ تو انہوں نے مجھ سے بڑے سیریس انداز میں کہا تھا کہ "دیکھو کبھی روٹھ کر اپنے گھر مت جانا کہ شاید پھر میں لینے نہ آ سکوں۔

اس بات سے میں ایسی خوف زدہ ہوئی کہ کبھی بہت بھی ناراضی ہوئی تو ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں چلی گئی لیکن کبھی روٹھ کر میکے نہیں گئی۔ نسیم بہت سچے 'اسٹریٹ فارورڈ اور پریکٹکل انسان ہیں۔ میں ڈر گئی کہ گھر والے دروازہ نہیں کھولیں گے اور یہ مجھے لینے نہیں آئیں گے۔ پھر میری تربیت بھی ایسی نہیں کی تھی کہ روٹھ کر میکے آ جاتی۔"

"کوئی تعریفی جملہ میاں صاحب کا جو تمہیں اچھا لگتا ہے۔ اور اپنے طور پر کچھ کہنا چاہو تو ضرور کہو..... ؟"

"ہاں جب بھی کوئی کامیابی ملتی ہے تو یہ ضرور کہتے ہیں کہ "یہ سب تمہاری دعاؤں کا نتیجہ ہے" تو اپنا آپ بڑا معتبر سا لگتا ہے۔ یہ ضرور کہنا چاہوں گی کہ زندگی بہت سکون میں اور بہت اچھی گزر رہی ہے۔ زندگی میں ہر طرح کے کرائسس آتے ہیں جن کو سہنا پڑتا ہے..... والدین جب بچھڑ جاتے ہیں تو ان کی بہت کمی محسوس ہوتی ہے۔ انسان اپنے آپ کو بہت تنہا محسوس کرتا ہے مگر پھر ایسے موقع پر اپنا گھر، اپنا شوہر، بچے کسی جنت سے کم نہیں لگتے۔

بڑا سکون ملتا ہے یہ سوچ کر کہ ہمارا اپنا گھر ہے تو اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے حق میں جو فیصلہ کرتا ہے بہترین ہوتا ہے۔ تب سجدے میں بہت سکون ملتا ہے..... اور رشتوں میں عزت واحترام ہو تو پھر انہیں کوئی نہیں چھوڑ سکتا وہ قائم ودائم رہتے ہیں۔ میں بہت خوش ہوں اپنی ازدواجی زندگی میں اور اس کے ساتھ ہی ہم نے غزالہ رشید صاحبہ سے اجازت لی شکریے کے ساتھ۔"

☆



رضوانہ وقاص..... کرلاپی ہری پور سے شرکت کررہی ہیں، لکھتی ہیں

سدرہ جبار پھولوں کا گلدستہ ہاتھ میں لیے اچھی لگیں پہلی شعاع پڑھی۔ پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں ہمیشہ کی طرح پیاری بہت ہی پیاری لگیں "تمہارا نام شعاع" سمیرا حمید کا پڑھا، بہت ہی اچھا لگا۔ تی کیا بات ہے۔ شعاع واقعی ہماری بہت رہنمائی کرتا ہے۔

"خوشبو ہوئے جائیں۔" سب نے ہی بہت اچھا لکھا پڑھ کر مزہ آیا۔ "اقبال بانو سے ملاقات" بہت ہی اچھی رہی۔ ان کے شوہر کا سن کر دل اداس ہو گیا۔ آپ کے ڈرامے کے بارے میں پڑھا۔ پلیز میری بات سے ناراض نہیں ہونا لڑکیوں کو دوپٹہ لینا چاہیے۔ اب کوئی بھی ڈرامہ دیکھو لڑکیاں دوپٹے کے بغیر دکھائی دیتی ہیں۔ جو نہیں اچھا لگتا (ہاں ناں)

"خط آپ کے" میں سب کے خط پڑھتی ہوں بہت شوق سے۔ "نور القلوب" خدیجہ بہت ہی بری لگی کیسے سارا الزام زہرہ پر لگا دیا۔ زہرہ تو بے چاری معصوم تھی۔ خدیجہ کو بھی اس کی سزا ملنی چاہئیں اور یہ کیا صندل بی اور شاہدہ تائی بھی ایک دوسرے کو باتیں سنانے لگ گئیں۔ کیا اب مدرسے کا ماحول خراب ہو جائے گا۔ ماہی نے اچھا کیا جو خوشل کو بتا دیا۔ وہ ناراض ہونے کے بجائے خوش ہے۔ "واحصر" میں وری ٹھیک نہیں کررہی۔ وہ ملنے نہیں جائے، نانی اس کے ساتھ اتنا پیار کرتی ہیں۔ باقی بھی سب گھر والے اس کا اتنا خیال رکھتے ہیں۔ ادھر عامر بھی اپنے بھائی عیسیٰ کے ساتھ کیوں اتنا برا رویہ رکھ رہا ہے۔ جو بھی ہے کہانی مجھے وری لوگوں کے کزن کی وجہ سے اچھی لگتی ہے۔ آپس میں نوک جھونک۔ باتوں سے خوشبو آئے، ساری باتیں اچھی ہیں۔ ایک خط" نیلوفر جاوید کا پڑھا اچھا لگا۔ میرے شوہر کی سالگرہ پروش کردیں۔

پیاری رضوانہ: ہمیں افسوس ہے کہ آپ کا خط اور انتخاب جگہ نہ پاسکا۔ صفحات کی کمی کی وجہ سے بہت سی تحریریں شامل نہیں ہو پاتیں۔ اس کا آپ سے زیادہ ہمیں افسوس ہوتا ہے۔

خط بھجوانے کے لیے پتا۔
ماہنامہ شعاع۔ 37۔ اردو بازار کراچی۔
Email:shuaa@khawateendigest.com

خدیجہ نے زہرہ کے ساتھ برا ضرور کیا لیکن زہرہ کے اپنے دل میں بھی چور ضرور تھا جس کا خدیجہ نے فائدہ اٹھایا۔ پھر زہرہ کی حماقت یک طرفہ عشق کا اظہار بھی کر بیٹھی۔ لڑکیوں کو اپنے نسوانی وقار کا خیال رکھنا چاہیے۔ اس طرح کی حرکتوں سے انہیں ذلت ہی اٹھانی پڑتی ہے۔

آپ کے شوہر کو سالگرہ کی مبارک باد اور دعائیں۔

شبانہ کوثر نے ڈنگہ سے شرکت کی ہے لکھتی ہیں

میری بیٹی نے رسالہ ملتے ہی کھول کر پہلے خط تلاش کیا جو چھپا ہوا مل گیا۔ وہ چھت پر برتن دھو رہی تھی۔ خوشی سے بھاگتی ہوئی میرے پاس آئی۔ میں کچن میں کھانا بنا رہی تھی۔ مجھے بھی بہت بہت خوشی ہوئی۔

اگست کا شمارہ 6 اگست کو ہی مل گیا، میرا چھوٹا بیٹا

شہر میں روز سائیکل پر تعلیم حاصل کرنے جاتا ہے۔ پہلے قرآن پاک حفظ کرتا ہے اور بارہ بجے سے دو بجے تک اسکول کی تعلیم حاصل کرتا ہے۔ ساتویں کلاس میں پڑھتا ہے۔ خواتین، شعاع کو اللہ تعالیٰ کامیابیوں کی بلند سطح پر پہنچائے۔ اس میں کام کرنے والے ہر فرد کو سلامت رکھے۔ ہم اور ہمارے بچے تھوڑی دیر کے لیے ٹینشن فری ہوجاتے ہیں اور زندگی کے اتار چڑھاؤ کی اونچ نیچ سے واقف ہوتے ہیں۔

پیاری شبانہ! بہت بڑی سعادت ہے کہ آپ کا بیٹا قرآن پاک حفظ کررہا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو کامیابی دے اور قرآن پاک کی تعلیمات پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

نجمہ جبار بہاول پور سے شریک محفل ہیں لکھا ہے

سب سے پہلے بریرہ رسول کا بہت شکریہ دل سے کہ مجھے بتاتی ہے کہ جلدی آجاتا ہے اس کے پاس شعاع کہ میرا کیا لگا۔ یہ بھی 1999 سے آپ کے تینوں ڈائجسٹ پڑھتی ہیں، ہر ماہ مگر تبصرہ کرتے ہوئے سستی۔ ماشاء اللہ ضحاک بیٹا ہے، ان کا کالج میں پڑھتا ہے۔ آج کل کافی بارشیں ہورہی ہیں کہ ساون کا مہینہ ہے۔ آج بھی ہے۔ ان کے پیا تو جاب پر ہیں شام کو آئیں گے اور بڑا بیٹا آریان تو ہوسٹل میں ہے ارمغان اشمل اسکول سے آکر کھانا کھا کر فری ہوئے تھے کہ بارش آگئی تو میرا بھی دل کیا کہ کوئی برسات کا گانا ہوجائے، 1992 کا گانا ''برسات میں جب آئے گا ساون کا مہینہ، ساجن کو بنالوں گی انگوٹھی کا نگینہ'' کتنا اچھا اور گہرے مالٹا رنگ کا لہنگا پہنا ہوا ہے۔

خیر شعاع پر آتی ہوں تو سالگرہ نمبر کا خاص شمارہ سامنے ہے۔ ماڈل عمر رسیدہ اور ایک انگلی کے ناخن پر پالش لگانا بھول گئی یا موسیٰ رضا والوں سے میک اپ والوں کی کوتاہی ہوگی۔ سلسلوں میں سب اے دن، سمیرا کا شعاع کے لیے لکھنا اچھا لگا تو وہیں نیلوفر نے سب کو یاد کیا تو ویسا اگر میں بھی شعاع کے لیے اپنی کوئی یادیں لکھوں تو کیا قارئین پڑھ سکیں گی؟ سروے میں سب کی باتیں اور یادیں رنگین یا مالٹائی زردے کی طرح مزے دار تھیں کہ یہ میری پسندیدہ میٹھی ڈش ہے۔ آسیہ رئیس کو پڑھنا اچھا لگتا ہے۔ دادی اور ہیروئن کی محبت اور انداز، گاؤں کی منظر کشی اچھی کی۔ سمیرا کا ناول مجھے زیادہ پسند نہیں آیا۔ ہاجرہ ریحان کا افسانہ سمجھ میں نہیں آیا۔ سر سے ہی گزر گیا آپ ہی بتادیں کہ کیا کہنا چاہتی تھیں ہاجرہ۔ صائمہ نور ماشاء اللہ اس بار بھی اچھے سے آئیں پچھلے ماہ کی طرح تو اب آتی رہیں۔ عزت کی روٹی کے لیے سب نندوں اور بھابیوں کو اتنی سوچنا چاہیے۔ اچھا سبق ''کہانی'' اور خوشیوں کے رنگ ''افسانے ٹاپ پر تھے جب کہ حسنہ حسین شکر ہے اس ماہ کچھ آگے تو آئیں۔

تنزیلہ کے ناول میں آج کل وہ موٹا سا داؤد نظر نہیں آرہا۔ ہاں نور بی بی تو بڑی زبان دراز ہیں۔ اس ماہ پتا چلا پڑھ کر۔

اشمل کے ناول میں اف اتنے کردار ہیں کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کون کیا کررہا ہے۔ دیکھتے ہیں کہ وری کی کس کے سنگ لگے گی پار ہاہاہ۔ اقبال بانو سے باتیں بھی اچھی تھیں۔ ہاں یاد آیا کہ شعاع کی پڑھنے والیوں خطوط میں کبھی ہمیں بھی یاد کیا کرو کہ ہم بھی اس دشت کی سیاہی کے استعمال کرنے والے ہیں۔

پیاری نجمہ! لگتا ہے آپ کو برسات زیادہ ہی پسند ہے تب ہی اتنے پرانے گانے یاد آرہے ہیں وہ بھی اتنی تفصیل کے ساتھ۔ بارش تو اس بار کراچی میں بھی خوب ہورہی ہے ورنہ تو پچھلے کئی سالوں سے تو بارش کے لیے ترس گئے تھے۔ پورے سیزن میں ایک یا دو بار ہوتی تھی اور کوئی کوئی سال تو سوکھا ہی گزر جاتا تھا۔ بارش رحمت ہے لیکن افسوس ناک بات یہ ہے کہ دوسری نعمتوں کی طرح ہم نے اس رحمت سے بھی فائدہ نہیں اٹھایا۔ شعاع پر تفصیلی تبصرے کے لیے شکریہ شعاع کے لیے اپنی یادیں ضرور لکھیں۔

مایا ناز چنیوٹ سے شریک محفل ہیں لکھا ہے

یہ آپ ہی کی گئی حوصلہ افزائی کا نتیجہ ہے کہ دوبارہ خط لکھنے کی جسارت کررہی ہوں آج خیر سے 14 تاریخ



کو رسالہ ملا، ادھورے خط کو پاکر بھی پوری خوشی محسوس کیا۔ اس ماہ کا رسالہ مجھے کافی مہنگا پڑا بہن بھائی کو آئس کریم اور اماں ابا کو مٹھائی کھلائی خط کے جواب میں آپ کا کہنا کہ آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے، چاہیں تو لکھ سکتی ہیں سیروں خون بڑھا گیا۔ میں کیوں نہیں لکھنا چاہوں گی بلکہ میں تو خود اپنے شوق کی تسکین چاہتی ہوں چند تحاریر تو لکھ بھی چکی ہوں لیکن بھیجنے کی سبیل نہیں بن رہی اگر آپ کی اجازت ہو تو اسی طرح بھیج دوں جیسے خط بھیجا ہے واٹس ایپ کا ذکر اس لیے نہیں کررہی شاید قارئین کی جذباتیت کی وجہ سے آپ نے بھی خط میں ذکر نہیں کیا۔

پیاری مایا مٹھائی کے شوقین تو ہم بھی بہت ہیں۔ ہمارا حصہ کہاں ہے؟

ہم نے رسالہ میں ای میل ایڈریس دیا ہے۔ آپ اس پر ای میل کردیں۔ فہرست کے صفحات پر ای میل ایڈریس دیا ہوا ہے۔

کراچی سے تسنیم کوثر لکھتی ہیں

سب سے پہلے ہم نے تمہارا نام شعاع ہے پر نظریں دوڑائیں، سمیرا حمید کی منفرد اور خوب صورت تحریر دل کو چھوگئی۔ سچ کہا انہوں نے کہ شعاع ہماری رہنمائی کرتی ایک پیاری سی سہیلی ہی تو ہے۔ اس طرح ایک تھی محبت بھی انہوں نے غضب کا لکھا ہے ویسے بھی اتنی انوکھی اچھوتی سی محبت کم دیکھنے میں آتی ہے بہرحال سمیرا حمید خوش رہے۔ اور اب ایک اور دلکش ناول ہو کے مجبور بھی اچھا لگا۔ آسیہ رئیس خان نے یقیناً نہایت محنت سے لکھا ہوگا اسے ہم نے A گریڈ سے او کے کردیا ہے اور جناب حنا بشریٰ کی نکمی نے خوب مزہ دیا وہ جو اکبری اصغری ہم پڑھتے ہیں تو اس نکمی نے اکبری جیسی نکمی کو بھی مات کردیا، بھئی بہت خوب، مصنفہ صاحبہ آپ نے لاجواب لکھا ہے۔ افسانوں میں عائشہ بشیر کی عزت کی روٹی اچھی لگی۔ اور نظیر فاطمہ کی کہانی سعادت مند بھی لائق تحسین ہے اس کے علاوہ، عائشہ تنویر کی رنگ خوشیوں کے نے دل خوش کردیا بلکہ یہ کہنا چاہیے غرارہ کی کہانی مزیدار اور دلچسپ لگی۔

اور ایک منفرد عمدہ بہترین ایک خط جسے نیلوفر جاوید نے تحریر کیا کمال کا لگا۔ اتنا بہترین جاندار، مکمل جامع طرز تحریر نے بے حد متاثر کیا اور سب سے زیادہ خوشبو ہوتے جائیں کے حسین سروے سے بہت دل خوش ہوا۔ آپ نے ہمیں اس پیارے سروے میں شامل کیا میں تہہ دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں۔ اور بہت زیادہ معذرت کے ساتھ کہ وانعصر اور عسر یسرا میں اب مزید دل نہیں لگ رہا ہے ویسے یہ حقیقت ہے کہ یہ دونوں ناول قارئین میں مقبولیت حاصل کررہے ہیں۔

پیاری تسنیم! عسر یسرا کی تو اب ایک یا دو اقساط ہی باقی ہیں۔ والعصر ابھی چلے گا۔ اس میں دل لگائیں۔ کہانی نئی ہے اور امت العزیز لکھ بھی بہت اچھا رہی ہیں شاید صفحات کم ہوتے ہیں۔ جبکہ کہانی میں کردار زیادہ ہیں۔ اس لیے اس ناول کا تاثر قائم نہیں ہوپارہا ہے۔

سروے میں شامل کرنے کے لیے شکریہ کی ضرورت نہیں۔ شعاع آپ کا اپنا پرچا ہے، اس پر آپ کا پورا حق ہے۔ ویسے بھی آپ ہماری مستقل قاری ہی نہیں تبصرہ نگار بھی ہیں۔

جویریہ مریم نے مرید کے سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

رات قطرہ قطرہ پگھلنا شروع ہوچکی ہے میں ابو کے بستر میں بیٹھ کے۔ آپ کو خط لکھ رہی ہوں ابو جی لاہور گئے ہوئے ہیں رات میں دیر سے آئیں گے۔

سال دہلیز پر آیا تو لبوں سے خیر کی دعائیں نکلتی تھیں اور دل! دل کسی جواں سال مرگ کے واہموں میں لپٹا تھا۔ اور یہ واہمے 6 جنوری کی شب سچ ثابت ہوگئے جب میرے عزیز از جان چاچو اچانک، لمحوں میں ہم سے بچھڑ گئے۔ قیامت جیسی رات تھی وہ......

میرے چاچو ڈائجسٹ بہت شوق سے پڑھا کرتے تھے۔ قارئین سے دعاؤں کی درخواست ہے۔

عسر یسرا بہت زبردست ناول ہے۔ لیکن مجھے لگ رہا ہے کہ کئی ماہ سے کہانی کچھ ٹھہر سی گئی ہے۔ پھر بھی جو اچھا لکھیں ان کا ٹھہراؤ بھی دل کو بھاتا ہے۔

ایک ریکویسٹ ہے پلیز، پلیز! پلیز! عسر یسرا کے اختتام پر حسنہ حسین سے انٹرویو ضرور لینا بہت تجسس ہے مجھے حسنہ جی کے متعلق جاننے کا۔ میرے ساتھ ساتھ میری آپیوں کو بھی انتظار ہے اس دفعہ کہانی لگنے پر میں انہیں زبردست سی پارٹی دینے کا ارادہ کیے ہوئے ہوں ان شاء اللہ!

ہم چھ بہنیں ہیں اور ایک بھائی، سب سے چھوٹی بہن سے بھی آٹھ نو سال چھوٹا ہے۔ میرے ابو جب اس عمر میں بھی ہم بہنوں کی خاطر، کمانے کے لیے نکلتے ہیں تو دل درد سے بوجھل ہو جاتا ہے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میں اپنے ابو جی کی ساری فکر، قرض، کندھوں کا بوجھ بانٹ لوں۔ انہیں جوان، کماؤ بیٹے کی کمی محسوس نہ ہو۔ وہ بھی سکھ سکون اور فکر سے آزاد زندگی گزاریں۔ میرے اللہ کے بعد میرا قلم مجھے اس قابل بنائے گا ان شاء اللہ۔

جویریہ! آپ کی ایک کہانی شامل ہے۔ باقی کہانیاں ابھی پڑھی نہیں گئیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے ارادوں میں کامیاب کرے آمین، چچا کی وفات کا سن کر افسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے آمین۔

شاہدہ نور اور وردہ غزل لکھتی ہیں

خط لکھنے کا آئیڈیا ہماری وردہ کا تھا کہ باجی ہم لوگ اتنے سالوں سے خاموش قاری ہیں ہم بھی شرکت کریں۔ دیکھتے ہیں کہ ہمیں اس سلسلے میں جگہ ملتی ہے کہ نہیں!

سب سے پہلے حمد اور نعت پڑھی اس کے بعد "پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں" پڑھیں دل اور دماغ معطر ہو گیا۔ پھر پہنچے اپنے پیارے سلسلے "آپ کے خط" کی طرف سب بہنوں کے تبصرے بہترین بلکہ لاجواب تھے پھر اپنی پسندیدہ کہانی "عسر یسرا" پڑھی۔ بہت غصہ آیا مدینہ زبیر پر، کتنا برا کیا ہے اس نے فارس وجدان کے ساتھ۔

"پھر "نور القلوب" پڑھی، اب کی قسط بڑی ہی اچھی تھی اس میں زہرا کے ساتھ بہت برا ہوا ہے پلیز خدیجہ کو اس کے کیے کی سزا ضرور ملے۔ اس کے بعد "والعصر" پڑھی یہ قسط بھی بہت اچھی تھی اب خولہ کا کردار شاید کھلے۔

پھر سمیرا حمید جی کا "ایک تھی محبت" پڑھی صوفی نے اچھا نہیں کیا عیسیٰ کے ساتھ پھر آسیہ رئیس صاحبہ کا "ہو کے مجبور" نارمل کہانی تھی، سارے افسانے بہت اچھے مگر سعادت مند اور عزت کی روٹی بہترین لگی اور اس کے علاوہ "کیسے؟" صائمہ نور کا افسانہ حقیقت تھی، ایسا اکثر ہوتا ہے۔

پیاری وردہ اور شاہدہ! ہم آپ کو شعاع کی محفل میں خوش آمدید کہتے ہیں۔ آپ نے شرکت کی اور بہت اچھے تبصرے کے ساتھ شرکت کی ہر کہانی پر، اس کے کرداروں پر تبصرہ کیا۔ خدیجہ جیسی لڑکیاں بچ نہیں سکتیں۔ انہیں سزا ضرور ملتی ہے۔ کبھی جلدی کبھی دیر سے لیکن زندگی کسی نہ کسی موڑ پر ان سے حساب ضرور لیتی ہے۔

زراع احمد...... دادو سندھ سے شریک محفل ہیں لکھا ہے

سلامت رہیں ادارے سے وابستہ چراغ اور اس میں روشنی بھرنے والے قارئین۔

میں زراع احمد ہوں۔ آپ نے زارہ لکھا۔ اچھا لگا کوئی بات نہیں۔ اصل معاملہ یہ کہ میری کہانی سود اور خسارہ کے نام سے جو کہ حیدرآباد سے پوسٹ کی تھی۔ پچھلے سال نومبر میں۔ دل سے لکھنے جانے والا ناول تھا۔ جو ابھی کہانی بھیجی، وہ میں نے سال پہلے لکھ کر آدھی رکھ دی تھی۔ دعا ہے پڑھنے کے قابل ہو۔

تب بہت معصوم ذہن تھا۔ زندگی کی تلخیوں سے محفوظ، گیارہ سال کی عمر سے آئیڈیاز آتے رہتے تھے لکھ کر پھاڑ دیتی تھی 2005 میں دوست کے حوالے سے شعاع ڈائجسٹ حاصل ہوا۔ دنگ رہ گئی یا خدا...... آئیڈیاز بھی لکھے جاتے ہیں۔ تب سے خریدنا اور پڑھنا شروع کر دیا۔ درمیان میں پھر چھوڑ دیا سلسلہ......

شادی ہو گئی بچے ہوئے۔ ابھی چھوٹے ہیں وقت نہیں مل پا رہا تھا۔ پچھلے سال اچانک امی کو برین ٹیومر ظاہر ہوا۔ زندگی نے ماں کا ساتھ عطا کیا۔ ان سے



زیادہ عزیز اور دوست کوئی نہیں۔ انہوں نے تنہا ہو کر بھی بڑی بہادری سے زندگی کا سامنا کیا۔ اللہ انہیں ہم دونوں بہنوں کے سر پر سلامت رکھے آمین۔ زبان کی تلخ۔ دل کی سچی اور کھری ان کے لیے دعا ضرور کیجیے گا۔

پھر ڈپریشن نے پڑھنے پر مجبور کیا پرانے ڈائجسٹ نکالے، نئے خریدے۔ پڑھتے پڑھتے شعور کی شمع لو دینے لگی۔ جی چاہا چلو زراع اس بار پھر قلم تھامو، کوشش کرو۔ کہانی اپنے شہر دادو سے پوسٹ کی۔ اول تو میں فرحت اشتیاق جیسا لکھ سکتی ہوں نہ سمیرا حمید جیسا۔ نہ نمرہ نہ ہی منعم ملک اور سائرہ رضا جیسا۔ قلم ہے کہ جادو۔ اگرچہ من ملول ہے مگر پھر بھی اچھے موسموں کی محفلیں لگی ہوتی ہیں۔ بارش کا موسم ہے، ہر چہرہ پر نور لگتا ہے فطرت کے رنگ برسات میں بکھرے ملتے ہیں زندگی مختصر ہے آج کل۔ سو جھمیلے لگے ہیں مگر پھر بھی کشش کا ئنات قائم ہے۔ میری دوست "مقدس" نے کہا تھا موقعوں کو گنوانا نہیں چاہیے قسمت بار بار آپ کے دروازے پر دستک نہیں دیتی ہے۔ ویسے بھی لگن اور وقت واپسی کے منتظر نہیں رہتے۔ کوشش کی ہے کہ کامیاب ہو جائے۔ بارہ گھنٹے میں سے چند گھنٹے مجھ سے فارغ رہا نہیں جاتا۔ عجیب قسم کا ڈپریشن ہونے لگتا ہے۔ کافی علاج کرایا۔ افاقہ نہیں ہوتا۔ سوچا مصروفیت اس وقت کی کاٹ ہے۔ اللہ میرا ساتھ دے۔

پیاری زراع! سب سے پہلے معذرت کہ آپ کا نام غلط شائع ہو گیا۔ اس بار خاص طور پر توجہ دی ہے۔

پیاری بہن! آپ میں صلاحیت ہے لیکن مسئلہ آپ کی رائٹنگ ہے۔ بہت دشواری ہوئی ہے آپ کا خط پڑھنے میں۔ پھر آپ نے سطر چھوڑ کر بھی نہیں لکھا۔ آئندہ خط لکھیں تو سطر چھوڑ کر لکھیں۔ ڈپریشن کا علاج ہو سکتا ہے۔ بہتر ہے کہ آپ کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھا کر دوا لے لیں۔ یہ کوئی بڑی یا لاعلاج بیماری نہیں ہے لیکن تکلیف دہ ضرور ہے۔

عمارہ رفیق نے فاضل پور سے لکھا ہے

کیا کوئی ایسا خط بھی آتا ہے جسے اپنی ہی کولیگ کو سنانے کا بہت دل کیا ہو اور سنایا بھی ہو۔

اگست کا شعاع اپنے دامن میں دلچسپی کا سامان لیے حاضر تھا سرورق اگست کی مناسبت سے اچھا تھا۔ گرین کلر میرا فیورٹ ہے۔ اوہو، بے چاری ماڈل جلدی میں تھی کہ بائیں ہاتھ کی شہادت والی انگلی کا نیل ہی اتر گیا چلو کوئی مسئلہ نہیں۔ بعد میں لگا لینا۔

سب سے پہلے پہلی شعاع پڑھی۔ حمد و نعت سے لطف اندوز ہوئی، پیارے نبی کی باتیں ہمیشہ ہی علم میں اضافہ کرتی ہیں۔

اقبال بانو اور سکندر سے ملاقات خوب رہی پڑھ کر مزہ آیا، جب تجھ سے ناتا جوڑا، ہس ن کی داستان سن کر دکھ بھی ہوا اور ڈر بھی لگا۔ اللہ تعالیٰ سب کو اچھا سسرال نصیب کرے۔ قدر کرنے والا آمین۔

پیاری شعاع۔ سمیرا حمید کی بہت ہی لازوال تحریر تھی، آپ نے حق ادا کر دیا شعاع کا۔ خوشبو ہوتے جائیں۔ سب نے بہت بہت اچھا لکھا لیکن عائشہ اکرام دو میٹھے لڈو۔ وہ کیا ہے بھئی آگے پڑھا تو پتہ چلا (اہم ہائی، ابود جانہ) پڑھ کر بہت ہنسی آئی ان دو لڈو کو میرا میٹھا بھرا پیار۔ خطوط کی محفل میں پہنچے تو خوب صورت اور دل موہ لینے والے تبصرے منتظر تھے سارے خطوط خلوص اور پیار سے لکھے گئے تھے اس لیے کسی کی تعریف یا تنقید نہیں کروں گی۔

ایک خط، نیلوفر جاوید نے بہت ہی پیارے انداز میں خراج تحسین پیش کیا۔ پڑھ کر اچھا لگا۔ والعصر، نور القلوب، عسر یسرا قسط وار کہانیاں اچھی طرح آگے بڑھ رہی ہیں بہت ہی خوب صورتی کے ساتھ اب بات ہو جائے ہو کے مجبور آسیہ خان معذرت کے ساتھ موضوع بہت پرانا تھا۔ اکیلی دادی پوتی سالوں بعد آنے والا منگیتر جو دس سال اس کے آنے کا انتظار کرتی ہے آخر کار وہ مل ہی جاتا ہے اس طرح کی اسٹوری بہت پڑھیں کچھ اور نیا لکھیں۔

آپی ساجدہ حبیب سے کچھ لکھوائیں آرمی کا ہیرو

ہو، کچھ نیا تا یک ہو مجھے آری والے بہت پسند ہیں پلیز ساجدہ جی کچھ لکھیں نا آری کے بارے میں، جاوید اختر کی نظم دل کو بہت اچھی لگی۔ انیلا وہاڑی کا شعر بہت پسند آیا۔ سمیرا حمید کے کیا ہی کہنے زبردست۔ ان کی تحریر کی جادوگری اپنا اثر کر گئی محبت کی تسبیح میں دو دانے ہوتے ہیں جب تیسرا شامل ہو تو تسبیح ٹوٹ جاتی ہے واقعی محبت میں شراکت برداشت نہیں ہوتی لیکن عیسیٰ کے مرنے پر دکھ ہوا عیسیٰ کا کردار مجھے اچھا لگا۔ شوخ سا اپنی دنیا میں جینے والا لیکن گہرائی تک سوچنے والا۔ صوفی پہ بہت غصہ آیا سمیرا جی کیا آپ کو برف سر، دھن، گلنار بہت پسند ہے کیا؟ آپ کی تحریروں میں اکثر یہی ہوتا ہے۔ نکمی حنا بشریٰ کشف نام میرا فیورٹ ہے لیکن میں کشف کی طرح نکمی نہیں ہوں، البتہ مونا جیسی ضرور ہوں۔ ویسے ایک بات تو ہے کہ لڑکیاں چاہے نکمی ہوں یا نہ ہوں، سسرال بلا ہی ایسی ہے کہ طعنہ ضرور دیتی ماں نے سکھایا ہی کیا ہے۔ ماں بیچاری بھی کیا بہر حال کشف کے نکمے پن نے بہت ہنسایا۔

اب بات ہو جائے افسانوں کی سب اپنی مثال آپ تھے۔ رنگ خوشبو کے، واقعی حسن سارا نظر کا ہوتا ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو صرف خوب صورت لوگ ہی دنیا میں بستے، باقیوں کا اللہ ہی حافظ ہوتا فرزانہ جی کی کہانی بھی ایک اچھی کاوش تھی، برائی کو احسن طریقے سے دور کریں، زویا کے صبر اور اخلاق نے سب کچھ ٹھیک کر دیا۔ ہاجرہ ریحان کا افسانہ دل کو چھو گیا بس کچھ کمی سی محسوس ہوئی۔ صائمہ نور نظیر فاطمہ، عائشہ بشیر نے بہت ہی خوب صورت افسانے لکھے۔

تاریخ کے جھروکے میں ایک بار پھر معلومات میں اضافہ کر گیا اور آل آگست کا شمارہ بہت پسند آیا۔ آنٹی ریحانہ وقاص آپ کو ایک اطلاع دینا بہت ضروری ہے۔ میری آپی ملتان میں رہتی ہیں اس بار چھٹیوں میں ملنے آئیں تو بہنوئی اور بہن نے فرمائش کی "آم کھلاؤ بلکہ پیٹیاں لے کر رکھو ہم بھی کم نہیں فوراً بولا آموں کے شہر سے آئے ہو آم لے کر آتے یا کھانے آئے ہو" تو کہنے لگے ہم لے کر ہی آتے مگر آموں کے کئی مربع باغ ایک ادارے نے کاٹ دیے، ملتان میں آموں کی بہت قلت ہے۔ نہ ہونے کے برابر، اگر ہے تو ذائقہ اچھا نہیں، ریحانہ آنٹی میکے ضرور جائیں مگر آم نہیں ملیں گے۔ ریحانہ آنٹی جب آپ میکے جائیں مجھے ضرور بتایئے گا میں نے ملنا ہے آپ سے زینب نور، انصاری بہنوں آپ ملتان کی ہیں جب آپی کے پاس آؤں آپ سے ملنے آؤں گی کہاں رہتی ہیں آپ لوگ۔

پیاری عمارہ! ملتان کے چونسہ کا کوئی مقابلہ ہی نہیں ہے آم کے 90 ہزار درخت کاٹ دیے گئے ہیں یہی وجہ ہے کہ چونسہ آم اس سال بہت کم آیا ہے۔

آپ کراچی آئیں تو ہم سے ضرور ملیں ہمیں آپ سے مل کر خوشی ہو گی۔ ہماری سب ہی قارئین بہت اچھے خط لکھتی ہیں۔ کچھ قارئین جن کے خط طوالت کی وجہ سے ہم شائع نہیں کر سکتے۔ وہ ہم اپنی ساتھیوں کو ضرور سناتے ہیں یا ان کو خط تھما کر کہتے ہیں کہ یہ خط ضرور پڑھیں۔

سونیا ربانی قاضیاں محلہ بالا سے لکھتی ہیں

بارشوں کی وجہ سے شعاع کچھ "دیر سے ملا مگر خود کو پا کر بہت اچھا لگا۔ یقین کریں آٹھ برسوں میں پہلی بار یوں اندر کی باتیں شیئر کی ہیں اور سچ میں جب تجھ سے ناتا جوڑا لاجواب سلسلہ ہے۔ پیارے نبی کی باتیں، پڑھ کر دلی سکون ملا کہ چلو دوست تو دین دار ہیں اور اچھے لوگوں کی محبت ہے دل میں۔

سروے بھی کمال کا رہا۔ سلمیٰ مسرت تو آغاز سے پڑھ رہی ہیں۔ جان کر بہت اچھا لگا۔ کاش کسی طرح سے پرانے شمارے مل سکے تو ہم کو بھی وہ نایاب ناول پڑھنے کو مل جائیں جن کا اتنا ذکر ہوتا ہے مگر بارشوں اور سیلاب کی وجہ سے پرانا ریکارڈ مشکل سے ملتا ہے۔ میں بھی امی کو کہانیاں پڑھ کر سنایا کرتی تھی شادی سے پہلے۔

اقبال بانو صاحبہ سے ملاقات اچھی رہی ٹی وی اداکاروں میں دلچسپی نہ ہونے کے برابر ہے۔ ایک ڈی



ہے ہوا کرتے تھے طاہر عباس، مظفر آباد 8-105 پہ کاش وہ کہیں سے مل جائیں شاہین رشید کو۔ مکمل ناول، ہو کے مجبور، آسیہ رئیس خان، بہت خوب صورت ناول تھا۔ سچ بھی کبھار ہم کسی کی مجبوری کو سمجھ نہیں پاتے۔ تب تک خود کا واسطہ نہ پڑے۔ جیسے اسد خان کو ان دادی پوتی کے گھر رہ کر احساس ہوا کہ عورت سچ میں مجبور کر دی جاتی ہے۔ کہانیاں اچھی تھیں واعصر، کہانی کا پچھلا خلاصہ بھی دیا کریں ٹھیک ہے۔ تاکہ کہانی کی سمجھ آ سکے۔ حسنہ حسین عمر یسرا، پڑھ لیا۔ پچھلا خلاصہ نہ ہونے کے باوجود کچھ نہ کچھ سمجھ میں آ گیا۔ ناولٹ میں حنا بشریٰ کا نکمی، حقیقت کے بالکل قریب کہانی تھی۔ باپ اور بھائی مل کر بیٹی کو نکمی بنا دیتے ہیں۔ اور آگے سسرال جا کر بڑی مشکل ہوتی ہے۔ آپ کو کچن کی ملکہ کا درجہ بھی مل جائے تب بھی ساتھ بتایا جاتا ہے کہ یہ سب یہاں آ کر سیکھا ہے، اس کو تو چائے بنانا بھی نہ آتی تھی۔ تو بہتر ہے کہ ماں سے سیکھ لیا جائے۔

سمیرا حمید، ایک تھی محبت، محبت پہ لکھی لازوال کہانی تھی۔

سمیرا جی اسی طرح لکھتی رہیے۔

افسانوں میں ذکر ہو جائے پہلے، عزت کی روٹی، چھوٹی کہانی مگر بڑی بات، سچ میں اپنا گھر اور اپنے گھر کے آلو بھی گوشت برابر ہوتے ہیں۔ نقصان، ہاجرہ ریحان کا افسانہ بھی اچھا تھا کہ عورت کے لیے پرسکون زندگی کے لیے یہی ضروری ہوتا ہے کہ ماضی پر پردہ پڑا رہے۔ سعادت مند، نظیر فاطمہ کا افسانہ بھی لاجواب تھا۔ فرزانہ کا کہانی بھی اچھا تھا صائمہ نور کا کیسے تو جناب حقیقت میں ایسے ہی ہوتا ہے۔

مستقل سلسلے میں جاوید اختر کی دشواری میری فیورٹ رہی ہے ہمیشہ، باتوں سے خوشبو آئے۔ میں نادیہ خان اور طوبیٰ کا انتخاب اچھا تھا۔ اشعار میں انیلا کا انتخاب اچھا تھا۔ تاریخ پڑھ کر تاریخ کے بارے میں بہت کچھ پتا چلتا ہے۔

خط آپ کے۔ میں سب سے پہلے اس انمول، نایاب اور خاص خط کا ذکر جو نیلوفر جاوید نے اتنے پیار اور چاہت سے شعاع کے نام لکھا۔ ہم ابتدائی دور کے لکھنے والوں کو نہ پڑھ سکے مگر نیلوفر جی عمیرہ احمد، عفت سحر، آمنہ ریاض، راحت جبیں اور نمرہ احمد کو بہت پڑھا ہے۔ اور یقین کریں نمرہ کا قراقرم کا تاج محل تو دل میں بسا ہے۔ بہت شکریہ نیلوفر جی! اتنا پیارا خط لکھنے پر بہت کچھ یاد کروا دیا آپ نے پیاری گلشن آپ کی دعاؤں کا بہت شکریہ، پرانے نام غائب ہیں۔ فوزیہ ثمر بٹ گجرات، ماریہ سندھو، زاہدہ چوہدری، جہلم، کنزہ نقوی، نمرہ اور اقرا سب زندگی کی بھیڑ میں کھو گئیں۔ مگر شعاع کی طرف سے میں دعوت دیتی ہوں سب کو۔

پیاری سونیا! آپ کا خط پڑھ کر بہت خوشی ہوئی کیونکہ پچھلے خط کے مقابلے میں اس خط میں آپ کی ذہنی کیفیت بہت بہتر نظر آئی۔ اللہ آپ کو صحت مند اور

خوش باش رکھے۔ آمین۔ آپ کے دونوں افسانے مل گئے ہیں۔ افسانہ فیصلہ قابل اشاعت ہے۔ جلد شامل ہوگا۔ ان شاءاللہ

زرینہ خانم لغاری نے مظفر گڑھ سے شرکت کی ہے لکھتی ہیں

شمارہ ملا، پیارے نبی کی پیاری باتیں توجہ سے پڑھیں۔ ناتا جوڑا ہے ہر بہن کا اپنا حصہ ہوتا ہے ہر سسرال تقریباً ظالم ہوتا ہے دوسرے کی بچی کو لے کر زور آور ہو جاتا ہے، بچیاں بچاری بھی شرافت سے گزارا کرتی رہتی ہیں۔ نورالقلوب میں اگر گلے ماں بننے جارہی ہے تو اس میں اتنا چھپانے اور شرمندہ ہونے کی کیا بات ہے۔ یہ تو خوشی کی خبر ہے۔ خوش الحان اب لاریب سے خوش گوار تعلق بنانا چاہتا ہے لیکن پہلے لاریب کا علاج تو کروائے نفسیاتی مریضہ بن چکی ہے۔ والعصر بھی کامیابی کے جھنڈے گاڑ رہا ہے۔ عسر یسرا اف توبہ بچارے فارس پر کتنے مظالم ڈھائے جارہے ہیں وہ سگا دادا اتنی نفرت کرتا ہے اس بچے کا قصور یہی کہ وہ ایک اداکارہ کا بیٹا ہے۔ باتوں سے خوشبو آئے خوب صورت سلسلہ ہے۔

خوب صورت بلیے۔ بھئی ہم نے اب اس عمر میں خوب صورت بن کے کیا کرنا ہے ہاں بچیاں بالیاں بنیں خوب صورت، ابھی پچھلا شمارہ زیر مطالعہ تھا کہ اگست کا آپہنچا۔ مصنفہ اقبال بانو سے ملاقات کی۔ انہوں نے بتایا میرا بیٹا انیس سال کا ہے پگڑی اور ننھی سی داڑھی والا بچہ تو واقعی انیس سال کا لگ رہا تھا۔ سکندر نواز کی تصویر پسند نہیں آئی خطوں پر نظر دوڑائی۔ نورالقلوب پڑھا اف صندل صاحبہ کا تو تمام ملمع اتر گیا اللہ والی ہو کر اتنی بدزبان گو کہ بچی سے غلطی ہوئی ہے اسے پیار سے سمجھایا سکتا ہے۔ صبر و تحمل اللہ والوں کا وتیرہ ہوتا ہے اچھا ہے شاہدہ تائی نے بھی خوب سنائیں دل خوش کر دیا۔

لاریب بی بی پھر اپنے ساتھ کچھ برا کرنے لگی ہیں کہانی نقصان پسند نہیں آئی۔ ”سعادت مند“ واقعی دور کے ڈھول سہانے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ امریکا میں عورت بہت ذلیل ہو رہی ہے ہم پاکستانی خواتین خوش قسمت ہیں گھر میں رانیاں بن کر بیٹھی ہوئی ہیں خاوند بھائی، باپ سب ذمہ داریاں اٹھا رہے گھر میں نوکرانیاں کام کرتی ہیں۔

کہانی میں ایک سمجھ دار خاتون نے کس طرح گھر بچایا، ایسی بھی کہانیاں سبق دیتی ہیں ایسا وقت آجائے تو صبر اور حوصلے سے کام لو، خواہ مخواہ کا چیخنا اور واویلا کرنا مناسب نہیں ہوتا۔ ”عزت کی روٹی“ اف کیسا زمانہ آیا ہے ایک بیٹی اپنے ماں باپ کے گھر عزت سے روٹی نہیں کھا سکتی۔ بھابیوں کو سوچنا چاہیے وہ بھی تو کسی گھر کی بیٹیاں ہیں ان کو بھی بدلے میں ایسا سلوک ملے گا۔

عسر یسرا فارس غریب پہلے ہی دکھوں کا مارا تھا اب عدینہ صاحبہ انہیں مزید غموں کے سمندر میں دھکیل گئی ہیں۔ والعصر چلیں جی بی زی کی رقیب روسیاہ کا قصہ ہی ختم کر دیا گیا اب محترمہ بی زی کھل کھیلیں۔ رنگ خوشیوں کے سب سے زیادہ پسند آیا۔ مزے دار کہانی تھی۔ سہیلیوں کی نوک جھونک سے مزہ آیا۔

پیاری زرینہ! بہت اچھا تبصرہ کیا ہے آپ نے تعریف ہو یا تنقید اگر مدلل ہو تو پڑھ کر مزہ آتا ہے۔ تعریف سے دل بڑھ جاتا ہے۔ جبکہ تنقید سے مزید بہتر بنانے کی تحریک ملتی ہے۔ درحقیقت آپ جیسی قارئین ہمارا سرمایہ ہیں۔ انسان کو ہر عمر میں خوب صورت لگنا چاہیے۔ عمر کے ہر حصہ کا اپنا حسن ہوتا ہے۔ بچپن کی معصومیت، جوانی کی شوخی اور بڑھاپے کا وقار حسن ہی ہوتا ہے۔

پاکستان میں بھی سب عورتیں گھر نہیں بیٹھیں نہ ہی مرد ساری ذمہ داریاں اٹھا رہے ہیں، دیہاتوں میں نوے فیصد عورتیں مردوں کے ساتھ کھیتوں میں کام کرتی ہیں۔ شہروں میں گھروں میں کام کرنے والی ماسیاں عورتیں ہی ہیں جنہیں بہت زیادہ محنت کرنے کے بعد نہایت قلیل معاوضہ ملتا ہے۔ جبکہ ترقی یافتہ ممالک میں محنت کرتے ہیں تو اس کا معاوضہ بھی بہت اچھا ملتا ہے۔

آمتُ العزیز شہزاد

وریٰ اپنی نانی اور ماموؤں کے ساتھ رہتی ہے، اس کی ماں مر چکی ہے۔ گھر میں دو ماموں، ممانی اور ان کے بچے ہیں۔ ان میں آپس میں اچھے تعلقات ہیں مگر بڑی ممانی اسے پسند نہیں کرتی ہیں۔ عباد ان کا بیٹا ہے۔

آتش جو سراپا اسرار ہے، وہ لوگوں کو اپنی گفتگو سے زیر کرتا ہے۔ اس کے بے شمار عقیدت مند ہیں۔

بی زیڈ ایک بے ہوش لڑکی کو لے کر آتش کے ہاں پہنچ جاتی ہے۔ آتش اپنے اسسٹنٹ خاقان کے ذریعے ڈاکٹر کو بلاتا ہے۔ نانی وریٰ کو پڑھانے کی ذمہ داری عباد پر ڈال دیتی ہیں۔

لڑکی ہوش میں آتی ہے لیکن حواسوں میں نہیں۔ اپنا نام تک نہیں بتا سکتی۔ آتش کے گھر پولیس آ جاتی ہے۔

پولیس کا نام سن کر بی زی گھبرا جاتی ہے۔ آتش اسے پرسکون رہنے کا کہتا ہے۔ پولیس انسپکٹر امیر علی اپنے جونیئر فاروق احمد کے ساتھ آتے ہیں۔ وہ آتش کو تربیتی ورکشاپ میں مدعو کرتا ہے۔ فاروق احمد تھوڑا تلخ ہے۔

عباد، وریٰ کو پڑھانے بیٹھتے ہیں، وریٰ بتاتی ہے کہ وہ کمبائن امتحان دے رہی ہے، جسے ہر سبجیکٹ انتہائی مشکل لگتا ہے۔

فیروزہ کی بیٹی شونا کی شادی ہوتی ہے، اس میں بالی کا بھی نکاح کر دیا جاتا ہے، بالی انتہائی کم عمر ہے۔

شاکر فیروزہ کا بڑا بیٹا اپنے باپ کے حکم پر گھر تعمیر کروا رہے ہیں۔ ان کے والد بنگلہ دیش میں کاروبار کے سلسلے میں رہتے ہیں۔

فیروزہ کا چھوٹا بیٹا عامر بہت خودسر ہے۔ وہ عیسیٰ سے بہت چڑتا ہے۔ وہ ماں سے پیسے مانگتا ہے۔ انکار پر عیسیٰ کو بالکونی سے الٹا لٹکا دیتا ہے۔

وری کو سہراب سے ملنے کی خوشی اور گھبراہٹ ہوئی ہے۔ عیسیٰ سمجھتا ہے کہ وہ امتحانات کی وجہ سے پریشان ہے۔
بی زی کو آتش فون کرکے اطلاع دیتا ہے کہ وہ ٹی وی آن کرکے دیکھے علائنہ سے متعلق خبر آرہی ہے۔ پتا چلتا ہے کہ علائنہ کی لاش اس کے فلیٹ سے برآمد ہوئی ہے۔
وری پیپر دینے خوب تیار ہوکر جاتی ہے اسے مفتاح چھوڑنے جاتا ہے، واثلہ کو یہ بات پسند نہیں آتی۔
اپنا عامر سے کہتی ہے کہ عیسیٰ سے کہو کہ ایڈمیشن ٹیسٹ میں اس کے بھائی کو پاس کروادے۔
سید صاحب کو جب سے عامر نے عیسیٰ کے متعلق بتایا تھا کہ وہ سگریٹ نوشی کرنے لگا ہے سید صاحب بہت پریشان تھے۔ وہ فیروزہ بیگم کو واپس پاکستان بھیجنے کی بات کرتے ہیں۔
وری جلدی سے پیپر ختم کرکے سہراب کے ساتھ اس کی گاڑی میں بیٹھ کر چلی جاتی ہے۔
آتش چند روز کے لیے اسلام آباد جاتا ہے۔ خاقان دوسرے کاموں میں مصروف ہوتا ہے خولہ کو موقع مل جاتا ہے کہ وہ فون کرلے وہ فون کرلی دوسری طرف فون اٹھالیا جاتا ہے۔ وہ جواب نہیں دے پاتی۔ دوبارہ نمبر ملاتی ہے اس وقت کوئی اسے آواز دیتا ہے۔

## بارہویں قسط

ابن سلیمان!
اے شاکیِ تقدیر۔
اور تم نے کیا جانا کہ تقدیر کیا ہے؟
یقیناً ایسا رستہ۔
جو دفعتاً، قابل نگاہ آتا ہے تمہارے۔
اور تم نہیں پاتے اس پر چلنے میں کوئی بھلائی۔
ایک پُرخار، دشوار گزار اور تنگ سی رہ گزر۔
جو لا بچھاتا ہے کاتب تقدیر قدموں تلے تمہارے
اور چاہ کر بھی تم اسے تبدیل نہیں کرپاتے۔
سو روئے جاتے ہو اس پر۔
یہ جانے، سوچے، سمجھے بغیر۔
کہ اس سے زیادہ مشکل رستہ کسی اور کے حصے میں آیا ہوگا۔
جو یقیناً تمہارے لیے نہیں ہے!

☆☆☆

"چہرہ بتا رہا ہے کہ پیپر بہت اچھا ہوگیا آپ کا؟"
سہراب نے دو گھنٹے بعد اسے واپس کالج کے نزدیک ہی اتار دیا تھا۔ جہاں سے وہ پہلی پہلی ملاقات کے نشے میں دھت گویا دھنک رنگ راہ گزر پر قدم دھرتی کالج کے صدر دروازے تک آئی۔ چھٹی کے وقت مفتاح اسے لینے پہنچ گیا تھا سو وہ اس کے ساتھ گھر واپس تو آ گئی مگر گویا ذہن و دل وہیں، اس جان لیوا کے پاس ہی کہیں چھوڑ آئی تھی۔
چنانچہ سارا دن اسی خمار میں رہی اور اس وقت بھی عیسیٰ نے جب اس سے ازراہ تفنن متعلقہ سوال پوچھا تو۔
"پیپر؟" اس نے سامنے بیٹھے عیسیٰ کی جانب سر اٹھا کر یوں دیکھا گویا اس نے سوال اردو میں نہیں بلکہ کسی



نا قابل فہم زبان میں پوچھا ہو۔
"جی پیپر، آپ کا پیپر تھا نا آج......" اس نے زیر لب مسکراتے ہوئے گویا اس "پڑھائی چور" کو یاددہانی کروائی۔
"اوہ ہاں پیپر......" وہ چونک کر خجالت سے بولی۔
"وہ تو بہت اچھا ہوگیا تھا سر!......"
"ویری گڈ......" اسے جان کر حقیقتاً اچھا لگا کہ ظاہر ہے محنت کی تھی اس پر۔ "ذرا کوئسچن پیپر دکھائیے؟" اس نے ہاتھ آگے بڑھاتے وری کو اگلی مشکل میں ڈالتے ہوئے کہا۔
"کیوں سر؟" وہ پتا نہیں کیوں گھبرا گئی۔
"میں دیکھنا چاہتا ہوں اس لیے۔" وہ اس کے چہرے پر در آئی گھبراہٹ کو حیرت سے دیکھ کر بولا۔
"یہ لیجیے......" وہ بیگ میں یوں ہی بہ عجلت گھسیڑا گیا سوال نامہ بادل نخواستہ بیگ سے برآمد کرتے ہوئے بولی۔ "پر مجھ سے کوئی سوال مت کیجیے گا سر!"
"وہ کیوں بھئی؟" پرشکن سوال نامہ کی لکیریں ہاتھوں سے دور کرتے ہوئے عیسیٰ نے تعجب سے پوچھا۔
"کیونکہ جو لکھنا تھا بس میں نے لکھ دیا......" وہ منہ بنا کر بولی۔ "اب کچھ بھی ذہن میں نہیں......"
"شاباش......!" بہت لطف آیا تھا عیسیٰ کو یہ سادگی بھرا سچا مچا جواب سن کر۔ تب ہی مسکرا کر اسے شاباشی سے نوازتے ہوئے بولا۔ "اسی طرح پڑھتی رہیں تو بہت آگے جائیں گی آپ۔"
"تھینک یو سر......" وہ اس کے جملے کی گہرائی میں اترے بغیر اپنی جان خلاصی کے خیال سے مطمئن ہوکر ممنون لہجے میں بولی۔
"خیر......خیر۔" اس نے سوال نامے پر ایک طائرانہ نگاہ ڈال کر اسے تہہ کرکے میز پر دھرتے ہوئے اس بار سنجیدگی سے سوال کیا تھا۔
"اب اگلا پیپر کب ہے آپ کا؟"
"پرسوں......" یہ تو اسے اچھی طرح یاد تھا۔ ہاں وہ یہ کیسے بھول سکتی تھی۔ دوسرا پرچہ یعنی دوسری ملاقات۔
"کس چیز کا ہے۔"
"شاید اسلامیات کا؟" وہ کچھ گڑبڑا کر بولی۔
"شاید؟" عیسیٰ نے سخت نگاہوں سے اسے گھورا۔
"دیکھتی ہوں......" وہ اس کی نگاہ سے مترشح تنبیہ تا دیکھ کر جلدی سے ٹائم ٹیبل فولڈر سے برآمد کرکے بولی۔
"اوہ، یہ تو انگلش کا ہے۔" اس بار وری نے ٹائم ٹیبل دیکھ کر بتایا۔
"اور اس میں آپ کافی ماشاءاللہ ہیں۔" عیسیٰ نے خالص اساتذہ والے لہجے میں میٹھی میٹھی سی عزت افزائی کرتے ہوئے کہا۔
"سو فوراً سے پیشتر نکالیے کتابیں۔"

☆☆☆

"اے لڑکی! یہ کسے فون کررہی ہو؟" خاقان، ریسیور اس کے ہاتھ میں دیکھ کر بھوکے شیر کی مانند اس کی جانب لپکا تھا۔
"ک......کسی کو نہیں۔" وہ جو اندر ہی اندر سوکھے پتے کی مانند کانپ گئی تھی۔ اپنی آواز کی لرزش پر قابو پانے کی سعی کرتے ہوئے بولی۔
"تو پھر یہ ریسیور ہاتھ میں کیوں پکڑ رکھا ہے۔" وہ اس کے نزدیک پہنچ کر درشتی سے بولا۔

سے گزری بھی مستزاد خاقان کا سفاک تفتیشی انداز۔
"ما... صفائی کر رہی تھی۔" سر دست وہ ایک جذباتی لمحے
وہ حوصلہ کرتے کرتے بھی بے اختیار ہچکیوں سے رو پڑی۔
"اب مکاری سے آنسو بہا رہی ہو۔" وہ اسے بے تحاشا روتے دیکھ کر قدرے نرم پڑ گیا کہ ملازموں سے
حد درجہ سختی سے پیش آنا آتش کدے میں ممنوع تھا۔ "میں نے خود تمہیں ریسیور پکڑے ہیلو... ہیلو کرتے دیکھا ہے۔"
اب وہ اس پر کیا کہتی، فی الوقت سلامتی مزید کوئی بہانا نہ کرنے ہی میں مضمر تھی سو وہ بنا کچھ کہے بس نیر
بہانے گئی۔
"آتش کدے کے باہر مصروف ہوں تو یہ مت سمجھنا کہ مر گیا ہوں۔ تم سب پر نظر ہے میری۔" خاقان کی
اونچی آوازیں سن کر سارے ہی نوکر ماجرا جاننے کی خاطر یہاں جمع ہو گئے تھے، سو لگے ہاتھوں خاقان نے سب کو
تاڑنا ضروری سمجھا۔
"چلو، اب جاؤ سب یہاں سے۔ جا کر اپنا کام کرو۔ اور لڑکی تم۔" وہ دیگر سے خطاب کرنے کے بعد
دوبارہ اس کی جانب متوجہ ہو کر تنبیہاً بولا۔
"مراد آتش کو آنے دو... تمہارا فیصلہ تو اب وہی کریں گے۔ اب چلو جاؤ یہاں سے۔ آئندہ مجھے فون کے
آس پاس بھی پھٹکتی نظر مت آنا۔"

☆☆☆

"بات سنو، پیپرز ہو گئے تمہارے؟"
جہاں کبھی راحت و طمانیت کے نغمے ہمہ وقت گونجا کرتے تھے، آج وہیں اداسی کی دھن پر وحشت
رقصاں تھی مگر وہ پھر بھی... تب بیٹھا رہا کہ برسوں پہلے کے ایک منظر میں کھو چکا تھا۔
وہ لاؤنج میں بیٹھا سونی کے ٹی وی پر "نیلام گھر" دیکھ رہا تھا کہ تب ہی عامر چلا آیا اور اس کے ساتھ والے
صوفے پر نیم دراز ہو کر... ایسے دوستانہ لہجے میں مخاطب ہوا گویا درمیان میں کوئی تلخی آئی ہی نہ ہو۔
"جی..." وہ اگر وہ تلخی بھول چکا تھا تو کیا۔ عیسیٰ کو تو سب یاد تھا... اور اپنی تذلیل با آسانی کوئی فراموش
کر بھی کیسے سکتا ہے، سو وہ نظریں اسکرین پر جمائے ہوئے سپاٹ لہجے میں جواباً بولا تھا۔
"رزلٹ آ گیا؟" انگڑائی لیتے ہوئے اگلا سوال کیا گیا۔
"ابھی نہیں۔"
"کب تک آئے گا؟" اس نے غیر ضروری دل چسپی لیتے ہوئے استفسار کیا۔
"اس ماہ کے آخر تک متوقع ہے۔"
"ہوں۔" بالوں میں انگلیاں چلا کر پر سوچ ہنکارا بھرتے ہوئے اگلا سوال حاضر تھا۔ "نئے داخلے کب
ہوں گے۔"
وہ یقیناً اپنے مطلب کی بات پر آنے کے لیے تمہید باندھ رہا تھا۔
"ہو رہے ہوں گے۔" وہ مشینی انداز سے جواب دیتا گیا۔
"اچھا۔" وہ زور و شور سے سر ہلاتا، ایک دم چوکنا ہو بیٹھا۔ "ایک چھوٹا سا کام ہے تم سے۔"
"جی کہیے۔" اس بات پر عیسیٰ چونک اٹھا تھا۔
"تمہارے اسکول میں ایک لڑکے کا ایڈمیشن کروانا ہے آٹھویں میں۔ اس کے لیے تمہاری تھوڑی سی مدد چاہیے۔"
"کیسی مدد۔" اس نے بات ہی ایسی غیر متوقع کر دی تھی کہ عیسیٰ نے بے اختیار گردن موڑ کر اس کی
جانب دیکھا۔



"کیا پڑھانا ہے اس کو...؟" اس کی دانست میں یہی وہ "مدد" تھی جو کہ وہ کر سکتا تھا۔
"پہلے خود تو پڑھ لو..." وہ تمسخر سے بولا۔
"پھر اور کیا مدد کر سکتا ہوں میں اس کی؟" وہ سمجھ نہیں پایا۔
"ایڈمیشن ٹیسٹ کلیئر کروا سکتے ہو اس کو..." وہ بولا۔
"اور یہ میں کیسے کروں گا؟" اس نے ہونق پن سے پوچھا۔
"اسکول میں تمہاری کوئی سیٹنگ نہیں۔" وہ بلا جھجک کہہ گیا۔
"کیسی سیٹنگ؟"
"یار..." عامر کو اندازہ نہیں تھا کہ اس کا چھوٹا بھائی اس درجہ احمق ہو گا۔ تب ہی کچھ بے مزہ سا ہو کر بولا۔
"میرا مطلب ہے کہ نقل وقل کی..."
"میں نقل نہیں کرتا..." وہ سنجیدگی سے بولا۔
"ہاں، ہاں جانتا ہوں۔" وہ جلدی سے بولا۔ "میں تو تمہارے دوستوں کی بات کر رہا تھا۔"
"میرا کوئی بھی دوست ایسا نہیں..." وہ تیز ہو کر مدافعتی لہجے میں بولا۔
"تم تو بے وقوف ہو..." اب اسے غصہ آنا شروع ہو گیا تھا۔ "تمہیں کیا پتا..."
"جب مجھے کچھ پتا ہی نہیں تو مجھ سے بات ہی کیوں کر رہے ہیں۔" وہ دوبارہ طارق عزیز کی جانب متوجہ
ہوتا، عجیب سے لہجے میں بولا۔
"کیوں کہ میں چاہتا ہوں کہ نیکی کے اس کام میں تم بھی حصے دار بن جاؤ..." مطلب برآری کے لیے
اس نے نیکی و بدی کا تصور چٹکی بجاتے بدل دیا تھا کہ ظاہر ہے یہ اس کے دائیں ہاتھ کا کام تھا۔
"نقل کروانا نیکی کا کام کب سے ہو گیا؟" وہ سنجیدہ رہنا چاہتا تھا، پھر بھی اسے اس بات پر ہنسی آ گئی۔
"یار دراصل وہ بے چارہ ایک حادثے کی وجہ سے پڑھائی میں پیچھے رہ گیا ہے۔" وہ لہجے میں زمانے بھر کی
ہمدردی سمو کر بولا۔ "سال ضائع ہو جائے گا بے چارے کا..."
"ہے کون؟"
"میرے دوست کا چھوٹا بھائی ہے۔" وہ لوہا گرم کرنے کے بعد زوردار ضرب لگاتا ہوا چالاکی سے بولا۔
"اگر یہ کام ہو جائے تو دعائیں ہی ملیں گی۔"
"دیکھتا ہوں اگر کچھ ہو سکے تو..." سید صاحب اور فیروزہ سے پتا نہیں اور کچھ ورثے میں اسے ملنا تھا یا
نہیں، البتہ خدمت خلق کا جذبہ اسے وافر مقدار میں ملا تھا۔
"ہوں... ہاں کوشش کر کے دیکھو یار۔" وہ اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے بولا۔ "اور سنو پیسے ویسے
چاہیے ہوں تو بتا دیا کرو۔ بھائی ہوں تمہارا۔"

☆☆☆

"عنا بجو... آپ یورپ سے کتنی پیاری ہو کر آئی ہیں۔"
عنا گزشتہ ایک ماہ سے اپنے ہنی مون ٹرپ پر تھیں... واپسی ہوئی تو تھکن اتارنے کے لیے میکے قیام کی
غرض سے چلی آئیں۔ اور اس وقت لاؤنج میں براجمان، ان سب کے لیے خریدے گئے چھوٹے موٹے
تحائف انہیں تھماتے ہوئے وہاں کے قصے نکالے بیٹھی تھیں۔
لیاقت بیگم اب سے کچھ دیر قبل، مغرب کے تنگ ہوتے وقت کا خیال کر کے اپنے کمرے میں جا چکی تھیں۔
ان کو تحفے میں ملنے والا گرم اونی سویٹر احتیاط سے ان کی الماری میں رکھنے کی غرض سے عارفہ بھی ان کے پیچھے

چلی گئی تھیں۔ باقی وہ سارے ابھی یہیں جے اسنیکس سے بھرپور انصاف کر رہے تھے۔ تب ہی عادت کے مطابق وری کو عینا کا حسین، جگمگاتا چہرہ دیکھ کر جو پہلا خیال آیا، وہ اس نے فی الفور بیان کر دیا جو ازحد ناگوار گزرا
اور جواباً شریفہ نے ناپسندیدگی سے اسے ٹوکا۔

''ماشاءاللہ...'' وہ تیوری پر ان گنت بل ڈال کر بولی تھیں۔ ''میری عینا پہلے ہی سے خاصی حسین ہے۔''

''اور کچھ پیسے کا کمال ہے۔'' مفتاح کی بے چین زبان میں ہونے والی خارش، شریفہ جواباً اسے بہت کچھ سنا سکتی تھیں مگر بس یہ ہی سوچ کر بے بسی سے دوسری جانب دیکھنے لگیں کہ کم بخت کی زبان کے آگے تو خندق تھی، جانے نا خلف دو بدو کیا کہہ ڈالے اور ان کا پہلے ہی سے اچھا خاصا جلا بھنا جی مزید بھسم کر ڈالے۔

''پیسہ ہی تو سب کچھ نہیں...'' باقی سارے تو ایک دوسرے کو ملنے والے تحائف پر تبصرے کرنے میں مگن تھے مگر رجا چوں کہ مفتاح ہی کی جانب متوجہ تھی سو بلا ارادہ گمبھیرتا سے کہہ اٹھی۔ ''ایسا حسن تو محبت کی دین ہوتا ہے۔''

''اوئے ہوئے...'' مفتاح کو یقیناً بہت مزہ دیا تھا اس جواب نے سو لہک کر بولا۔ ''تمہیں کیا محبت کے بارے میں کس نے بتا دیا...؟''

''کون بتائے گا؟'' وہ عینا کا دیا پرفیوم الٹ پلٹ کر دیکھتی ہوئی جیسے خود اپنا مذاق اڑاتے لہجے میں بولی۔

''اوہ...'' مفتاح شوخی سے بولا۔ ''یعنی تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ تمہاری جیسی شکلوں کو محبت کے بارے میں کون بتائے گا؟''

''میں چائے لے کر آتی ہوں...'' مفتاح نے تو یہ بات حسب عادت ہلکے پھلکے پیرائے میں از راہِ مذاق ہی کہی تھی پر نہ جانے کیوں اس سے رجا کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ سو وہ مزید کچھ کہے سنے بنا فوراً سے پیشتر وہاں سے اٹھ گئی۔

''ہیں...؟'' مفتاح منہ کھولے پہلے تو اس کے ردعمل پر چند ثانیے جی بھر کر حیران ہوتا رہا پھر یکا یک اس پر خجالت حملہ آور ہو گئی۔

''کیا ضرورت تھی مجھے یہ بکواس کرنے کی...'' وہ جی ہی جی میں خود کو ملامت کرنے لگا۔

''جبران کے ماموں کو کینسر ڈائیگنوز ہوا ہے۔'' عینا اب شریفہ کو اپنے چیدہ چیدہ سسرالی رشتے داروں کی خیریت کے بارے میں مطلع کر رہی تھیں۔ سو وہ سارے بور ہو کر ایک ایک کر کے وہاں سے اٹھ گئے اور مفتاح تو خیر پہلے ہی یہاں سے جا چکا تھا۔

☆☆☆

''آج بہت دنوں بعد تمہیں اپنے ہاں دیکھ کر مجھے بہت اچھا لگا۔''

وہ لاؤنج کے خستہ حال، ادھڑے بے رنگ صوفے پر بیٹھے بیٹھے ہی سو گیا تھا غالباً ابھی کوئی کان کے نزدیک میٹھی آواز میں بولا تو گھبرا کر اس کی آنکھ کھل گئی۔ بجلی بند ہونے کے سبب چہار اطراف گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ ایسی ہول ناک تاریکی کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دے۔ مگر ایسے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں بھی کچھ روشن تو تھا۔ ہاں باب ماضی کا ایک اور صفحہ کہ جسے پڑھنے کے لیے وہ دو آنکھیں کسی روشنی کی محتاج نہ تھیں۔

''میٹرک کی کلاسز شروع ہونے والی ہیں۔'' اپنے گھر کے ڈرائنگ روم میں اس کے بالمقابل براجمان عثمان خلوص دل سے اس سے مخاطب تھا۔ ''میں تو کہتا ہوں شام میں روز یہیں آ کر پڑھ لیا کرو۔''

جواباً اس نے دھیرے سے مسکرانے ہی پر اکتفا کیا۔

نہ جانے کیا بات تھی جواب وہ اس کے سامنے کچھ دن پہلے کی طرح کھل کر ہنس نہیں پاتا تھا۔

''تم شاید مذاق سمجھ رہے ہو...'' عثمان پھر بولا۔ ''مگر میں سنجیدہ ہوں یار...''



''چلو، دیکھتا ہوں۔'' وہ اس کے اصرار پر پُرسوچ سے لہجے میں بولا۔

''پر ابھی میں تمہارے پاس ایک کام سے آیا ہوں۔''

''ہاں... ہاں بولو۔''

''کیا کوئی ایسا شخص ہے ہمارے اسکول میں جو کسی کو نقل کروا سکے؟'' اس نے اپنی دانست میں بہت محتاط اور مناسب ترین الفاظ میں استفسار کیا تھا پر عثمان کے چہرے پر عجیب سے تاثرات ابھر آئے۔

''کیوں کیا ہو گیا، خیریت۔'' وہ تعجب سے بولا۔ ''تم کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''عامر بھائی کے دوست کے چھوٹے بھائی کا ایڈمیشن کروانا ہے اس لیے۔'' اس نے جلدی سے بتایا کہ وہ کہیں کچھ اور نہ سمجھ لے۔

''تو...؟''

''تو یہ کہ نقل کروانی ہے اس کو تا کہ وہ ایڈمیشن ٹیسٹ کلیئر کر سکے۔'' اس نے سادگی سے بتایا تو عثمان کا حقیقتاً دماغ گھوم گیا۔

''واہٹ ربش...'' وہ سخت ناپسندیدگی سے بولا۔ ''یہ سب تم سے عامر بھائی نے کہا؟''

''ہاں... کہا تو انہوں نے ہی ہے۔'' وہ کچھ کھسیا کر بولا۔

''انہیں اتنی غلط بات تم سے کرتے شرم نہیں آئی؟'' وہ واقعی حیرت زدہ تھا۔

''یار...'' وہ وضاحتی لہجے میں بولا۔ ''وہ لڑکا مشکل میں ہے۔ شاید اس لیے۔''

''کسی لیے بھی...'' وہ اس کی وضاحت کو سرے سے نہ تسلیم کرتے ہوئے بولا۔ ''مگر بات ان کی غلط ہے سو غلط ہے۔ تمہارا امیج بہت اچھا ہے اسکول میں، اسے کسی کے لیے بھی داغ دار کرنے کی تمہیں کوئی ضرورت نہیں، انہیں اگر اپنے دوست کی مدد کرنی ہی ہے تو تمہارا کندھا غلط طریقے سے استعمال کرنے کے بجائے انہیں چاہیے کہ سیدھے طریقے سے اسکول جا کر بات کریں۔ شاید اس طرح اس کا کام بن جائے۔''

بات عثمان کی بالکل درست تھی مگر عامر...

''تو اب میں جا کر ان سے کیا کہوں؟'' اس نے پریشانی سے پوچھا۔

''تم جا کر انہیں صاف صاف کہہ دو کہ تم ایسا نہیں کر سکتے اور کیا کہنا ہے۔'' عثمان کندھے اچکا کر بولا۔ ''اور یہ بیسن کا حلوہ لو... باجی بہت مزے کا بناتی ہیں۔''

☆☆☆

''کیا کہتی ہو؟ آج ہو جائے لوڈو کی ایک بازی؟''

پونم کی رات تھی... اور رجا اپنے مصنوعی روشنی سے بے نیاز، چاندنی میں نہائے ٹیرس پر ایستادہ اس سے ماہ تمام کے مبہوت کر دینے والے حسن سے زیادہ اس کی لازوال تنہائی پر غور کرنے میں منہمک تھی کہ تب ہی عقب سے بہت دن بعد ایک شناسا جملہ سنائی دیا۔

''کیوں...؟'' ایک پل کو اس کا دل بڑے زور سے دھڑکا مگر پھر اگلے ہی ثانیے اس نے اجنبیت بھرے لہجے میں استفسار کیا تھا۔ ''کیا آج وری نے ساتھ کھیلنے سے انکار کر دیا۔''

''میں نے اس سے پوچھا ہی کب؟'' وہ آہستگی سے اس کے برابر میں آ کھڑا ہوا تھا۔ رجا بے چین ہو گئی۔

''تو جا کر اب پوچھ لو...'' وہ زخمی سے لہجے میں بولی۔

''نہیں یار! رہنے دو اسے۔'' وہ قطعیت سے بولا۔ ''اس کے پیپرز ہو رہے ہیں۔''

''اوہ...'' اس کے تن بدن میں یہ جواب سن کر الاؤ سا دہک اٹھا۔

''وہ دستیاب نہیں اس لیے تمہیں میرا خیال آ گیا۔''
''خیال آنے کی کیا بات ہے؟'' وہ اس کی تلملاہٹ پر متحیر ہو کر بولا۔ ''ہم پہلے بھی تو ساتھ کھیلتے رہے ہیں۔''
''پہلے کی بات اور تھی۔''
''اور اب کیا ہو گیا۔'' وہ اسی کے لہجے میں ترنت بولا۔
''کچھ نہیں......'' کہنا وہ بہت کچھ چاہتی تھی مگر ضبط کر کے ایک بار پھر تنہا تنہا سے چاند کو دیکھنے لگی۔
''رجا! کیا بات ہے؟'' مفتاح چند ثانیے اس کی جانب الجھن زدہ، پریشان نگاہوں سے دیکھتے رہنے کے بعد بولا۔ ''میں کچھ دنوں سے محسوس کر رہا ہوں، تم کچھ بدلی بدلی سی دکھائی دیتی ہو۔ کوئی پریشانی ہے؟ اگر ہے تو تم بلا جھجک مجھ سے شیئر کر سکتی ہو۔'' اس کے لہجے میں بے پناہ خلوص کے علاوہ بھی کچھ تھا۔
''کیا شیئر کروں تم سے؟'' وہ سر جھٹک کر بولی۔
''جو بھی پریشانی ہے۔''
(پریشانی نہیں محبت، محبت ہے تم سے......اور تم۔)
کاش کہ من میں ابھرنے والی ہر بات کہہ دینا اتنا ہی سہل ہوتا جتنا کہ سوچنا۔
''کوئی پریشانی نہیں ہے۔'' وہ نروٹھے پن سے بولی۔ ''تم میرے بارے میں خوامخواہ فکر مند مت ہوا کرو۔''
''ناراض ہو گئی ہو کیا یار...... '' وہ دائیں کان کی لو کھجا کر بولا۔
''کس بات پر......؟'' وہ الٹا اسی سے پوچھنے لگی۔
''وہ جو شام میں، میں نے تمہاری شکل وصورت کے بارے......''
''ٹھیک ہی تو کہا تھا......'' رجا نے تیز لہجے میں اس کی بات درمیان ہی سے قطع کرتے ہوئے کہا۔ ''ہمارے جیسے چہروں سے محبت کون کرتا ہے۔''
''محبت چہرے دیکھ کر تو نہیں کی جاتی۔'' وہ متاسف لہجے میں اسے سمجھانے کی کوشش کرنے لگا۔
''مگر چہروں سے ہوتی تو ہے۔'' وہ زہر خند سا بولی۔ ''خاص کر دل کش، حسین، بے داغ چہروں سے۔''
''ضروری تو نہیں......'' وہ ماننے کو تیار ہی نہ ہو رہا تھا اور اسے منوا کر کرنا بھی کیا تھا۔ سو بے دلی سے چہرہ گھر کی اندرونی سمت موڑتے ہوئے بولی۔
''خیر......میں سونے جا رہی ہوں۔''
''یعنی تم میرے ساتھ لوڈو نہیں کھیلو گی۔''
''تم دری کے فارغ ہونے کا انتظار کرو۔'' وہ بے تاثر سے لہجے میں بولی۔ ''میں اتنی ارزاں نہیں کہ کسی کا متبادل بن جاؤں۔'' رجا اپنی کہہ کر آگے بڑھ گئی جب کہ وہ تا دیر اس کے کہے الفاظ کی بازگشت کے زیر اثر وہیں کھڑا رہا تھا۔

☆☆☆

''ہیلو......'' اس وقت وہ کسی بھی کام کی ہمت خود میں نہ پاتی تھی سو خرابی طبیعت کا بہانہ بنا کر اپنی پناہ گاہ میں چلی آئی۔
خیال تھا کہ کچھ دیر تنہا رہ کر اندر چھنا کے سے ٹوٹ جانے والی اس شے کی مرمت کرے گی کہ جسے دل کہتے ہیں مگر کہاں۔
دل کے ٹکڑے بھلا اتنی آسانی سے کب جوڑے جا سکتے ہیں۔
اور ابھی تو یہ حال تھا کہ ٹوٹنے والا ہر حصہ مزید کرچی کرچی ہوا جاتا تھا۔



''ہیلو......''
''کاش...... کاش کہ یہ آواز مجھے سنائی نہ دے۔''
اس نے اپنے ہاتھ سختی سے کانوں پر جما کر خواہش کی مگر بے سود۔
''ہیلو''
''میرے خدا، یہ میں نے کیا کر لیا اپنے ساتھ۔'' کوئی ناقابل بیان اذیت سی اذیت تھی۔
جس کی شدت سے دوہری ہو کر وہ زمین پر بیٹھتی چلی گئی۔
''ہیلو، کون بول رہا ہے۔''
ہاں مجھے بولنا تھا۔ بہت کچھ بتانا تھا...... کہنا تھا...... سننا تھا۔ مگر ہائے وہ لمحہ میرے ہاتھوں سے پھسل گیا۔
کھو گیا وہ میری خوش بختی کی طرح۔
شدت گریہ سے نڈھال ہو کر وہ ننگے فرش پر گٹھری بنی پڑی تھی۔
اور خوش امیدی کا وہ لمحہ۔
وہ واقعی اس سے چھوٹ گیا تھا۔

☆☆☆

''کیا نظر آ گیا جبران کی خالہ کو اس بے ڈھنگی وری میں جو رشتہ بھیجنے کو مری جا رہی ہیں۔''
تھکن اتارنے کا جواز اپنی جگہ مگر عینا کی آمد کا اصل مقصد یہ تھا جو وہ اپنے کمرے میں شریفہ کے روبرو بیٹھ کر ابھی سے کچھ دیر قبل بیان کر چکی تھیں اور جسے سنتے ہی شریفہ بھتّے سے اکھڑ گئی تھیں۔ ''ہاں نہیں تو، اوقات دیکھی تھی اس نے اپنی جوان کی شہزادیوں کی سی آن بان اور شان والی بیٹی کے سسرال میں بیاہی جاتی۔''
''اب یہ بات تو مت کریں مام۔'' بیڈ کراؤن سے پشت ٹکائی عینا اکتاہٹ سے والدہ ماجدہ کو ٹوکتی ہوئی بولیں۔ ''نظر تو ظاہر ہے سب سے پہلے اس کا بے تحاشا حسن ہی آتا ہے۔''
''ہاں اور ایسا آتا ہے کہ ساری عقل پر پتھر پڑ جاتے ہیں۔'' وہ بے بسی آمیز طیش سے بولیں۔ ''ارے تو تو بتاتی نا کہ یتیم ہے۔ ماموں کے در پر پڑی ہے بچپن سے۔''
''خیر، وہ یتیم تو نہیں۔'' عینا بولیں۔ ''والد موجود تو ہیں اس کے۔''
''ارے بتاؤ......'' وہ ہاتھ نچا کر بولیں۔ ''ایسی موجودگی بھلا کس کام کی بچپن سے جو ادھر چھوڑ کر گیا تو منحوس مارا کبھی ایک پیسے تک کا روادار نہ ہوا۔ ماں اس کی الگ نفسانی، خصم چھوڑ گیا تو اس کی بے وفائی پر خودکشی۔''
''ششش......'' عینا جو اطمینان سے بیٹھی ہوئی تھیں، شریفہ کی اس بات پر چونک کر آگے ہوئیں اور ان کے زہر اگلتے لبوں پر ایک دم دو انگلیاں رکھ دیں۔
''مام پلیز! ہر بات دہرانے والی تو نہیں ہوتی......آہستہ تو بولیں۔''
ظاہر ہے، ہر نئی نویلی بیاہتا کی مانند وہ اپنے خاندان کی نیک نامی کے حوالے سے بے پناہ حساس تھیں ان دنوں۔ ہاں جی دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں اور بھلائی تو پھر محتاط رہنے ہی میں پنہاں ہے۔ لیکن شریفہ آگے کیا کہنا چاہتی تھیں؟
دروازے کے دوسری جانب، اپنی کتابیں اٹھانے کی غرض سے آنے والی وری، جو دروازے پر دستک دینے کے بجائے اتنی دیر سے کھڑی اندر جاری گفتگو سن رہی تھی، اس ادھوری بات پر سراپا اضطرار بن گئی۔
''اور چھوڑ دیں اب یہ باتیں۔'' اندر سے ایک بار پھر عینا ہی کی سرزنش کرتی آواز ابھری۔ ''اور یہ بتائیں کہ میں اس رشتے کا کیا کروں۔ جبران کی خالہ بہت اصرار کر رہی ہیں۔ کیا میں اس رشتے کا دادی بیگم کو بتا

دوں؟"

"کوئی ضرورت نہیں۔" شریفہ قطعیت سے بولیں۔ "یوں تو ان کے ارادے کچھ اور ہیں مگر کیا پتا دولت کے جوانبار تمہاری خالہ ساس کے پاس ہیں۔ وہ ان کے خیالات بدل دیں۔"

"تو پھر کیا کہہ کر انکار کروں؟" عینا پریشانی سے بولیں۔

"کہہ دینا کہ ہم ایک خاندان میں دو لڑکیاں نہیں دیتے......اور سنو اب واشلہ کے لیے کوشش کرو۔"

"وہ جو مفتاح کا دوست تھا......اس کا کیا ہوا؟" عینا نے دل چسپی سے پوچھا۔

"میں نے دو چار بار اسے فون کیا تو ہے مگر کم بخت نے جواب ہی نہیں دیا۔" وہ سہراب سے سخت نالاں دکھائی دے رہی تھیں۔

"تو آپ مفتاح سے کہہ کر اسے ڈنر پر بلوائیں۔"

عینا نے صلاح دی۔ شریفہ کی مکار آنکھیں چمکنے لگیں۔

"ہاں، یہ بات تو میرے ذہن میں ہی نہیں آئی۔"

"چلیں میرے آگئی۔" عینا مسکرا کر بولیں۔ "بس تو پھر آپ کل ہی کال کروا دیں اسے......ابھی میں بھی یہیں ہوں۔ ملاقات ہو جائے تو ذرا میں بھی اسے اچھی طرح ٹٹول لوں گی۔"

ان کے ارادے بہت نیک تھے۔

وریٰ لب بھینچے خاموشی سے پلٹ گئی۔

☆☆☆

"اے بابو! تم خط کا جواب کیوں نہیں لکھتے ابو کو۔"

بی آگئی تھی۔ سو وہ لاؤنج سے اٹھ کر گھر کے اس حصے میں چلا آیا کہ جہاں اب وہ جانے سے گریز کیا کرتا تھا کہ دل پھٹنے لگتا تھا وہ خالی پلنگ دیکھ کر کہ جہاں کبھی اس کی پوری دنیا اور پوری جنت نظر کے سامنے ہوا کرتی تھی اور آج وہاں کوئی نہیں تھا۔

اس کے دو جہاں لٹ چکے تھے تو کیا وہ اب بھی بین نہ کرتا۔ اور کچھ بین بے آواز بھی تو ہوا کرتے ہیں۔ سو وہ بے زبان خاموشی روتا، کرلاتا، تڑپتا اسی پلنگ پر آ لیٹا جہاں محسوس کرو تو آج بھی وہی روح کو شانت کرتی، تھپکتی لوریاں سناتی خوشبو موجود تھی۔ ماںتا کی خوشبو۔

"بولو نے بابو۔"

جانے والے وطن لوٹ آئے تھے۔ حسب معمول دو چار روز تو ملنے کے لیے آنے والوں کا تانتا بندھا رہا۔ آج گھر میں کچھ سناٹا سا تھا سو فیروزہ اپنے لاڈلے کو پاس بٹھا کر من میں مچلتا، اچھلتا کودتا انہیں ہراساں و پریشان کرتا سوال اس سے کر بیٹھیں۔

اور وہ جسے اس سوال کی غالباً توقع نہ تھی چپ کا چپ رہ گیا۔

"ہم کچھ پوچھ رہے ہیں نا تم سے بابو......" پیازی رنگ کی سوتی ساڑی میں ملبوس فیروزہ کے لہجے میں اس بار ذرا سی خفگی تھی۔

"کیا لکھتا؟" بالآخر وہ مارے شرمندگی کے نظر جھکا کر بولا۔

"اپنی ذلیل حرکت کی معافی مانگ لیتے۔" وہ ڈپٹ کر بولیں۔

"وہ حرکت جو میں نے کی ہی نہیں۔" وہ رنجور لہجے میں بولا۔

"ماں سے جھوٹ بولو گے؟" فیروزہ نے شاکی نگاہوں سے اسے دیکھا۔



"کیا آپ بھی یہی سمجھتی ہیں کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں؟" وہ بے پناہ یاسیت سے بولا۔

"مگر عامر وانے تو یہی بتایا ہے نے سب کو۔" وہ الجھن زدہ سے لہجے میں بولیں۔

"انہیں غلط فہمی بھی تو ہو سکتی ہے۔" وہ جواب کسی کو بھی اس ضمن میں صفائی یا وضاحت نہ دینے کا عزم کر چکا تھا، ماں کے سامنے اپنے عزم سے پیچھے ہٹ گیا۔

"تو صفائی دیتے نے تم اس کو۔" وہ بولیں۔

"جی......دینے کی بہت کوشش کی تھی۔"

"اے تو کیا کم بخت مارا بات نہیں سنا تمری۔" وہ طیش میں آتے ہوئے بولیں۔

"شاید انہوں نے سننے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔"

"اے کمینہ......" وہ یک گونہ طمانیت سے بولیں۔ "بہت منہ زور ہوا جا رہا ہے۔ ہم پہلے ہی کہے تھے تمرے ابو کو کہ ہمارا بابو ایسا کر ہی نہیں سکتا۔"

"ہاں......" وہ یہ سن کر بے اختیار ان کے گلے سے جا لگا تھا۔ یہ کیسا ناقابل بیان سکون تھا۔ جو اس ممتا سے لبریز معصوم لہجے نے اسے بخشا تھا۔ وہ جو اندر ایک سناٹا سا اتر گیا تھا، وہ اب مدھم مدھم سروں میں بدلتا جا رہا تھا۔ اور سارے سر محبت کے تھے، طمانیت کے تھے اور فرحت کے بھی۔

☆☆☆

"غم ہے یا خوشی ہے تو
میری زندگی ہے تو"

اسی دن کی طرح انگوری دیدہ زیب لباس میں مناسب حد تک ہی سنوری وریٰ آج بھی دس بجتے ہی کمرہ امتحان سے نکل آئی تھی۔

اور اب وہ دونوں ہوا کے دوش پر سنگ سنگ نامعلوم منزل کی سمت گویا اڑے جا رہے تھے۔

تب ہی نیلی جینز اور سرخ قمیص میں ملبوس سہراب نے اپنی پیاسی نگاہوں کو اس کے حسن سے سیراب کرتے ہوئے پیار بھرے شکوے سے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

"تم دو دن سے رات میں بات کیوں نہیں کر رہیں مجھ سے۔"

"عینا بجو رہنے آئی ہوئی ہیں اس لیے۔" عینا کے ذکر پر اسے شریفہ اور ان کے مابین ہوئی گفتگو بھی نئے سرے سے یاد آ گئی۔ ساتھ ہی وہ "ادھوری بات" بھی جسے مکمل سننے کے لیے وہ بے چین تھی۔ اور شاید اسے بے چین ہی رہنا تھا کہ اسے مکمل کرتا بھی کون؟

"اتنی اہم ہیں تمہاری عینا بجو کہ تم ان کے سامنے مجھے اگنور کر رہی ہو۔" وہ اچانک غصے سے بے تحاشا سرخ ہو کر بولا تھا۔

وریٰ نے خاصی دل چسپی مگر تعجب سے اس کا قندھاری انار سے مشابہ چہرہ دیکھا۔

"اوف وہ......" چند ثانیے بعد وہ ناز بھرے انداز سے وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ "پتا نہیں تم کیا سمجھ رہے ہو۔ دراصل عینا بجو ہی کے کمرے میں تو میں، تم سے پڑھائی کے بہانے بند ہو کر بات کیا کرتی ہوں اور اب جب وہ میکے آئی ہیں تو ظاہر ہے وہیں رہ رہی ہیں نا......"

"اوہ......" سہراب کے چہرے کی سرخی یہ سن کر بتدریج کم ہونے لگی۔

"اچھا، اچھا......اب میں سمجھ گیا۔"

"رشتہ لائی ہیں وہ میرا......" اس بار دیدہ دانستہ وریٰ نے سہراب کو یہ اطلاع فراہم کی تھی۔

''کیا مطلب؟'' بلا ارادہ ہی اس کا پاؤں بریک پر جا پڑا تھا اور ایک سو چالیس کی رفتار پر، دفعتاً بریک کا

''رشتے کا مطلب تمہیں نہیں پتا.....'' اپنا ڈیش بورڈ سے ٹکرا جانے والا ماتھا سہلاتی ورثی سخت برافروختہ سی ہو کر بولی تھی۔

''مجھے صرف اتنا پتا ہے کہ میرے علاوہ تم اور کسی کی نہیں ہو سکتیں۔ میں ہونے نہیں دوں گا۔'' نا جانے کیا کچھ تھا اس وقت سہراب کے لہجے میں جو ورثی گم صم سی ہو کر بولی۔

''تم واقعی اتنا چاہتے ہو مجھے.....''

''تمہیں کوئی شک ہے؟'' وہ برا مان کر بولا۔

''ہاں.....'' اس نے گردن دھیرے سے اثبات میں ہلا کر کہا۔

''کیوں کہ چاہت کے دعوے دار اکثر چھوڑ بھی تو جاتے ہیں۔''

''تمہیں کسی نے چھوڑا ہے کیا؟'' سہراب نے ایک گہری بہت اندر تک اترتی نگاہ اس کے چہرے پر ڈال کر گمبھیرتا سے پوچھا۔

''ہاں...'' وہ دو دن سے شاید ایسے ہی کسی لمحے کی متلاشی تھی۔ تب ہی تو اشک جیسی بہت قیمتی، بہت بیش قیمت شے اس کے سامنے بہا کر اپنا آپ عیاں کر گئی۔

''کون تھا وہ؟'' اسٹیرنگ پر سہراب کی گرفت سخت ہوگئی کہ اگر وہ جان دار ہوتا تو اس سے دم گھٹنے سے مر جاتا۔

''میرا باپ...'' یک لحظہ توقف کے بعد وہ اپنی بے اختیاری پر جھینپ کر اپنے آنسو انگلی کی پوروں سے جھٹکتی ہوئی بولی۔

''او ورثی...'' اس جواب پر سہراب کے تنے اعصاب یک لخت یوں ڈھیلے پڑ گئے گویا وہ کوئی بہت اہم معرکہ سر کر چکا ہو۔ ''تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔''

''آئم سوری، میں نے تمہیں پریشان کر دیا۔''

''نہیں نغمہ بہار.....'' وہ اس کا متورم چہرہ دیکھ کر بہکتے ہوئے بولا۔ ''تم نے تو مجھے پاگل کر دیا ہے۔''

''او خدا...'' وہ اس کی وارفتہ نگاہوں کی تاب نہ لا کر بات بدلنے کی غرض سے شوخ و شنگ لہجے میں بولی۔

''یعنی میں اتنے دنوں سے ایک پاگل کے ساتھ رابطے میں ہوں۔''

''نہیں میری جان۔'' وہ مسلسل تھرتھراتا فون پتلون کی جیب سے نکال کر نظر کے سامنے آنے والے نمبر کو دیکھ کر منہ بناتا ہوا بولا۔

''ایک تم ہی نہیں تمہاری وہ لیڈی شریفہ بھی۔''

''او ہاں۔'' وہ بھی ناک چڑھا کر بولی۔ ''وہ شاید تمہیں ڈنر پر انوائٹ کرنا چاہتی ہیں۔''

''بھئی بڑی ہی چیکو آنٹی ہیں۔'' وہ بے زار لہجے میں بد تہذیبی سے بولا۔ ''مجھے ڈنر پر انوائٹ کرنا نہیں بے وقوف گدھا سمجھ کر گھیرنا چاہتی ہیں۔''

''اور تم کیا چاہتے ہو؟'' ورثی کو لیڈی شریفہ کے بارے میں سہراب کے الفاظ بہت پسند آئے تھے تب ہی چمکتی آنکھوں سے اسے دیکھ کر شرارت سے بولی۔

''کبھی تنہائی میں فرصت سے بتاؤں گا۔'' ایک تو اس کی بہت کچھ بولتی نگاہیں مستزاد مخمور لہجہ۔

"فون اٹھالوان کا......" وہ بوکھلا کر بولی۔ ساری شوخی وشرارت ہوا ہوگئی تھی۔
"مجھے ڈنر میں کوئی دل چسپی نہیں۔" وہ حقارت سے بولا۔ "لیکن اگر تم کہو تو اس بہانے میں تمہارے دیدار کو آجاؤں؟"
"آجانا......"
"چلو، انہیں بعد میں رنگ بیک کرتا ہوں۔" وہ فون آف کر کے جیب میں رکھتا ہوا بولا۔
"اوہ آج تو دیر ہوگئی بہت......" اچانک ہی وری کی نگاہ اپنی کلائی پر بندھی گھڑی پر پڑی تو وہ اچھل پڑی۔
"اب جلدی چلو سہراب۔"
"ہاں......ہاں چلو۔" وہ ابھی کچھ دیر مزید یہیں ٹھہرنا چاہتا تھا مگر اسی وقت عقب سے آنے والی گاڑی نے ہارن پر ہارن دے کر بیچ راستے میں روکی گئی اس گاڑی کو آگے بڑھنے پر مجبور کر دیا۔

☆☆☆

"گڈ مارننگ سر!"
امیر علی خان بس ابھی آکر اپنے دفتر میں، براجمان ہوئے تھے کہ تب ہی فاروق احمد چلا آیا اور بڑی بشاشت سے ان کے حضور صبح کا سلام پیش کیا۔
"گڈ مارننگ......گڈ مارننگ کیا بات ہے۔ آج بڑے اچھے موڈ میں دکھائی دے رہے ہو ینگ مین۔" وہ میز کی دوسری جانب پڑی کرسیوں میں سے ایک پر اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے جواباً خوش دلی سے بولے۔
"سر بات ہی کچھ ایسی ہے۔" وہ پُرجوش سے لہجے میں بولا۔
"وری گڈ......" امیر علی خان نے متانت سے گردن ہلائی۔
"کوئی نیا کیس؟"
"کیس تو پرانا ہی ہے۔ مگر ڈویلپمنٹ (Developement) نئی ہے۔" اس نے مستعدی سے بتایا۔
"بریف کرو......" وہ ہمہ تن اس کی جانب متوجہ ہو کر بولے۔
"یہ دیکھیے سر!" وہ اپنے فون میں ایک فائل کھول کر انہیں دکھاتے ہوئے نپے تلے سے لہجے میں جلدی جلدی بتانے لگا۔
"مبینہ خودکشی کرنے والی ماڈل اور اس پی۔ ذی کے مابین کچھ دنوں سے جھگڑا چل رہا تھا۔"
"سو واٹ......" وہ اس کے فون میں کھلی فائل پر سرسری سی نظر ڈال کر فون اسے واپس کرتے ہوئے سنجیدگی سے بولے۔
"اس طرح کی کیٹ فائٹس (cat Fights) تو شوبز میں معمول ہیں۔"
"اور اس طرح کی فائٹس کے نتیجے میں کتنی ماڈلز اور اداکارائیں خودکشی کرتی ہیں؟" وہ ادب ملحوظ رکھتے ہوئے طنزاً بولا۔
"کہنا کیا چاہتے ہو؟" امیر علی خان کے چہرے سے الجھن مترشح ہوئی۔
"جو آپ سمجھ کر بھی سمجھنا نہیں چاہ رہے سر۔" وہ بے بسی آمیز متاسف لہجے میں بولا۔
"میری گٹ فیلنگ کہہ رہی ہے کہ یہ خودکشی نہیں قتل ہے۔"
"قتل......؟" امیر علی خان نے اس بار بے طرح چونک کر اس کی جانب دیکھا تھا۔
(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)



سنیعہ عمیر

# تیری مٹی سونا

ایک روز بچپن میں مجھے دریافت کی سوجھی۔ میں نے اپنے کھلونوں کی تلوار لی اور لان کی زمین کھودنے لگا۔ میری دیکھا دیکھی میری چھوٹی بہن بھی اپنے کھلونوں کا چمچ لے آئی اور کھودنے لگی۔ ہم دل جمعی سے امرود کے درخت کے نیچے گڑھا کھودنے میں مصروف تھے کہ بھائی جان آگئے۔
"یہ کیا کر رہے ہو تم دونوں؟" انہوں نے مشکوک انداز سے دیکھا۔
"زمین کے اندر ہیرے جواہرات ہوتے ہیں۔ کبھی پٹرول تو کبھی سونا بھی نکل آتا ہے۔ میں کھوج لگا رہا ہوں۔" میں نے لالچی نگاہوں کے ساتھ کہا۔
"یہ سب کچھ تم پلاسٹک کے چمچ اور لکڑی کی تلوار سے نکالنا چاہ رہے ہو؟ پگلے، آبادی بنانے سے پہلے ماہروں نے بڑے بڑے اوزاروں سے یہ پہلے ہی معلوم کر لیا ہوتا ہے۔" بھائی نے ہم دونوں کا دل ہی توڑ دیا۔
"مطلب اندر سے کچھ نہیں نکلے گا؟" میں نے غصے سے لکڑی کی تلوار زمین پر دے ماری۔
"جتنا تم لوگ کھود رہے ہو عنقریب سنڈیاں اور کیڑے مکوڑے نکل آئیں گے۔" بھائی جان نے

تو دل گھر دیکھ کر ایسا خوش ہوا جیسے سب میرا ہی ہو۔ میں مزید اچھا اور بڑا ڈاکٹر بننے کے خواب دیکھنے لگا۔ میں نے بھی ٹھانی ایسا ہی شان دار آرائش والا گھر بناؤں گا۔ ملازم کے کتاب لے کر آنے تک میں نے خیالی پلاؤ پکایا۔ پھر کتاب لے کر جب کالج پہنچا تو شازیہ نے بڑی مسکراہٹ کے ساتھ شکر ادا کیا۔ مجھے وہ اچھی تو پہلے بھی لگتی تھی اب اور اچھی لگنے لگی۔

میڈیکل کی پڑھائی، اس قدر مشکل تھی کہ امتحانوں میں لڑکیاں سوجی آنکھیں، الجھے بال اور بعض اوقات چہرے پر سیاہ دھبوں کے ساتھ آتی تھیں۔ شازیہ ان دنوں میں بھی سلیقے سے بندھے بال اور صاف ستھرے حلیے میں آتی۔

''آپ کون سی کتابیں پڑھتے ہیں؟'' ایک روز شازیہ نے مجھ سے پوچھا۔

اب میں ریٹائرمنٹ کے قریب ہوں تو بھی ہالی وڈ موویز دیکھتا ہوں۔ اس دور میں بھی اچھا خاصا رنگین تھا۔ میں نے چند انگریزی ناولز کے نام بتائے۔

''اچھا مجھے بھی کوئی تجویز کیجیے گا۔'' اس نے فرمائش کی میں نے اسے سڈنی شیلڈن کے، دو ناول لا کر دیے۔ ان دنوں وہ میرا پسندیدہ رائٹر تھا۔ اس کی کہانیاں سسپنس سے بھری ہوتی تھیں۔ ایسے بڑھیا چونکا دینے والے کردار اور واقعات پڑھ کر انسان الگ ہی دنیا میں چلا جاتا تھا۔ میں تو سڈنی شیلڈن سے بہت محظوظ ہوتا تھا۔ اب انگریزی ناول تھا امریکی بھی تھا۔ تو اس میں زندگی کے کچھ پوشیدہ عوامل کھول کھول کر بتائے جاتے تھے۔

لیکن میرا ایسا ہرگز کوئی مقصد نہیں تھا۔ خوش قسمتی سے وہ بھی عقل مند تھی۔ اس نے بھی کوئی غلط مطلب نہیں لیا۔

ہم اکثر ان ناولوں پر بحث کرتے تھے۔ جن پر بعد میں انڈیا نے بھی کئی فلمیں بنائیں۔ رفتہ رفتہ ہم پسندیدگی میں قریب آتے گئے۔ ہر چیز دو طرفہ تھی۔ ہر ملاقات، ہر اضافی بات، اظہار محبت، مستقبل کے خواب اس کی سمت سے بھی اتنے ہی تھے جتنے میری طرف سے۔ زندگی ان دنوں بہت اچھی تھی۔

☆☆☆

ایک دن میری بہن اقصیٰ اپنا پورا نمبر لے کر گھر پہنچ گئی۔ دراصل میں اور شازیہ ساتھ گھومتے پھرتے تھے۔ اس کی عزت پر کوئی حرف نہ آئے، اس لیے میں ہر جگہ اس کا تعارف اپنی منگیتر کے طور پر کرواتا تھا۔ جو کہ سچ ہی تھا۔

وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتی تھی اور میں تو اسے ہی اپنا سب کچھ مان چکا تھا۔ ایسے ہی کسی سیمینار میں اقصیٰ کے سسرالی رشتہ داروں کو علم ہو گیا۔ انہوں نے میری بہن کے سسرال میں کال کر دی۔

اقصیٰ کی ساس نے طعنہ دیا کہ بھائی کی منگنی کر لی ہمیں بتایا بھی نہیں۔ اقصیٰ چپ کی چپ رہ گئی۔ اس کو خود معلوم نہیں تھا۔ بہانے سے وہ گھر آ گئی اور امی کو بھی خوب بھر دیا۔

''دیکھو ذرا، گھر والوں کو علم ہی نہیں۔ شکیل بھائی سارے شہر میں اسے لیے پھرتے ہیں۔''

اقصیٰ تپی بیٹھی تھی۔

''نادرہ کے بیٹے نے بھی مجھے بتایا تھا۔ پر ابھی تو پڑھائی مکمل کر لے۔ لڑکوں کی تب ہی بات کی جاتی ہے۔'' امی اقصیٰ کے ہی پرانے ریشمی کپڑے نکال کر اسے دے رہی تھیں۔ تاکہ بچیوں کو عید پر چھوٹے کروا دے۔

اقصیٰ نے غصے سے کپڑے پرے کیے۔

''لو شکیل بھائی عیاشی کریں اور ہم شرمندگی اٹھائیں ہرگز نہیں۔''

اقصیٰ کو ہونہ ہو اپنی قسمت پر بھی غصہ تھا۔ بیٹیوں کو چلتا کیا اور بھائیوں کو خالی سلیٹ تھما دی کہ جو دل چاہے لکھ لو۔

صرف اقصیٰ کی ضد نہیں تھی۔ چھوٹا شہر تھا۔ جہاں سارا خاندان آباد تھا۔ وہاں ہمارے تعلق کی داستانیں لکھی جانے لگیں۔ مجھے بھی باقاعدہ رشتہ ہو جانے میں عار نہیں تھا۔ سو امی جیتی ہوئی بازی پر مہر ثبت کرنے چلی گئیں۔

☆☆☆



''میری شازیہ کے لیے تو پہلے ہی بہت رشتے ہیں۔ بیٹی تھی اس لیے نظروں کے سامنے رکھا۔ ورنہ ہمارے تو خاندان میں سارے باہر جا کر ڈاکٹری پڑھتے ہیں۔ شازیہ کے لیے امریکہ سے دو رشتے آئے ہیں۔ ان کا پاکستان میں بھی گھر اور گاڑیاں ہیں۔ ان دونوں کا حال اور مستقبل شان دار ہیں۔ لیکن ہمیں ایسی کوئی جلدی نہیں ہے۔ اس کے فادر تو سوچ رہے ہیں۔ پہلے یہ اسپشلائز کرے۔''

مسز اجمل بھی جانتی تھیں کہ شازیہ کے چاہنے والوں میں سے رشتہ آئے گا۔ پر بچی کی بے وقوفی کو وہ مستقل نہیں کر سکتی تھیں۔

امی نے میرا کیس پھر بھی زور و شور سے لڑا، میں انتہائی لائق تھا۔ سلجھا ہوا تھا۔ بے حد خیال رکھنے والا انسان تھا۔ میرا مستقبل بھی سونے کی تار سے لکھے جانے کے برابر تھا۔ لیکن ان دلائل کی ضرورت ہی نہیں آنی چاہیے تھی۔ میں تو پس پردہ اپنا آپ منوا کر بازی جیت چکا تھا۔ لیکن یہ میری غلط فہمی تھی۔ اس کی امی نہیں مانیں۔

اس نے ضد کی لڑائی کی مگر بغاوت نہ کر سکی۔ آخری ملاقاتوں میں جس طرح ہم نے اپنی محبت کو دفنایا، وہ بھولنے میں مجھے اگلے دو سال لگ گئے۔

☆☆☆

میں ڈاکٹر بن گیا۔ میری نوکری لگ گئی۔ اب امی نے بھی میرے رشتے کا سوچنا شروع کر دیا۔

''میں ایک دو جگہ تمہارے رشتے کا کہتی ہوں۔'' امی نے بہت ارمان سے کہا۔

''امی! مجھے ڈاکٹر بیوی ہی چاہیے۔'' مجھے ابھی بھی امی کی پسند پر اعتبار نہیں تھا۔ اس لیے انہیں مشکل میں ڈالا۔

''تو کیوں نہیں۔ تیری ماں ہوں۔ تیرے معیار کو جانتی ہوں۔ میرے کزن ہیں اختیار بھائی، ان کی بیٹی حرا ڈاکٹر بن رہی ہے۔ اتنی ملنسار اور گھر داری والی ہے۔ ذرا جو نخرہ ہو اس کے بارے میں غور تو کرو۔''

امی نے اچھا جوڑ ڈھونڈا تھا۔ ان کا رہن سہن ہم جیسا ہی تھا اور پڑھائی لکھائی کے نمبر بھی خوب تھے۔ مجھے آئیڈیا برا نہیں لگا۔

☆☆☆

خاندان میں غیر شادی شدہ دو ڈاکٹر تھے۔ لوگوں کے بھی اندازے تھے۔ حرا بھی جانتی تھی میں بھی سنتا تھا۔ ہمارے متوقع رشتے کی چہ مگوئیاں ہونے لگیں۔ ایک روز میں حرا سے ملنے اس کے کالج چلا گیا۔ ساتھ ہی اسپتال بھی تھا۔ میرا جانا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ وہ ڈیوٹی کے دوران معذرت کر کے میری بات سننے آئی تھی۔

''کیا حال ہے آپ کا، آج کل کون سے مرض چل رہے ہیں۔'' میں نے مذاق کیا۔

''صرف مرض نہیں، مریضوں کی تو ہزاروں فکریں ہیں۔ اچھی خاصی کاؤنسلر بن گئی ہوں۔'' اس نے بے ساختہ ہنس کر کہا۔

میرے لیے یہ ہی لڑکی ٹھیک تھی۔ امی کے معیار پر بھی پوری اتری اور میری ہم آہنگی بھی اچھی ہو سکتی تھی۔

''آپ کچھ کہنے آئے تھے؟'' اسے لگا میں کوئی پیغام دینے آیا ہوں۔

''نہیں بس آپ سے ملنے آیا تھا۔ آپ کی ڈیوٹی کس وقت آف ہوتی ہے۔ تسلی سے چائے پی لیں گے۔'' میں نے بہت ادب سے پیشکش کی۔ میں سر پر سوار نہیں ہونا چاہتا تھا۔

لیکن حرا کو پسند نہیں آیا۔ اس کا چہرہ کسی حد تک ناراض ہو گیا۔

''آپ کو اس طرح یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔'' وہ اکیلے مل کر ذاتی روابط بڑھانے کو سخت برا سمجھتی تھی اور یہ صحیح بھی تھا۔

''میں بس چاہتا تھا ہم ایک دوسرے کو سمجھ لیں۔'' میں نے اپنا دفاع کیا۔

''بات بڑوں میں بڑھے تو ہی مناسب ہے۔'' اس نے بزرگی سے جواب دیا اور چلی گئی۔

امی نے مجھے غور کرنے کو کہا تھا، میں نے اس کے بعد اچھی طرح سے غور کیا اور انکار کر دیا۔ مجھے چالیس فیصد غصہ، پچاس فیصد شرمندگی تھی اور دس فیصد بدلہ تھا، کہ میں ٹلنے گیا اور اس نے قدر نہیں کی۔ فیصلہ انکار میں نے ہی کیا۔ اب پھر سے میں تنہا تھا اور امی متحرک۔

☆☆☆

میں نے ڈاکٹر بیوی کا کہا تھا اور حرا کے لیے انکار بھی کر دیا تھا۔ اپنے تئیں میں نے امی کی ساری کشتیاں جلا دی تھیں۔ رشتہ کروانے والیوں کی آؤ بھگت امی نے کرنی نہیں تھی۔ سہیلیاں بھی اپنے جیسی سادہ پال رکھی تھیں۔ جنہوں نے کم پڑھائی والی، چھوٹی موٹی بچیاں پروان چڑھائی تھیں۔

پر میری امی تو امی ہی تھیں۔ امی نے اپنا بہترین جوڑا کلف لگا کر پہنا۔ لپ اسٹک لگائی۔ وہ جوتی پہنی جس میں سج سج کر چلنا پڑے۔ پھر امی نے رکشہ پکڑا اور اسپتال کے ویٹنگ ایریا میں جا کر بیٹھ گئیں۔

اس اسپتال کی میڈیکل کالج سے وابستگی تھی وہاں لڑکیوں کی، پوری جماعت ہاؤس جاب کر رہی تھی۔ امی ایک ایک ویٹنگ ایریا پر بیٹھی آتی جاتی لڑکیوں پر غور کرتیں، کبھی فارمیسی کے سامنے چلی جاتیں۔ کبھی پارکنگ کے پاس ہر جگہ غور و فکر کر کے وہ واپس آ گئیں۔ دوسرے دن وہ ایسے ہی بیٹھی تھیں کہ ایک ڈاکٹر کی ان پر نظر پڑی۔

''ارے آپ یہاں کیا کر رہی ہیں۔ خیریت تو ہے؟'' ڈاکٹر فرخندہ کو لگا کوئی عزیز داخل ہے۔

''جی جی سب خیریت ہے۔ بس ایک مشن پر نکلی ہوں۔'' امی رازداری سے مسکرائیں۔

ڈاکٹر فرخندہ نے امی کو اندر چائے کے لیے بلا لیا۔ کھل کر بات ہوگئی۔

''بھئی یہ تو بہت نیک کام ہے۔'' ڈاکٹر فرخندہ نے طریقے سے امی کی ہاؤس آفیسرز سے ملاقات بھی کروا دی۔ امی نے مطلوبہ نمبر بھی لے لیے۔ یوں میرے لیے ایک مناسب شریک حیات مل گئی۔ امی صحیح کہتی تھیں۔ ماں تو ماں ہی ہوتی ہے۔

☆☆☆

میں بھی خوش تھا پڑھی لکھی، اچھے خاندان کی بیوی ملنے والی تھی۔ اپنے تئیں میں نے ناکام کوششیں کر لی تھیں۔ اب میں فرماں برداری سے ماں کے کہے کو قبول کرنے والا تھا۔ چھٹی والے دن فون بار بار بج رہا تھا۔ جب کوئی اٹھاتا تو آگے سے بند کر دیا جاتا۔ میں کماؤ پوت مصروف آدمی تھا۔ فون اٹھانے کا کام نہیں کرتا تھا۔ لیکن بار بار بجتی گھنٹیوں سے تنگ آ کر آخر میں نے ہی فون اٹھا لیا۔

''کون؟'' آگے سے ایک نسوانی آواز ابھری۔

''ڈاکٹر شکیل بات کر رہا ہوں۔'' میں نے تعارف کروایا۔

آگے خاموشی چھا گئی مگر فون نہیں کٹا۔

''میں ڈاکٹر رمشہ بات کر رہی ہوں۔'' اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

میرا خوش فہم دل تو پہلے ہی خواب بن رہا تھا کہ کسی دن اس کا فون آ جائے۔ ڈاکٹر رمشہ ہی تو تھیں۔ جن سے تقدیر کے تار جوڑے جا چکے تھے۔

''کیسی ہیں آپ؟'' ہم ڈاکٹر برادری حال پوچھ پوچھ زندگی گزار دیتی ہے۔

''مجھے آپ سے شادی نہیں کرنی۔ آپ اس رشتے سے انکار کر دیں۔'' اس نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

''لیکن کیوں؟'' میں نے دل تھام کر پوچھا۔

''مجھے معلوم ہے آپ کا پہلے بھی افیئر تھا۔'' اس زمانے میں افیئر فیشن نہیں بنا تھا۔ لڑکوں کا بھی ہو تو بھی برا ہی مانا جاتا تھا۔

''وہ تو سارے شہر کو معلوم ہے۔ لیکن آپ تک یہ اہم اطلاع کس نے پہنچائی؟'' میں کیوں جھٹلاتا۔ میں نے دھڑلے سے قبول کیا۔

''میں نے آپ کے ہی کالج سے پڑھا ہے۔ وہاں اب بھی سب لوگ جانتے ہیں۔'' رمشہ نے وضاحت دی۔



''میں نے دو سال لگاتار اناٹومی میں ٹاپ بھی کیا ہے۔ وہ بھی کالج کے کسی تختے پر لکھا ہے۔ لیکن وہ کسی کو یاد نہیں ہوگا۔'' میں نے تپتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''آپ انکار کر دیں۔'' اس نے جلد بازی میں دہرایا جیسے اپنا ہی ارادہ بدل جانے کا خدشہ ہو۔

''میں کیوں انکار کروں۔ آپ کا تو کوئی قابل اعتراض ماضی نہیں ہے اور ہوتا بھی تو بھی میں اتنی آسانی سے، انگلیاں نہیں اٹھاتا، میرے پاس انکار کی کوئی وجہ نہیں ہے۔'' میں نے اسے چڑایا۔ ابھی سے کیوں ساری باتیں ماننے لگ جاؤں۔

''جی ڈاکٹر شاہین! میری نائٹ ڈیوٹی لگا دیں میں کراؤں گی۔'' رمشہ نے اونچی آواز میں کہا۔ پیچھے کسی کو سنا رہی تھی۔

مجھے سارے فساد کی جڑ یہ ڈاکٹر شاہین ہی لگ رہی ہیں۔ میں کالج میں بہت ہر دل عزیز تھا۔

''میں نے ایک معصوم سی محبت کی تھی اور اس کا برملا اظہار بھی کیا۔ جلنے کڑھنے والی ایک قوم بھی تھی جس کی بددعاؤں سے ہی شاید وہ محبت تکمیل کو نہ پہنچ سکی۔ انہیں لوگوں نے ہمارے قصوں کو قائم رکھا ہوا ہے۔'' میں نے صفائی دینے کی کوشش کی۔

''مانا کہ ہینڈسم ہیں مگر ایسا بھی کیا حسن یوسف۔'' رمشہ نے بھی فوراً نفی کی۔

''چلو، آپ نے ہینڈسم تو مان لیا۔ لائق فائق بھی ہوں۔ جنہوں نے محبت کے قصے سنائے ہیں ان سے ہی پوچھ لیجیے گا۔ بے حد خیال رکھنے والا ہوں۔ رہی شرافت کی بات تو دنیا جو قصے سناتی ہے بس وہی ہیں۔'' میں نے تسلی سے بات کی۔

اگلی طرف سے بھی خاموشی چھا گئی۔

''اتنی گہرائی میں نہ سوچیں۔ وسوسوں کا علاج بہت مشکل ہے۔'' میں نے اسے دوبارہ اکسایا۔

''وسوسوں کا علاج؟'' رمشہ نے جملہ اٹھایا پھر خود ہی بولی۔

''آپ بہت اناڑی ڈاکٹر لگ رہے ہیں۔ وسوسوں کا علاج تو بہت آسان ہے۔'' اب کی بار اس نے شائستگی سے کہا۔

''لگتا ہے آپ بہت ماہر ڈاکٹر ہیں۔ آپ کو وسوسوں کا علاج مل چکا ہے۔'' میں بھی پوری ترنگ میں آ چکا تھا۔

''جی وسوسوں کا علاج ہے کہ ایک بار مکمل کر بات کر لی جائے۔'' اس کی آواز سے لگ رہا تھا۔ جیسے وہ مسکرا رہی ہو۔

''تو کیا آپ کے وسوسوں کا علاج ہو گیا ہے؟ ہماری شادی اب خطرے سے باہر ہے؟'' میں نے خوش ہوتے ہوئے پوچھا۔

''کیا یاد کریں گے آپ کر ہی لیتی ہوں آپ سے شادی۔'' اس نے لہک کر جتایا اور کھٹ فون بند کر دیا۔

امی کی پسند پر اگر رتی برابر بھی شک تھا تو وہ اس ہی دن دور ہو گیا۔ مجھے ایسی خود اعتماد شریک حیات ہی تو چاہیے تھی۔

☆☆☆

امی نے پھر سوہن حلوے کا ڈبہ کھولا اور بھابھی اور اقصیٰ سے مشورہ کرنے لگیں کہ دلہن کو کون سا سیٹ ڈالیں۔ میں بھی قریب ہی موجود تھا۔

''امی وہ ہیروں والے ٹاپس پڑے ہیں؟'' مجھے کہیں سے وہ یاد آ گئے۔

''ہاں ہاں ادھر ہی ہیں۔ میں نے ہمیشہ بہت سنبھال کر پہنے۔ ایک بھی نگ جو ہلا ہو۔ سوچ رہی ہوں بہو کو سلامی میں ڈال دوں۔''

امی نے رومال کھول کر ٹاپس مجھے پکڑائے۔

''بہو کو کیوں ڈالنے ہیں۔ آپ پہنیں بلکہ میری شادی پر آپ نے یہی پہننے ہیں۔ آخر کو آپ دولہا کی ماں ہیں۔''

میں نے پیار سے امی کو خود سے لپٹایا۔ مجھے اپنی بھولی سادی ماں پر بہت پیار آیا۔ جو مرضی سمجھ لو، ماں تو ماں ہی ہوتی ہے۔

نعیمہ ناز سلطان

# راستے مل ہی جاتے ہیں

بل کھاتے پُر پیچ راستوں پہ سفر کرتے ہوئے گاڑی جو ہچکولے کھا رہی تھی، سو کھا رہی تھی، مسافروں کے دل اس سے کہیں زیادہ اتھل پتھل ہو رہے تھے۔ وین کی کھڑکی سے باہر کے نظارے بے شک بہت خوب صورت تھے مگر سیاہ مہیب، بلند و بالا ہرے بھرے پہاڑ دیوار کے حسین درخت، اور انھی پہاڑوں کے ساتھ ساتھ سفر کرتی، خوفناک، گہری کھائیاں، جنہیں دیکھتے ہی کلیجہ اچھل کر حلق میں آجائے اور جو کچھ حلق میں ہو وہ باہر آجائے۔

ویسے باہر آنے کو تو آنکھیں بھی حلقوں سے باہر آرہی تھیں بلکہ آچکی تھیں۔ ابھی تو منزل مقصود پہ پہنچے بھی نہیں تھے۔ راستے میں ہی تھے مگر یہ کوہ مری کو جانے والی سڑک؟ اف زگ زیگ راہیں سر چکرائے دے رہی تھیں۔

ڈرائیور صاحب بڑے مست مگن ہو کر ڈرائیو کر رہے تھے۔ ان کا تو روز کا کام تھا، انہیں نہ ہی یہ حسین نظارے مبہوت کرتے تھے اور نہ ہی یہ خوفناک کھائیاں اور گھاٹیاں خوف زدہ کرتی تھیں۔

ڈرائیور کو تجربہ ہو چلا تھا کہ بڑے شہروں سے آنے والے مسافر خصوصاً صنف نازک کس کس طرح ہر بات پر چیخیں مارتی ہیں۔ دل و نظر کو گرفت میں لینے والے دلکش مناظر اور مقامات دیکھ کر بھی اور مہیب و

مکمل ناول

گہری کھائیاں دیکھ کر بھی، پہاڑیوں پر چٹانوں کی درزوں سے جھانکتے نازک و حسین پھول دیکھ کر بھی اور کہیں کہیں تنگ سڑک دیکھ کر بھی، جہاں وین کی پہیوں کی رگڑ سے کنارے کے پتھر لنگر نیچے کھائی میں گرتے ہیں۔ تو کہیں حیرت سے، کہیں ہیبت سے۔

"ہائے اللہ! اف اللہ! اوہ میرے خدا، خدایا۔"

باواز بلند یا دل ہی دل میں، ہر مسافر اللہ کو یاد کر رہا تھا۔ ڈرائیور کسی بھی آواز اور چیخ کا نوٹس لیے بغیر بڑی مہارت اور مشاقی سے اپنا کام کر رہا تھا۔

"ہائے اللہ، کتنی لاپروائی سے گاڑی چلا رہا ہے؟ ذرا بھی تو ڈر، خوف نہیں ہے شکل پہ۔" عطیہ پھپو نے دہل کر ہاتھ اپنے دل پہ رکھا اور کھڑکی سے نظر آتی گہری کھائی کو دیکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔

"پھپھو! یہ روزانہ ان ہی راستوں پہ سفر کرتا ہے، ہم پہلی بار کر رہے ہیں ہمیں تو ڈر لگے گا ہی، ڈرائیور تو عادی ہے۔" عباد نے باہر کا جائزہ لیا۔

وہ لوگ کافی بلندی پر پہنچ چکے تھے۔ نیچے بل کھاتے ہوئے وہ راستے نظر آ رہے تھے جن پر سے گزر کر وہ لوگ یہاں تک پہنچے تھے۔

"ہائے، ہم اس پر سفر کر کے یہاں پہنچے ہیں؟" شہلا آپی نے آنکھیں پھاڑ کر اس بل کھاتی سڑک کو دیکھا جو اتنے فاصلے سے بس ایک چوڑی لکیر کی طرح نظر آ رہی تھی۔

"شکر ہے یہاں تک پہنچ ہی گئے، اللہ اللہ کر کے مری آ گیا۔" انیلا باجی کے تیز تیز دھڑکتے دل کو ذرا قرار آیا۔

انہوں نے بھی سکون کی سانس لی۔

"تو یہ ہے مری؟" ویڈیوز اور پکس میں دیکھا تھا مگر اصل دیکھنے کا تجربہ اور مشاہدہ الگ تھا، انوکھا تھا۔

رائیل عرف بیلا عرف چھوٹی نے بھی طمانیت اور اطمینان سے آنکھیں بند کیں۔ تمام راستے وہ سفر سے لطف اندوز ہونے کے بجائے سارے بڑوں کے احکامات کی بجا آوری میں ہی لگی رہی تھی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد اسے آوازیں لگتی رہتیں۔

"چھوٹی، ذرا چپس کا پیکٹ تو نکالنا۔"

"مجھے نمکو دینا۔"

"اور مجھے بسکٹ۔"

"ذرا پانی کی بوتل پکڑانا۔"

"چھوٹی، میرے گلاسز رکھ دینا۔"

"اے بیلا، میری کیپ، بیگ میں رکھ دینا۔"

"اری چھوٹی، میری شال نکال دینا۔"

بیلا کہنے کا تکلف تو بڑے بہن بھائی کم ہی کرتے تھے۔ سب کی زبانوں پہ ایک ہی نام چڑھا ہوا تھا، چھوٹی، چھوٹی اور چھوٹی۔

اور یہ جو بیلا عرف چھوٹی تھی، اتنی چھوٹی تو نہ تھی، عمر کے بیسویں سال میں قدم رکھ چکی تھی مگر ماں باپ دونوں آپیوں اور بڑے بھائی کے سامنے ابھی چھوٹی ہی تھی۔ گھر میں سب کی عادت تھی اور یقیناً اتنی اچھی عادت نہیں تھی کہ ہر کوئی چھوٹے بڑے ہر کام کے لیے چھوٹی کو ہی آواز لگاتا تھا، اور وہ چراغ کے جن کی طرح سب کے احکامات کی تعمیل کے لیے حاضر۔

ایسا نہیں تھا کہ بیلا کوئی سوتیلی تھی یا اس کا خیال نہیں رکھا جاتا تھا۔ سب اسے چاہتے تھے، خیال بھی رکھتے تھے، اس کی ضرورت اور شوق کی کئی چیزیں لا لا کر دی جاتی تھیں مگر اف وہ گھڑی گھڑی آوازیں۔

بیلا کبھی عاجز بھی آ جاتی مگر مگر بڑا ہوا اس مروت اور محبت کے جذبے کا جو اس کے دل میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔

وین سے اتر کر ہوٹل کے کمرے میں منتقل ہونے تک تو ذرا سکون رہا، کمرے میں قیام ہوتے ہی ایک بار پھر بیلا کی پریڈ شروع ہو گئی۔

"افوہ... !" بیلا جو بڑے شوق سے کھڑکی سے باہر کا نظارہ کر رہی تھی، جھنجھلا گئی۔

پردہ چھوڑ کر سامان کی طرف آ گئی۔ کمرے کے بیچوں بیچ ڈھیر پڑا تھا۔ بیگ، تھیلے، پانی کی بوتلیں، ہینڈ کیری اور ہینڈ بیگز، ان پر کپڑوں کا ڈھیر۔



"کیا مصیبت ہے اوا! سب کچھ باہر نکال کر پھینک دیا۔" بیلا کو تو بس رونا آنے لگا۔ "پکنک پر بھی گھر کا ماحول بنایا ہوا ہے، پھیلاوا، بکھراوا، آوازیں، احکامات۔"

"شہلا نے اپنے کپڑے نکالے تھے بدلنے کے لیے۔" عطیہ پھپھو نے بیڈ پہ نیم دراز ہوتے ہوئے اطلاع دی۔

"ایک جوڑا نکالنے کے لیے سارے کپڑے باہر نکال کر ڈال دیے۔" بیلا بڑبڑاتے ہوئے کپڑے بیگ میں ڈالنے لگی۔

"تو کیا کرتی، یہ سوٹ سب سے نیچے رکھ دیا تھا تم نے۔" شہلا آپا نے غسل خانے سے برآمد ہوتے ہوئے اپنی صفائی پیش کی اور آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئیں۔

"جی ہاں، میرا ہی قصور ہے، مجھے الہام جو نہیں ہوا کہ آپ یہ سوٹ نکال کر پہنیں گی۔"

بیلا بے چاری خاموشی سے برداشت کر لیتی تھی۔ اگر اس قسم کی زیادتیاں گھر پر ہوتیں، مگر یہ تو پکنک تھی، سیر و تفریح، گھر سے، شہر سے ہزاروں میل دور، سرسبز پہاڑ، دیودار کے درخت، ہری بھری جھاڑیاں، رنگ برنگے پھول، اونچے نیچے راستے، ان پہ گرتی ہوئی یا گری ہوئی برف، نئے چہرے، نئے زاویے، نئے مناظر، جنہیں دیکھ کر آنکھیں بھی نئی نئی لگنے لگیں، خیالات میں ایک تازگی اور احساسات میں ایک اچھوتا پن محسوس ہو مگر نہ جی، یہاں تو وہی سیاپے اور شور شرابے تھے۔

"بیلا... بیلا، چھوٹی... اری چھوٹی..."

"ارے بھئی۔ ناراض کیوں ہو رہی ہو، میرا موبائل لے لینا دو گھنٹے کے لیے، سیلفی لینی ہو، لے لینا، جو دیکھنا ہو، دیکھ لینا۔"

شہلا آپا نے بڑی بے نیازی اور فیاضی کے ساتھ پیش کش کی۔

"ہائے میرا موبائل۔" ایک اور عظیم دکھ نے بیلا کے چٹکیاں لیں۔

تیاریوں کے چکر بلکہ بھول بھلیوں میں الجھ کر سب کا سامان تو اس نے رکھ دیا، پیک کر لیا اور چلتے وقت اپنا موبائل جو چارج پہ لگا ہوا تھا گھر میں ہی بھول آئی بلکہ بھول کیا آئی، انیلا باجی کی لاپروائی کی نذر ہو گیا۔ گھر سے نکلتے وقت بے چاری بیلا جو اپنے دونوں ہاتھوں میں جوس، چپس، نمکو اور اسی نوع کی دیگر ٹونگنے والی اشیاء کے تھیلے ہاتھوں میں لٹکائے گاڑی کی سمت جا رہی تھی، اس وقت انیلا باجی سے اس نے کہا تھا۔

"باجی! میرا موبائل چارج میں لگا ہوا ہے۔ ذرا نکال کر لے آئیں۔"

"وہ تو میں نے رکھ لیا۔" انیلا باجی نے بڑے فخر سے اپنا ہینڈ بیگ جھلایا اور جب گھنٹہ، ڈیڑھ گھنٹہ سفر کے بعد، بیلا نے باجی سے اپنا موبائل مانگا تو وہ حیران ہو گئیں۔

"تمہارا موبائل؟ مگر وہ میرے پاس تو نہیں ہے۔"

"آپ ہی نے تو بتایا تھا کہ آپ نے رکھ لیا ہے۔"

بیلا نے انتہائی صدمے اور دکھ سے انہیں دیکھا۔

"میں سمجھی، تم میرے موبائل کا کہہ رہی ہو۔"

انیلا باجی کی شان بے نیازی قابل دید تھی اور بیلا بے چاری کا دل دکھ کے عظیم سمندر کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب گیا اور اس وقت مری کے ہوٹل میں کمرے کی کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے اس کا غم پھر سے تازہ ہو رہا تھا۔

"اگر میرا موبائل ہوتا تو اس منظر کو قید کر لیتی اس میں۔"

بیلا نے حیرت و حسرت سے ان روئی کے گالوں جیسے انتہائی سفید بادل دیکھے جو اس طرح جھکے پڑے تھے کہ مانو، بس ہاتھ بڑھاؤ اور انہیں چھولو، سفید اور نرم روئی کے گالے، نیلم سے آسمان کی فیروزی چادر پہ ہیروں کی طرح دمک رہے تھے۔

"شہلا آپا، آپ کا موبائل لے لوں، اتنے حسین مناظر ہیں، پکس لے لوں گی۔"

"ارے گڑیا! تم ویڈیو بنالو بے شک، لے لو میرا موبائل۔" شہلا آپا نے حاتم طائی کی سخاوت رینکنگ میں دو نمبر کر دی اور خود ایک نمبر پہ آ گئیں۔

"تھینک یو۔" بیلا نے ان کا فون اٹھایا اور لے کر کھڑکی میں آ گئی۔

☆☆☆

درمیانہ قدوقامت، رنگ سانولے سے ذرا صاف، نین نقش والدین سے مستعار، امی جیسی خوب صورت آنکھیں اور ابو جیسا فیس کٹ موٹی سی ناک اور بہت ہی ہلکے بال، چوڑا ماتھا اب مزید چوڑا اور واضح ہوتا جا رہا تھا۔ یہ فرمان عقیل تھا۔ جو دنیا جہان کی بے زاری اپنے چہرے پہ سجائے بلکہ تھوپے ہوئے اپنے کندھوں اور ہاتھوں میں بیگز اور تھیلے لٹکائے کمروں کے اوپر لکھے نمبر پڑھ رہا تھا۔

"چار، پانچ، چھ اور سات شکر ہے۔" فرمان نے کلمہ شکر ادا کیا۔ ادھ کھلے دروازے پہ ہلکی سی لات ماری ہاتھ تو خالی ہی نہیں تھے، کھلے دروازے سے اندر داخل ہو کر پہلے ہی سیکنڈ میں ادھر ادھر دیکھے بغیر اپنا سارا بوجھ نیچے فرش پہ بچھے قالین پہ پٹخا اور خود ان پہ ڈھیر ہو گیا۔ اور اگلے چند سیکنڈوں میں اس نے اپنے آس پاس نسوانی آوازیں سنیں، آوازیں کیا تھیں، خطرے کے الارم۔

"اے کون ہو تم؟ نظر نہیں آ رہا، کمرہ فل ہے، لا کر اپنا کباڑ ڈھیر کر دیا، ارے کوئی ہے؟ اس بدمعاش کو باہر نکالو۔"

عطیہ پھپھو، شہلا اور انیلا باجیاں، شروع ہو گئیں اور بیلا کھڑکی سے اپنا رخ موڑ کر صورت حال دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش میں آنکھیں جھپک رہی تھی۔

"میں بدمعاش نہیں ہوں اور نہ ہی یہ سامان کباڑ ہے، منیجر نے کہا تھا کہ یہ "فل" کمرہ ابھی خالی ہو رہا ہے۔"

فرمان نے بہت ترخ کر ترکی بہ ترکی جواب دیا تھا۔

ایک تو دونوں بھیا صاحبان سامان اس کے حوالے کر کے خود نہ جانے کہاں نکل گئے۔ بلکہ ایک ایک بیگ اور شاپر وغیرہ لے کر وہ بھی تو کمرے کی طرف ہی آ رہے تھے پھر کہاں نکل گئے؟" فرمان کو سوچ کر ہی غصہ آیا، اوپر سے یہ خواتین۔

"دیکھیے آنٹی! آپ شور مت کریں، جا کر منیجر سے بات کریں یا روم خالی کریں۔"

"کیا...... یہ آنٹی کسے کہا ہے؟" عطیہ پھپھو کے ساتھ ساتھ شہلا اور انیلا نے بھی اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا تھا۔

"تو پھر کیا کہوں، دادی؟ نانی؟"

"ضروری ہے کوئی رشتہ جوڑنا؟ یہاں سے نکلو اور چلتے پھرتے نظر آؤ۔" فرمان کے اگلے آپشنز پہ تینوں خواتین پھر آگ بگولہ ہو گئیں۔

"میری ہمت نہیں ہے اب اس سارے سامان کو پھر سے اٹھاؤں اور لے کر جاؤں، آپ منیجر کو یہیں بلا لیں۔" فرمان تو اپنے ڈھیر پہ آنکھیں بند کر کے یوں ڈھیر ہو گیا کہ بس ابھی ہی خراٹے لینا شروع کر دے گا۔



"اف کس قدر ڈھیٹ ہے یہ، منیجر کو تو میں بعد میں بلاؤں گی، پہلے پولیس بلانی پڑے گی۔" عطیہ پھپھو نے دانت پیسے۔

"یہاں پولیس بھی ہوتی ہے؟" فرمان کو یقین نہیں آیا۔

"ہاں ہوتی ہے اور تم جیسے لوگوں کے لیے ہی ہوتی ہے، ٹھہرو، تمہارا بندوبست کرتی ہوں۔" شہلا آپا نے انٹرکام اٹھا کر نیچے کاؤنٹر پہ رابطہ کرنا چاہا مگر وہ بالکل ایسے ہی خاموش اور گم صم پڑا تھا جیسے بیلا چپ چاپ اس سارے منظر نامے کو دیکھ رہی تھی۔

"بیلا، ذرا نیچے جا کر منیجر صاحب کو بلانا۔" انہوں نے انٹرکام پٹخ کر بیلا کو حکم دیا۔

"جی اچھا!" بیلا انتہائی تابعداری سے جواب دے کر دروازے کی جانب بڑھی اور عین اسی وقت ادھ کھلا دروازہ پورا ہی کھل گیا اور تحیر میں ڈوبی آوازیں کمرے میں بکھر گئیں۔

"یہ رہا، مل گیا، اوئے تو یہاں کیا کر رہا ہے؟ ہم پاگل ہو گئے تجھے ڈھونڈتے ڈھونڈتے۔"

کمرے میں موجود چاروں صنف نازک کی توجہ اس طرف ہوئی۔ وہ دو تھے، قد کاٹھ اور چہرے مہرے سے فرمان کے مشابہ بس فرق صرف اتنا تھا کہ دونوں کے سروں پہ فرمان جتنے بال بھی نہیں تھے۔ دونوں نے ٹنڈ کروائی ہوئی تھی۔ ہاف آستین کی ٹی شرٹس سے کسرتی بازو جھانک رہے تھے۔

فرمان نے کاہلی سے سر اٹھا کر دروازے کی سمت دیکھا، ایک جماہی لی اور سستی سے گویا ہوا۔

"آپ نے ہی تو بھیجا تھا کہ کمرہ نمبر سات میں جا کر سامان رکھ آؤ۔"

"سات میں نہیں آٹھ میں۔"

"سات کہا تھا۔"

"نہیں آٹھ کہا تھا، اٹھاؤ اب یہ سب اور اپنے روم میں آؤ۔"

"پہلے ہی کان کھلے رکھتے تو یہاں آ کر ہمیں پریشان نہ کرتے۔" شہلا آپا جتائے بغیر نہ رہ سکیں۔

"آپ تو صرف پریشان ہوئی ہیں، میں تو خوار ہو رہا ہوں۔" فرمان نے انتہائی برا منہ بناتے ہوئے نہایت ہی کڑوے لہجے میں جواب دیا اور کھڑا ہو کر بیگز اور تھیلے خود پر لادنے لگا۔

"وی آر ویری سوری لیڈیز، آپ کو ہمارے بھائی کی وجہ سے زحمت ہوئی۔" ارسل نے کمرے میں پھیلے تناؤ اور چہروں پہ موجود برہمی کو نوٹس کیا تو جھٹ سے معذرت کی۔

"شکر ہے۔ آپ کو سوری کہنا آتا ہے، آپ کا بھائی تو اپنی غلطی تسلیم کرنے کے بجائے اور اکڑ دکھا رہا تھا۔" انیلا باجی کی خفگی بھی ذرا دھیمی ہو گئی۔

"ویسے اتنا بدتمیز ہے نہیں یہ، بس اس وقت ذرا تھک گیا ہے اور بھوکا بھی ہے۔"

رومان نے اپنے پیارے بھائی کی سائیڈ لی۔

"تھکن اور بھوک تو ہمیں بھی ہے، ہم نے تو ایسے بیڈ مینرز نہیں دکھائے۔" شہلا آپا نے بھی فرمان کی گوشمالی میں اپنا حصہ ڈالا۔

"تو وہ گڈ مینرز تھے؟ پھر بیڈ مینرز کیا ہوتے ہیں؟"

فرمان نے آنکھیں پھاڑ کر انہیں دیکھا۔ جسے شہلا آپا کی تیز نظروں نے دیکھ لیا اور فوراً ہی ان کی بھنویں تن گئیں۔

"دیکھیے اپنے بھائی کو، کیسے گھور گھور کے مجھے دیکھ رہا ہے، جیسے کچا چبا جائے گا۔" انہوں نے فوراً بھائی لوگ سے شکایت کی۔

"چل مانو یار جلدی کر۔" بھائی لوگ میں سے ایک بھائی نے پہلے شہلا آپا سے معذرت کی پھر چھوٹے بھائی کو مخاطب کیا۔

"مانو؟" بیلا جو بت بنی کھڑی اتنی دیر سے یہ سارا تماشہ بلکہ ڈرامہ دیکھ رہی تھی، ایک دم ہی کھلکھلا اٹھی۔

"یہ تو بلی کا نام ہوتا ہے۔" اس کی زبان پھسلی۔

"جی نہیں۔ بلکہ بلے کا نام بھی ہوتا ہے، جو کہ میں ہوں۔" فرمان نے اس بار کھا جانے والی نظروں

اگرچہ مزید تفریح کا جی چاہ رہا تھا مگر ساتھ ہی عباد کا خیال بھی آ رہا تھا جو سر درد میں بتلا ہوٹل کے کمرے میں اکیلا تھا۔

"پروین کا فون آیا تھا۔ جواب مانگ رہی تھی۔ میں نے تو انکار کردیا۔" چلتے چلتے عطیہ پھپھو نے لاپروائی سے بتایا۔

"کیا؟ اسے بھی انکار کردیا۔ مگر وہ ٹھیک ٹھاک رشتہ تھا پھپھو! جاب بھی اچھی تھی، گھر، گاڑی، فیملی بھی چھوٹی تھی۔"

انیلا باجی نے حیرت اور صدمے سے پھپھو کو دیکھا۔ بیلا بھی شاکڈ تھی اسے امید تھی کہ اس بار تو شہلا آپا کا رشتہ طے ہو ہی جائے گا مگر پھپھو نے حسب سابق ایک بار پھر اچھے رشتے کو بھی ٹھکرا دیا تھا۔

"شکل دیکھی تھی لڑکے کی؟ اتنا گہرا رنگ، تھوڑی سیاہی اور گہری ہو جاتی تو الٹا توا ہی تھا۔ ہماری شہلا کو دیکھو، ماشاءاللہ دودھ ملائی سے بنی، ایسا دولہا تو یوں لگتا جیسے ہنس کے برابر کوا کھڑا ہو۔"

پھپھو ہر رشتے میں اسی طرح مین میخ نکال کر اعتراضات جڑ کر انکار کردیتی تھیں۔ شہلا آپا ان کی ہاں میں ہاں ملاتی تھیں۔ شادی کے معاملے میں بڑی حد تک پھپھو نے ان کا برین واش کیا ہوا تھا۔ اتنا اونچا اور اعلا معیار بنا دیا تھا کہ اچھا بھلا رشتہ بھی نگاہوں میں نہیں جچتا تھا۔

معمولی معمولی باتوں اور معاملات کو جواز بنا کر منع کرنا ان کا وتیرہ بن گیا تھا۔

اس بار بھی کوئی اور جواز نہ ملا تو لڑکے کی رنگت کو نشانہ بنا کر انکار کردیا۔ حالانکہ لڑکا اگرچہ ذرا سانولا تھا مگر بہت پرکشش پرسنالٹی تھی۔ پھر نوکری، گھر، گاڑی، فیملی، سب کچھ ویسا ہی تھا جیسا پھپھو اپنی بھتیجیوں کے لیے ڈیمانڈ کرتی تھیں۔

انیلا باجی کو اس بار کا انکار اچھا نہیں لگا، اعتراض کر بیٹھیں تو پھپھو چڑ گئیں۔

"اے لو، بھئی، مدی ست، گواہ چست، جب تمہاری بہن کو کوئی اعتراض نہیں ہوا اس انکار پہ، تو تمہیں کیوں اتنی فکر ہو رہی ہے۔ اتنی خوب صورت، پڑھی لکھی لڑکی، ایسے ہی آنکھیں بند کرکے ہاں کردوں، کسی کو بھی تھما دوں؟"

"افوہ! میرا یہ مطلب تھوڑی تھا، میں تو......"

"ہاں بھئی، تمہارے لیے کوئی مناسب رشتہ ہوا تو پہلے تمہاری کردیں گے مگر شہلا کی شادی تو میں وہیں کروں گی جہاں میرا دل ٹھکے گا۔"

پھپھو نے بانگ دہل اعلان کیا۔ انیلا باجی بے چاری خاموش ہو گئیں۔ ویسے بے شک وہ مزاج اور زبان کی تیز تھیں مگر پھپھو کے سامنے بولنا آسان نہیں تھا۔ ایک کی دو نہیں بلکہ چار چھ سننی پڑتی تھیں۔

پھر یہ بھی تھا کہ جب شہلا آپا کو ہی کوئی اعتراض اور فکر نہیں تھی نہ ہی اس رشتے سے بھی انکار کا کوئی خاص اثر لیا تھا انہوں نے، تو انہیں یعنی چھوٹی بہن کو کیا ضرورت تھی اپنی ٹانگ یا زبان اڑانے کی؟

بیلا بھی چپ چاپ راستہ طے کر رہی تھی۔ اس کے ہوش سنبھالنے سے اب تک وہ کئی بار یہ معاملہ دیکھ چکی تھی۔ اس کی بھی سمجھ نہیں آتا تھا کہ پھپھو، ہر اچھے بھلے رشتے میں نقص نکال کر کیوں انکار کردیتی تھیں؟

بے شک شہلا آپا بہت خوب صورت تھیں۔ پڑھی لکھی اور قابل مگر کب تک رہنا تھا یہ رنگ روپ وقت بڑی ظالم شے ہے۔ حسین سے حسین چہروں کی آب و تاب ماند کردیتا ہے مگر اس گزرتے وقت سے نہ پھپھو خائف تھیں نہ ہی شہلا آپا خوف زدہ تھیں۔

دراصل عطیہ پھپھو نے بچپن سے ہی ان کی اتنی اتنی...... اتنی تعریفیں کی تھیں اور انہیں بانس پہ بلکہ آسمان پہ چڑھایا تھا اور وہ اب تک آسمان پر ہی براجمان تھیں۔

انیلا اپنی بڑی بہن سے دو ڈھائی سال ہی چھوٹی تھی مگر ان کی نسبت ذرا حقیقت پسند، معاملہ فہم اور سمجھدار۔

ہوٹل میں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جاتے ہوئے انیلا اور بیلا اپنے خیالات میں گم تھیں، پھپھو، شہلا آپا کے ساتھ لگی پڑی تھیں۔ وہی پرانی باتیں۔

"اتنا حسن، اتنی قابلیت، ہنر تو جیون ساتھی بھی تو ایسا ہو کہ رتی ماشے کی بھی کوئی کمی نہ ہو۔"

اور شہلا آپا ہمیشہ کی طرح ان کی ہاں میں ہاں ملا رہی تھیں۔

☆☆☆

کہیں دھوپ، کہیں چھاؤں، جنگل، سبزہ، درخت، پہاڑ اور پہاڑوں پہ سایہ فگن بادل، گھاٹیوں کے اوپر تیرتے بادل غضب کا حسن تھا، موسم اپنے جوبن پر تھا اور وادوں میں ترنگ اپنے عروج پر تھی۔

"یار مانو!" پکوڑا منہ میں رکھتے ہوئے ارسل نے چھوٹے بھائی کو مخاطب کیا اور اس کا منہ بری طرح بن گیا۔

"اللہ کو مانو بھائی، میں ایک جوان جہان لڑکا، اچھا خاصا گبھرو جوان، یہ بلیوں والا نام تو مت رکھیں میرا۔"

"اچھا بھئی گبھرو جوان! یہ جو ہوٹل میں ہمارے پڑوسی ہیں اور جو اس وقت ہم سے ذرا دور بیٹھے چپس کھا رہے ہیں۔ ان کے بارے میں کچھ انفارمیشن تو دے۔"

"کیوں خیریت؟"

"بس یار! خیریت ہی تو نہیں ہے۔" ارسل نے ایک آہ بھرتے ہوئے اپنے دل پہ ہاتھ رکھا۔

"کیا ہوگیا بھائی جان؟" فرمان پکوڑے اور چٹنی میں مرچ کا تناسب کہیں زیادہ پاکر مستقل سی سی بھی کر رہا تھا اور ساتھ ہی بڑے بھائی سے سوال بھی۔

"بس یار لگ گئی دل پہ۔" ارسل نے سینے پہ ہاتھ رکھا۔

"کیا؟"

"ابے یہ لڑکی اور کون؟" ارسل نے سامنے دیکھا۔

"وہاں تو تین لڑکیاں ہیں۔"

"بلو دوپٹے والی۔"

"تینوں کے دوپٹوں میں بلو شیڈ ہیں۔"

"وہ جو آنٹی کے برابر بیٹھی ہے۔"

"دائیں یا بائیں؟"

"رائٹ سائیڈ پہ یار!" ارسل جھنجھلا گیا۔

"اوہ!" فرمان نے نہ جانے کیوں سکون کی ایک گہری سانس لی۔ "آنٹی" یعنی عطیہ پھپھو کے بائیں طرف بیلا بیٹھی تھی۔"

شکر ہے بھائی کے دل پہ یہ لڑکی نہیں لگی۔" فرمان نے بے ساختہ دل ہی دل میں کلمہ شکر ادا کیا اور اگلے ہی لمحے چونک بھی گیا۔

"مگر مجھے اس سے کیا؟" اس نے خود کو ٹٹولا۔

دل بے چارہ عاجزی اور بے بسی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"نہیں بھئی، خدا کے لیے مجھے اس بھول بھلیاں میں نہ پھنسانا۔" فرمان نے خیالوں ہی خیالوں میں دل کے آگے ہاتھ جوڑے۔

"او بھائی! تو کن خیالوں میں کھو گیا سنا، میں نے کیا کہا۔" ارسل کی تیز آواز پر وہ اچھل پڑا۔

"آہستہ بولو بھائی! میں بہرا نہیں ہوں۔"

"بہرے تو نہیں ہو مگر غائب دماغ ضرور ہو میں اتنی دیر سے اتنی اہم بات کر رہا ہوں، تم پتا نہیں کن خیالوں میں گم ہو۔" ارسل اتنا سنجیدہ تھا کہ پکوڑے کھانا بھی فراموش کردیا تھا۔

"بڑے بھائی! آپ بھول رہے ہیں کہ ہر خوب صورت لڑکی کو دیکھ کر آپ اسی طرح سنجیدہ ہو جاتے ہیں۔" رومان نے پلیٹ سے آخری پکوڑا اٹھا کر منہ میں رکھا۔

"اس بار بات الگ ہے یار!"

"یہ بھی آپ ہر بار کہتے ہیں۔" فرمان نے لقمہ دیا۔

"تم لوگ میرے بھائی ہو یا دشمن؟"

"جو آپ بنانا چاہیں۔ اگر آپ ان پکوڑوں، سموسوں اور چائے کا بل ادا کردیں تو ہم آپ کے بھائی ہیں۔ بالکل سگے اور محبت کرنے والے،

”ہاں تو کہہ دیتا، کہہ کر تو دیکھتا۔“ ارسل نے اپنے نکھے اور بزدل بھائی کو گھور کر دیکھا۔ ”ایک کام کہا وہ بھی نہیں کیا۔“

”جی ہاں، کہہ دیتا اور اپنی عزت کا جلوس نکلتے دیکھتا۔“ فرمان بری طرح تپ گیا۔ ”اک تو ابھی تک ناشتہ نہیں کیا، اتنی پیاری ٹھنڈ میں چائے کی طلب اپنی انتہا پر بھی وہ بھی ابھی تک نہیں پی، اوپر سے بھائی جان کی جرح، جیسے وہ الہ دین کے چراغ کا جن ہے۔“

”ابے، تجھے اپنی عزت کی پڑی ہے، میری جان پر بنی ہوئی ہے۔“ ارسل جھنجھلا گیا۔

”بھائی جان! آپ خود ہی بات کر لیں نا۔“ رومان نے مداخلت کی۔

”یہی کرنا پڑے گا، تم دونوں بالکل نکھے بھائی ہو، کسی کام کے نہیں۔“ ارسل نے ہاتھ میں پکڑا پرفیوم جگہ پر رکھا۔

”دراصل ہمارا ایکسپیرینس، آپ کے مقابلے میں نہ ہونے کے برابر ہے اس لیے؟“ رومان نے اپنا گنجا سر کھجایا پھر ٹوپی دوبارہ سر پہ رکھی۔

”مجھے مت بتاؤ، میں کیا جانتا نہیں ہوں، جتنے تم زمین کے اوپر دکھائی دیتے ہو، اس سے کہیں زیادہ زمین کے اندر ہو۔“

”کیا ہم گلیشیر ہیں؟“ بڑے بھائی کے تبصرے پہ فرمان نے سوال کیا۔ مگر ارسل باہر نکلنے کے لیے دروازہ کھول رہا تھا۔ جواب دیے بغیر نکل گیا۔

”بڑے بھائی ناراض ہو گئے؟“ دونوں، ارسل کے پیچھے لپکے۔

☆☆☆

برف بہت ساری گر چکی تھی۔ بہت ساری گر رہی تھی۔ درختوں پہ، جھاڑیوں پہ، سڑکوں پہ، گھروں پہ، ہوٹلوں پہ، گاڑیوں پہ، سب جگہ برف کا راج تھا اور انسانوں کا ہجوم، جن میں سے اکثریت آج پہلی بار یہ نظارہ سچ مچ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی اور اس کا حصہ بنی تھی۔

وہاں موجود نوے فیصد لوگ دیوانے ہو گئے تھے باقی دس فیصد پاگل، ارسل، فرمان اور رومان تینوں بھائیوں کا شمار پاگلوں میں تھا یا دیوانوں میں کچھ اندازہ نہیں ہو رہا تھا، کیونکہ دونوں کی حرکتیں قریب قریب ایک ہی ہوتی ہیں۔

وہ برف پر بھاگ رہے تھے یا بھاگنے کی کوشش کر رہے تھے اور پھسل رہے تھے۔ پھسل پھسل کر گرنے میں ایک دوسرے کو گرا رہے تھے۔ برف کے گولے بنا بنا کر ایک دوسرے کو ہی نہیں پتا نہیں کر کس کو دے مارے اور اگلوں نے بھی برا منائے بغیر جوابی گولے داغ کر حساب برابر کر دیا۔

وہ ہنس رہے تھے، خوشی سے چلا رہے تھے بھاگ رہے تھے، پھسل رہے تھے، ایک دوسرے کو دھکے دے رہے تھے، جان بوجھ کے دھکے کھا رہے تھے اور اسی کھیل کھیل اور تفریح میں جانے کیسے ارسل بری طرح پھسلا تھا کہ سیدھا عباد کے آگے ہی آ کر گرا جو بے چارہ اس افتاد سے خود بھی بوکھلا گیا۔

”اٹھیے، بھائی جان، چوٹ تو نہیں آئی آپ کو“......عباد نے ہوٹل کے پڑوسی کو پہچان لیا تو سہارے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا۔

”تھینک یو یار، تم نے بہت بڑا احسان کیا، میری جان بچائی۔“ ارسل نے ممنونیت سے عباد کے ہاتھ پکڑے تو چھوڑنا ہی بھول گیا۔

”ارے احسان کیسا، آپ تو شرمندہ کر رہے ہیں۔“ عباد بے چارہ سچ مچ شرمندہ ہو گیا۔

”نہیں یار! وہ دیکھ، آگے کتنی گہری کھائی ہے، اگر تم درمیان میں نہ آتے تو سیدھا وہیں لینڈ کرتا۔“ ارسل نے ہاتھ سے آگے کی طرف اشارہ کیا تھا، عباد پہلے حیران پریشان رہ گیا پھر ہنس پڑا۔

”ارے وہ کھائی تو بہت آگے ہے یہاں سے اور پھر وہاں گرل بھی لگی ہوئی ہے۔“ عباد نے اچھی خاصی دور اس کھائی کو دیکھا جس کے گرد گرل لگی ہوئی تھی۔

”برا وقت بتا کر نہیں آتا بھائی! کہیں بھی آ سکتا ہے، تم تو رحمت کا فرشتہ بن گئے میرے لیے۔“ ارسل نے انتہائی جذباتی ہو کر اسے دیکھا اور جھٹ سے پیشکش کی۔

”ناشتہ تو نہیں کیا نا، میرے ساتھ کرنا۔“

”ن......نہیں، بھائی جان...... میں اپنی فیملی کے ساتھ ہوں وہ سب......“

”ارے وہ سب انجوائے کر رہے ہیں، تم تھوڑی دیر ہمارے ساتھ انجوائے کرو۔“

عباد کے نہ نہ کرتے ہوئے بھی ارسل اسے اپنے ساتھ لے گیا، جہاں رومان اور فرمان موجود تھے، ارسل کو عباد کے ساتھ آتے دیکھ کر دونوں کی آنکھیں اور منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔

اور ارسل کی فاتحانہ، چمکتی نگاہیں، دونوں ”نکھے اور بزدل“ بھائیوں کو گھورتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

”دیکھا...... کر دکھایا نا؟ ابتدا ہی سہی، ہوئی تو۔“

☆☆☆

کمرے میں سامان بری طرح پھیلا ہوا بھی تھا اور بکھرا ہوا بھی، انیلا باجی اپنے موبائل میں تصاویر اور ویڈیوز دیکھ رہی تھیں جو مری میں قیام کے دوران بنائی تھیں۔ شہلا آپا اور عطیہ پھپھو چیزیں سمیٹ کر بیگز میں رکھ رہی تھیں ساتھ ساتھ بینا کو ہدایات بھی جاری ہو رہی تھیں۔

”چھوٹی! ذرا میرا فیس واش اٹھانا، وہ...... وہ رہا۔ دوپٹے کے نیچے۔“

”اور یہ میری نیلی شرٹ دینا، اس طرف۔“

”یہ گلاسز میرے پڑے ہوئے ہیں؟ اٹھانا ذرا۔“

”چھوٹی......ی ی؟“

”جی آپا!“ بیلا نے بے چارگی سے انہیں دیکھا۔

”کیا بات ہے، اتنی لیزی کیوں ہو رہی ہو؟“

”بھوک لگ رہی ہے۔“

”چپس ہیں میرے پاس، یہ لو کھا لو، پھر تھوڑی دیر میں چلتے ہیں نا لنچ کے لیے، آخری لنچ مری میں۔“

”اے ہائے اللہ نہ کرے آخری لنچ؟“ عطیہ پھپھو نے جھرجھری لی۔

”ارے بھئی، واپسی سے پہلے آخری لنچ نا۔“ شہلا آپا نے وضاحت کی۔

”چپس سے کچھ بھلا نہیں ہو گا آپا! بڑی زبردست قسم کی بھوک لگ رہی ہے۔“ بیلا نے سفری بیگ میں ان کے کپڑے رکھتے ہوئے کہا۔

”اچھا چلو ابھی چلتے ہیں۔ نیلی، نیلی......“ تین چار آوازوں کے بعد اثر تب ہوا جب انہوں نے انیلا کے ہاتھ سے موبائل اچک لیا۔

”کیا ہے؟“

”لنچ کرنا ہے تو جلدی جلدی پیکنگ کروالو۔“ شہلا آپا نے اس کا موبائل محفوظ مقام یعنی پھپھو کی حفاظتی تحویل میں دے دیا۔

”ہاں بیٹا! جلدی سے یہ ختم کروالو، بھوک تو مجھے بھی لگ رہی ہے۔“ پھپھو کے کہنے پر انیلا منہ بناتے ہوئے چیزیں بیگ میں رکھنے لگی۔

”آپا! تم نے سب کچھ مکس کر دیا۔ ساری چیزیں ایک ساتھ ڈھیر کر دیں۔“

”بس ہو گیا نا، اب چھوڑو، جلدی جلدی ہاتھ چلاؤ۔“ شہلا آپا نے اعتراض کے بجائے کام کا مشورہ دیا۔

”عباد کہاں ہے؟“ پھپھو کو خیال آیا کہ وہ بہت دیر سے غائب تھا۔

”ہو گا کہاں، برابر والے روم میں ان ہی تینوں گنجوں کے ساتھ ہو گا، بڑی جلدی اتنی دوستی ہو گئی ہے۔“ شہلا آپا نے منہ بنا کر کہا۔

”آپا، گنجے تو صرف دو ہیں، ایک کے سر پہ تو بال ہیں۔“ بیلا نے نہ جانے کیوں، ان میں سے ایک کی صفائی پیش کی جو یقیناً فرمان تھا۔

”تو وہ کون سا وحید مراد ہے؟ آدھا گنجا تو ہو ہی چکا ہے۔ کچھ برسوں بعد دیکھنا، یہ بھی ٹنڈ کرا لے گا۔“ آپا نے پیشن گوئی کی۔

”ارے چھوڑو، ہمیں کیا، آج روانگی ہے ہماری

، پھر وہ کہاں، ہم کہاں، برسوں تو دور کی بات، کل پرسوں کا بھی کوئی امکان نہیں ملاقات کا۔"

پھپھو نے دخل در معقولات کی اور بینا کے پیکنگ کرتے ہاتھ ایک لمحے کو رک گئے۔

"کل پرسوں یا برسوں، ملاقات کا کوئی امکان نہیں؟"

چند لمحوں تک وہ سوچ میں گم رہی پھر سر جھٹک کر دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔

قدرت کا اتفاق تھا یا ارسل کی کارستانی، شام میں جس وین سے وہ سب روانہ ہوئے، اس میں ارسل اینڈ برادرز بھی موجود تھے۔

واپسی کے سفر میں دل اداس اور بوجھل بھی تھا اور خوشی و شادمانی کے احساسات سے ہم آہنگ بھی، شہری زندگی کے مسائل، الجھنوں اور مصروفیات میں سے کچھ وقت چرا کر خود کو فریش کرنے آئے تھے اور پُرمسرت یادوں کا خزانہ اپنے ہمراہ لے کر جا رہے تھے۔ مگر کچھ اور بھی تھا جو ہمراہ تھا، ایک کسک، چبھن اور خالی پن کا احساس۔

ارسل کو اپنی کیفیت پہ حیرت تھی، کو ایجوکیشن میں تعلیم حاصل کر کے انجینئر بنا تھا، پچھلے پانچ سال سے ایک ملٹی نیشنل فرم میں نوکری کر رہا تھا۔ ہزاروں لڑکیوں سے اب تک واسطہ پڑ چکا تھا۔ سینکڑوں لڑکیوں کو جانتا تھا۔ رشتے داروں میں، کلاس فیلوز، کولیگز کے ہجوم میں، کسی لڑکی کو دیکھ کر ایسا نہیں ہوا کہ بس وہیں ٹھہرنے کو جی چاہے، دل اسی پر بس کر دے۔ اس سے زیادہ حسین اور طرح دار لڑکیاں زندگی میں ملیں۔ مگر پتا نہیں کیا بات ہوتی ہے جو اس طرح کی واردات ہوتی ہے؟ سوچتے سوچتے ارسل مسکرا دیا۔ اور عین اسی لمحے شہلا کی نظر اس پر پڑی۔

"پاگل ہے یہ لڑکا، ایویں بیٹھے بیٹھے مسکرا رہا ہے؟"

اس نے حیرت سے ارسل کو دیکھا جو اب سن گلاسز پہن رہا تھا واقعی کریک ہے، رات ہونے کو ہے، اس وقت سن گلاسز کون پہنتا ہے؟

شہلا کو پھر خیال آیا اور اسے معلوم نہیں تھا یہ ڈارک گلاسز کسی بھی وقت پہنے جائیں، ان کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ ان کے پیچھے چھپی آنکھوں کے بارے میں علم نہیں ہوتا کہ کہاں ہیں؟ کسے دیکھ رہی ہیں؟ کس پر مرکوز ہیں اور کسے اپنی گرفت میں لیا ہوا ہے؟ سو جس وقت شہلا اپنے دل میں اسے پاگل اور کریک کے القابات سے نواز رہی تھی۔ اسے علم نہیں تھا کہ گلاسز کے پیچھے چھپی آنکھیں اسے ہی دیکھ رہی ہیں اور دیکھ دیکھ کر آہیں بھر رہی ہیں۔

☆☆☆

سفر ختم ہو گیا۔ اپنے گھر پہنچ کر وہی مصروفیات، معاملات شروع ہو گئے، دن رات کا پہیہ پہلے کی طرح گھومنے لگا مگر ابھی سب کی زبانوں پہ، باتوں میں اس سفر اور تفریح کا احوال تھا۔ تینوں بہنیں مل بیٹھتیں تو بے شمار یادوں اور باتوں کی پٹاری کھل جاتی اور تینوں کے قل قل کرتے قہقہے فضا میں بکھر جاتے۔ اس روز بھی وہ تینوں چپس ٹونگتے ہوئے ان خوب صورت مناظر اور سہانی یادوں کو دہرا رہی تھی، اچانک ہی انیلا کو کچھ یاد آیا۔

"آپا! وہ تجھے یاد ہیں باڈی بلڈر، جہاں جہاں ہم جاتے تھے وہیں پہنچ جاتے تھے، عباد سے بڑی دوستی گانٹھ لی تھی۔"

"سفر میں تو ایسی دوستیاں اور شناسائیاں ہو ہی جاتی ہیں بعد میں کون یاد رکھتا ہے۔"

شہلا نے عام سے لہجے میں کہا اور ان میں سے کسی کو معلوم تھا نہ ہی اندازہ کہ عباد سے ہونے والی دوستی اور شناسائی کس مرحلے میں داخل ہو گئی ہے اور ان کی معلومات میں یہ اضافہ فقط پانچ منٹ بعد ہی ہو گیا جب عباد لاؤنج میں آیا۔

"ڈرائنگ روم میں میرے دوست بیٹھے ہیں۔ فریج میں کولڈ ڈرنک رکھی ہے۔ جاؤ چھوٹی گلاسوں میں نکال دو۔"

عباد کے دوست آتے ہی رہتے تھے۔ پورا محلّہ، رشتے دار علاقہ، آدھا شہر، اس کا دوستی کا دائرہ بہت وسیع تھا۔

دوست آتے رہتے تھے، کولڈ ڈرنک، شربت، چائے وغیرہ پی کر رخصت ہو جاتے تھے۔ مگر یہ کچھ خاص اور انوکھے دوست تھے، جن کے لیے وہ فاسٹ سموسے، گلاب جامن اور نمکو پیٹیز وغیرہ لے کر آیا تھا۔

کچن میں چیزیں پلیٹوں میں نکالتے ہوئے بیلا کی سماعتوں میں جانی پہچانی آوازیں آئیں اور پھر ایک مانوس قہقہہ، وہ چونک پڑی۔

کچھ دیر تک وہ ان آوازوں کو سنتی رہی اور پھر جب اسے یقین ہو گیا کہ جو کچھ وہ سمجھ رہی ہے وہ حقیقت ہے تو بیلا کا دل یکا یک ہی خوشی سے بھر گیا۔ ابھی اس خوشی کی بارش میں پوری طرح بھیگی بھی نہ تھی کہ عطیہ پھپھو اندر آئیں۔

"دیکھا تم نے؟ وہ لڑکے یہاں گھر تک پہنچ گئے۔" انہوں نے بیلا سے مخاطب ہو کر ایک کڑی نگاہ اشیائے خوردونوش پر ڈالی۔

"کون لڑکے پھپھو؟" بیلا معصومیت سے سوال کرتے ہوئے انجان بنی۔

"ارے وہی، جن کا ابھی ذکر ہو رہا تھا، "گنجے پہلوان" نام لیا اور شیطان کی طرح حاضر، مجھے تو دال میں کچھ کالا لگ رہا ہے۔ اتنی دوستی گانٹھ لی عباد سے، وہ بچہ تو ہے ہی سیدھا سادا معصوم، دو میٹھے بولوں کے آگے پگھل کر ڈھیر ہو جاتا ہے۔"

پھپھو نے اپنے اندیشے بیان کیے جو بیلا کو کچھ خاص نہیں بھائے۔

"عباد کی دوستی تو آدھے شہر کے لڑکوں سے ہے، ایسی کیا خاص بات ہے؟" بظاہر لاپروائی سے اس نے نہ جانے کس کی صفائی پیش کی تھی، عباد کی یا اس کے دوستوں کی۔

"تم نہیں جانتیں ان لڑکوں کو، کیسے لوفر ہوتے ہیں۔" پھپھو نے دانت کچکچا کے فتویٰ جاری کیا۔

"سارے؟ مگر ہمارا بھائی بھی تو ایک لڑکا ہے۔"

پھپھو نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ عباد اندر آ گیا۔

"سب ریڈی ہے، لے جاؤں؟"

"ہاں، یہ لو۔" بیلا نے اسے ٹرے پکڑائی۔

"یہ وہی لڑکے ہیں نا مری والے؟ یہ یہاں کیسے پہنچ گئے؟" پھپھو نے عباد سے تفتیش شروع کی۔

"پھپھو! یہ لوگ اپنا جم چلاتے ہیں، ہمارے علاقے میں نئی برانچ کھولی ہے، پارٹ ٹائم جاب بھی کر رہا ہوں میں وہاں اور باڈی بلڈنگ بھی کرتا ہوں، ڈسکاؤنٹ دیا ہوا ہے مجھے۔"

"اندر ہی اندر اتنی ساری کہانی شروع ہو کر آدھی بھی ہو گئی۔ یہاں کسی کو خبر ہی نہیں؟" بیلا نے دل ہی دل میں سوچا۔

"اور کوئی علاقہ نہیں ملا انہیں نئی برانچ کے لیے اور پارٹ ٹائم جاب کے لیے بھی تم ہی ٹکرائے؟" پھپھو نے سخت لہجے میں سوال کیا۔

"افوہ اپو جانی! جاب کے لیے میں نے خود کہا تھا۔ اچھا ہے، چار پیسے ہاتھ میں آئیں گے۔ مصروفیت بھی ہو جائے گی۔" عباد نے وضاحت کرتے ہوئے ٹرے پکڑی اور باہر نکل گیا۔

"یہ لڑکا ضرور کوئی گل کھلائے گا۔" پھپھو نے پیشن گوئی کی اور اگلے ہفتے ہی ان کی پیشن گوئی پوری ہو گئی۔

☆☆☆

"نائنٹی ایٹ، نائنٹی نائن اینڈ ہنڈریڈ۔" پُش اپس کرتے ہوئے ارسل سیدھا ہوا۔ رومان ابھی تک لگا پڑا تھا۔ فرمان صوفے پہ آڑا ترچھا پڑا موبائل دیکھ رہا تھا۔

"اوئے، موبائل کا پیچھا چھوڑ، پُش اپس نکال ورنہ توند نکل آئے گی۔" بڑے بھائی نے فرمان کے ہاتھ سے موبائل اُچکا۔

"بھائی جان! ابھی کچن میں امی کے ساتھ کام کروا کے اپنا تیل نکال کے آیا ہوں، ہو گئی میری ورزش، میرا موبائل دے دیں۔"

"یار! تیرے بال کتنے کم ہوتے جا رہے ہیں، تو گنجا کیوں نہیں ہو جاتا؟" ارسل نے موبائل دینے کے بجائے مشورہ دیا، وہ بھی مفت، جسے لاؤنج میں داخل ہوتے ہوئے امی جان نے سن لیا۔

"خبردار! جو اسے سکھانے پڑھانے کی کوشش کی، خود تو ٹنڈ کرا کے پھرتے ہی ہیں۔ اب چھوٹے کی حجامت پہ بھی تل گئے۔"

"حجامت نہیں امی، ٹنڈ کرانے کا مشورہ دیا ہے۔ چار بال رہ گئے ہیں سر پر، بلاوجہ کنگھا کرنے کا تکلف کرتا ہے! شیمپو کا خرچا بھی بچے گا۔"

ارسل بھائی جان ہرگز بھی چھوٹے بھائی کا مذاق نہیں بنا رہے تھے بلکہ بہت خلوص اور دل سے مشورہ دے رہے تھے۔ مگر امی جان طیش میں آ گئیں۔

"تم دونوں جو استرا پھروا لیتے ہو تو بڑا کارنامہ کرتے ہو، مصیبت تو مجھے اٹھانی پڑ رہی ہے، کوئی لڑکی نہیں مل رہی شادی کے لیے، درجنوں رشتے دیکھ چکی ہوں، کہیں گھر والے انکار کر دیتے ہیں کہیں لڑکی خود منہ پھاڑ کے منع کر دیتی ہے۔ دنیا جہان کے لوگ نقلی بال لگواتے ہیں، وگ لگواتے ہیں۔ تم نے تو رہی سہی کھیتی بھی گنوا دی۔ بالکل ہی صفایا کر کے بیٹھ گئے۔" امی نے کئی بار کا دیا ہوا لیکچر ایک بار پھر دیا۔

"او مام، ناٹ اگین، اپنے بیٹوں کو غور سے دیکھیں، ایسی پرسنالٹی ہالی وڈ ہیروز کی ہوتی ہے۔"

ارسل نے صوفے اور میز کی مدد سے ایکسرسائز شروع کی اور اس کے ساتھ ہی امی ایک بار پھر شروع ہو گئیں۔

"ہم ہالی وڈ میں نہیں رہتے، پاکستان ہے یہ، وحید مراد نہ سہی محمد علی والا ہیئر اسٹائل تو ہو۔" امی صوفے پہ ایک طرف ٹک گئیں۔

"ایٹیس سوستر کی میری معصوم امی! یہ سب سے ماڈرن اور اسٹائلش ہیئر اسٹائل ہے، گوریاں تو مرتی ہیں اس لک پہ......" ارسل نے دعوا کیا۔

"یہاں کی گوریاں نہیں مرتیں بیٹا! اس لک پر، جب تک سر پہ ٹھیک ٹھاک جھاڑ نہ ہو، بندے کی پرسنالٹی نہیں بنتی۔" امی نے کبھی بھی کم از کم اس معاملے میں بیٹوں سے اتفاق نہیں کیا تھا۔

"اگر آپ کی سوچ بدل جائے نا امی، تو لڑکیوں کی بھی سوچ بدل جائے۔"

"بات میری سوچ کی نہیں، دوسروں کے خیالات کی ہے۔ ابھی ہمارے معاشرے میں گنجے دولہا مجبوری میں تو قبول کر لیے جاتے ہیں مگر خوشی خوشی نہیں۔"

امی اپنی بات پر ڈٹی ہوئی تھیں اور یہ بحث کوئی آج نئی نہیں تھی۔ آئے دن ماں بیٹوں میں مکالمہ ہوتا اور بغیر کسی نتیجے کے ختم ہو جاتا، دونوں ہی فریق اپنی رائے سے ہٹنے پر تیار نہیں تھے۔ رہے لڑکوں کے والد صاحب تو وہ بیگم کو، بیٹوں کو دونوں کو ہی خوش رکھنے میں ماہر تھے بیگم کے سامنے ان کی حمایت اور بیٹوں کو الگ سے تھپکیاں دیتے۔

"اچھا بتاؤ اس بحث کو، یہ بتاؤ، وہاں کب جانا ہے، وہ اس لڑکی کے، کیا نام ہے؟" امی نے ذہن پہ زور ڈالا۔

"بیلا، شہلا۔" فرمان کے منہ سے بے ساختہ نکلا تھا، سب چونک پڑے۔

"کیا مطلب؟ کیا تم بھی لائن میں کھڑے ہو؟"

"نن، نہیں تو، میرا مطلب تھا کہ بیلا کی بہن شہلا۔" فرمان نے جھٹ بات بنائی۔

"اگلے ہفتے کو چلیں؟"

"اس ہفتے کو کیوں نہیں؟"

"پرسوں؟ چلو، چلتے ہیں۔" امی نے گرین سگنل دیا۔ ویسے بھی اپنی من مانی کرنے والی یا اپنی ہی مرضی چلانے والی ماں تو وہ پہلے بھی نہیں تھیں، اب جب کہ کئی بار بیٹے کی ٹنڈ کی وجہ سے وہ ریجیکٹ ہو چکا تھا۔ وہ بس یہ چاہ رہی تھیں کہ کسی بھی اچھی لڑکی سے رشتہ ہو جائے اور یہ بے تھے بیل کسی کھونٹے سے بندھ جائیں۔ رومان کے لیے خاندان میں لڑکی دیکھ رکھی تھی۔ ارسل کی ہو جائے تو باقاعدہ رشتہ رومان کا بھی دے دیں۔

"اللہ کرے، یہاں تو بات بن ہی جائے۔" انہوں نے دل ہی دل میں دعا کی۔

"اتنے اچھے بیٹے ہیں، ذرا کھلنڈرے ہیں مگر خوش مزاج اور احساس کرنے والے، گھر کے کاموں میں بھی ہاتھ بٹاتے ہیں، کوئی برائی عیب نہیں مگر لوگ یہ سب کہاں دیکھتے ہیں؟ گھر، کمائی، نوکری، گاڑی کے ساتھ ساتھ لڑکے کے سر پہ مناسب کھیتی ہو تو بھی دیکھی جاتی ہے۔" میز پہ کھانا لگاتے ہوئے بیٹوں کو دیکھ کر انہوں نے ایک آہ بھری۔

"بھلا لڑکے کو اور اس کے گھر والوں کو ہی حق تھوڑی ہے نخرے دکھانے کا، لڑکی کا اور اس کی فیملی کا بھی کچھ نخرا تو بنتا ہے تبدیلی ایسے ہی آئے گی۔"

☆☆☆

عباد کو اندازہ تھا کہ اس کی بات سن کر کیا ری ایکشن ہو سکتا ہے مگر اس سے جو کہا گیا تھا، اسے کہنا ہی تھا سو کہہ دیا اور حسب توقع جملہ حاضرین جو پھپھو، شہلا اور انیلا پر مشتمل تھے، اچھل ہی پڑے۔

"ان لفنگوں کی یہ جرات؟ گھر تک پہنچ گئے، اب رشتہ لا رہے ہیں؟" پھپھو نے دانت کچکچائے۔

"خیر اپو، وہ لفنگے تو نہیں ہیں، اچھے خاصے ڈیسنٹ قسم کے لڑکے ہیں اور عزت سے رشتے کی بات کر رہے ہیں تو شریف ہی ہوئے۔" انیلا نے آنے سے پہلے ہی رشتے کی حمایت میں بیان داغ دیا اور اپو سے ڈانٹ سنی۔

"تم چپ رہو، تمہارا کیا کام ہے بیچ میں بولنے کا؟ اور تم، تم نے کچھ کہا نہیں اپنے دوستوں کو۔" ان کی توپوں کا رخ عباد کی طرف ہوا۔

"میں نے پہلے ہی انہیں وارن کر دیا تھا کہ ہماری اپو ہر پرپوزل ریجیکٹ کر دیتی ہیں، آپ سے اچھے اچھے لوگ ریجیکٹ ہو چکے ہیں۔ تو آپ کس کھیت کی مولی ہیں، مگر ان کی امی نے خود بات کی مجھ سے تو میں نے کہہ دیا کہ اپنا شوق پورا کر لیں مگر جواب میں انکار ہی ملے گا۔"

عباد نے بہت سادگی اور روانی سے سچائی بیان کی تھی اور اس کی باتیں سن کر پھپھو کے چہرے پہ ایک رنگ آیا اور ایک گیا۔

"تمہارا مطلب ہے، میں جان بوجھ کر ہر رشتے کو منع کر دیتی ہوں۔ میں نہیں چاہتی کہ تم لوگوں کی شادیاں ہوں، تمہارے گھر آباد ہوں؟" عطیہ اپو اک دم ہی تڑخ تڑخ گئیں۔

"میرا یہ مطلب نہیں تھا، آپ تو بلاوجہ ہی ہائپر ہو رہی ہیں۔"

عباد سراسیمہ ہو کر باہر نکل گیا۔ مگر انیلا سوچ میں پڑ گئی اور اس کے ساتھ ساتھ شہلا بھی، پھپھو کا لہجہ اور رویہ عجیب تھا جیسے عباد نے اپو کی کسی دکھتی رگ پہ ہاتھ رکھ دیا ہو۔ بے شک انجانے میں ہی سہی۔

☆☆☆

اگلی شام کم از کم مہمانوں کے لیے تو بے حد سہانی اور یادگار تھی۔ چاہے میزبانوں کے لیے ہو نہ ہو۔

ڈرائنگ روم میں ارسل کی امی اور فرمان موجود تھے۔ امی اپنی بے ساختہ سادگی اور بے تکلفی سے محو گفتگو تھیں۔ عطیہ پھپھو کا انداز رکھائی کی حد تک لیا دیا سا تھا۔

امی کے بار بار اصرار کے بعد انہوں نے شہلا آپا کو اندر بلایا تھا اور کچھ دیر بعد انیلا اپنے ساتھ بیلا کو بھی وہیں گھسیٹ لائی تھی۔

دونوں نے پھپھو کی ناگواری اور عدم دلچسپی کے باوجود چھولے، دہی بھلوں کی چاٹ بنالی تھی۔ سموسے، نگٹس اور کچھ پھل بازار سے منگوا لیے تھے اور مینگو شیک بنایا تھا۔

یہ سارا اہتمام اور ڈرائنگ روم میں ان کی آمد پر پھپھو جز بز ہو رہی تھیں۔ مگر انیلا ان کی پیشانی کے بلوں کی پرواہ کیے بغیر امی جان سے محو گفتگو تھی۔ جنہیں چھولوں کی چاٹ کے ساتھ کیری اور گڑ کی کھٹی میٹھی چٹنی بہت پسند آئی تھی جس میں ادرک اور کشمش بھی

ڈالی ہوئی تھی۔

"میں بھی ایسی چٹنی بناتی ہوں، بہت مزے کی بھی ہوتی ہے اور ہاضمہ بھی کرتی ہے۔" امی نے بہت مسرور ہو کر میزبان کے ساتھ اپنی بھی تعریف کی۔

"کیا یہ تم نے بنائی ہے؟" انہوں نے شہلا کو مخاطب کیا۔

"میں اسے چولہے کے سامنے کھڑا نہیں کرتی، اتنے خوب صورت ہاتھ پیر ہیں، خراب ہو جائیں گے۔" شہلا کے کچھ کہنے سے قبل پھپھو نے ٹکڑا توڑ جواب دیا۔

"کوئی بات نہیں۔ ہمارے ہاں تو ملازمہ ہے، میری طبیعت خراب ہو تو کھانا وہی بناتی ہے، یا یہ لڑکے بھی اچھی خاصی کوکنگ کر لیتے ہیں۔"

امی جان ان کے رویے اور سخت لہجے کا نوٹس لیے بغیر اپنی مخصوص سادگی سے باتیں کرتی رہیں اور انہوں نے باتوں باتوں میں تینوں لڑکیوں کو بال لمبے اور گھنے کرنے اور جلد کی حفاظت کے کئی ٹوٹکے بھی بتا دیے، جب بیلا نے ان کی لمبی اور موٹی چٹیا کی تعریف کی تو وہ لڑکیوں کی طرح شرما گئیں، انہوں نے سرسوں کے تیل میں دیسی انڈوں کی زردی پکا کر تیل بنانے کا نسخہ بتایا اور ساتھ میں پیش کش بھی کی۔

"میرے پاس تیل بنا ہوا رکھا ہے، میں بھجوا دوں گی، لگا کر دیکھنا، بہت فرق پڑتا ہے بالوں میں۔"

"ہاں یا، میرے بال اتنے ہلکے ہو گئے ہیں۔" انیلا بڑی متفکر تھی۔

"اور بیلا کو پلکیں لمبی اور گھنی کرنے کا بہت شوق ہے۔ کیسٹر آئل بھی استعمال کیا اور زیتون کا تیل بھی، مگر وہ رزلٹ نہیں آیا، جو یہ چاہتی ہے۔"

انیلا بی بی نے بیلا کا سیکریٹ آؤٹ کیا اور فرمان کی بے ساختہ مسکراہٹ کھوں، کھوں کی شکل میں خارج ہوئی۔ انیلا نے بہن کی ماری ہوئی کہنی کا کوئی خاص نوٹس نہیں لیا۔

ادھر امی جان بیلا کو غور سے دیکھتے ہوئے فرما رہی تھیں۔

"ماشاءاللہ تمہاری تو اتنی پیاری آنکھیں ہیں پلکیں بھی خوب گھنی ہیں۔ بلکہ تم تینوں بہنوں کی آنکھیں ماشاء اللہ بہت خوب صورت ہیں۔ بالکل اپنی پھپھو پر گئی ہیں اور شہلا تو پوری آپ کی ہی بنی بنائی کاپی ہے۔" امی نے بے تکلفی سے عطیہ پھپھو کو مخاطب کیا۔

"آں......ہاں شاید۔" پھپھو گڑبڑا سی گئیں۔

امی جان کی میٹھی زبان نے انہیں ڈھیر بلکہ چاروں شانے چت کر دیا تھا، مگر امی کی خوش اخلاقی، سادگی، بے تکلفی اور میٹھی میٹھی باتیں کچھ کام نہ آئیں۔

ساس بے شک وہ بہت اچھی بنتیں مگر ان سے پہلے بیٹا یعنی کہ مستقبل کا دولہا اور گنجا؟ کیسا عجیب لگتا اس سر پہ سہرا باندھ کر آئے گا؟ اور شہلا کے ساتھ کیسا بے تکا سا جوڑ لگے گا؟ لوگ کیا کہیں گے؟ سب مذاق اڑائیں گے کہ مجھے اپنی بھتیجی کے لیے کوئی لڑکا ہی نہیں ملا۔

پھپھو نے حسب امید صاف انکار کر دیا۔

"سوچ لیں پھپھو! اچھی فیملی ہے، ارسل بھی اچھا خاصا معقول ہے پھر اتنی محبت سے رشتہ دیا ہے۔"

انیلا اپنی بہن کی نسبت زیرک تھی، کچھ سمجھ دار اور حساس بھی، اس نے تو اپنی شہلا آپا کو بھی سمجھانے کی کوشش کی جو پھپھو کی آنکھوں سے دنیا کو دیکھتی اور سمجھتی تھیں اور ان ہی کی زبان بولتی تھیں، ان ہی کے خیالات اور افکار کو اہمیت دیتی تھیں۔ پھپھو کی رائے اہم تھی، ان کی مرضی کو اولیت تھی۔

انیلا نے چھت کی منڈیر کے قریب کھڑے ہو کر دور تک جگمگاتی روشنیوں کو دیکھا، چہرے کو چھو چھو کے گزرتی ہوا کو محسوس کیا اور اپنی بہن کو دیکھا۔

"عزت اور محبت کے ساتھ آنے والوں کو ٹھکرانا دانش مندی نہیں ہے۔"

"مگر وہ بالکل ہی گنجا ہے۔" شہلا کی بے بسی اپنے عروج پر تھی، "وہ میرے ساتھ بالکل بھی اچھا نہیں لگے گا۔ بہت عجیب سی جوڑی ہوگی ہماری۔"

شہلا کے منہ میں اپو کی زبان اور الفاظ فٹ تھے وہی نکل رہے تھے۔

"اپنا دماغ اور عقل بھی کبھی استعمال کر لیا کرو آپا!" انیلا چڑ گئی۔

"اوہ، تمہیں کیوں اتنی فکر ہو رہی ہے، جو اپو کو پسند آئے گا، اسی کے لیے ہاں کر دوں گی۔" شہلا نے اپنی بھوری آنکھوں سے بہن کو دیکھا اور رسان سے کہا۔

"اور مجھے نہیں لگتا کہ انہیں کوئی پسند آئے گا۔" انیلا بڑبڑائی، عین اسی لمحے بجلی چلی گئی دور تک جگمگاتی روشنیاں یکدم اندھیرے کا حصہ بن گئیں۔

"وقت ایسے ہی ہاتھوں سے نکل جاتا ہے۔ پتا بھی نہیں چلتا۔ ستارہ حسن کا ہو یا جوانی کا، وقت بہت ظالم بہت بے رحم ہوتا ہے کسی کو نہیں بخشتا، ہر ستارے، ہر روشنی کو بجھا دیتا ہے، ماند کر دیتا ہے۔" انیلا فلاسفر بن گئی۔

"تمہیں ہوا کیا ہے؟" شہلا نے حیران ہو کر اسے دیکھا۔

"مجھے کچھ عجیب سا محسوس ہوتا ہے جسے میں بیان نہیں کر سکتی یا کرنا نہیں چاہتی۔"

انیلا کھوئے کھوئے لہجے میں سامنے دیکھتے ہوئے بول رہی تھی، جہاں روشنیاں بجھ جانے کے بعد آسمان کی چادر پہ جگمگاتے ستارے زیادہ روشن اور زیادہ واضح ہو گئے تھے۔

"تمہیں یہ فکر ہو گئی ہے کہ بڑے ماموں سہیل کا جو پروپوزل تمہارے لیے بھجوا رہے ہیں، اپو کہیں اسے بھی انکار نہ کر دیں۔ بے فکر رہو وہ سہیل کو بھی انکار نہیں کریں گی۔ وہ تو ہمارے اپنے ہیں۔" شہلا کی مسکراہٹ اس کے چہرے کی طرف شفاف اور اس کے دل کی مانند بے ریا تھی۔

"سہیل بھی ریجیکٹ ہو جائے گا۔" انیلا کا لہجہ یقین سے بھرپور تھا۔ شہلا کی حیرانی دوچند ہو گئی۔

"پاگل ہو تم۔"

"ہاں، شاید، کیونکہ پاگل وہ کچھ دیکھ اور سمجھ لیتے ہیں جو ہوش مندوں کو دکھائی نہیں دیتا اور سجھائی نہیں دیتا۔"

☆☆☆

اور انیلا نے بالکل ٹھیک پیش گوئی کی تھی۔

بڑے ماموں اور ممانی آئے تھے، انیلا کے لیے سہیل کا رشتہ لے کر اور عطیہ پھپھو کی بڑبڑاہٹ اور ناگواری اپنے عروج پر تھی۔

ویسے تو کبھی بھانجیوں کو پلٹ کر نہیں پوچھا، کہاں ہیں، کس حال میں ہیں، اب آ گئے بہو بنانے کے لیے، مفت کی نوکرانی چاہیے ہوگی۔"

پھپھو نے دروغ گوئی اور مبالغہ آرائی سے کام لیا تھا، ورنہ ماموں ان بچوں سے اتنے لاپرواہ اور بے حس کبھی نہیں ہوئے کہ خیر خبر ہی نہ رکھی ہو۔ پھپھو کی سرد مہری اور بے گانگی کی وجہ سے ان کا آنا ذرا کم تھا مگر ویسے وہ بہت خیال کرتے تھے۔ مگر عطیہ پھپھو نے سہیل کے لیے بھی انہیں ٹکا سا جواب دے دیا۔

"اپو آخر چاہتی کیا ہیں؟" بیلا بھی بول اٹھی بلکہ چھلک پڑی۔

"وہ چاہتی ہیں کہ جن خوشیوں سے وہ محروم رہی ہیں، ہم بھی ان سے محروم رہیں۔" انیلا نے آج پہلی بار اپنے خدشات کو زبان دی تھی۔

"فضول باتیں مت کرو اپو ہم بہت محبت کرتی ہیں اسی لیے، انہیں کوئی، ہمارے قابل نہیں لگتا۔" شہلا نے بہن کو گھرکا۔

"کاش کہ آپ کی خوش فہمیاں اور خوش گمانیاں سچ ہوں۔" انیلا نے باری باری دونوں بہنوں کو دیکھا۔

بیلا اگرچہ دونوں سے چھوٹی تھی مگر دھیرے دھیرے ادراک اور شعور کی چند سیڑھیاں وہ بھی چڑھ گئی تھی۔ بس ایک شہلا تھی جس کی آنکھوں پہ ابھی

تک پٹی بندھی ہوئی تھی۔

☆☆☆

موسم بدل رہا تھا۔ آوارہ خشک، زرد پتے قدموں تلے بکھرے چرمرا رہے تھے۔ عجیب سی اداسی چھائی ہوئی تھی۔ پتا نہیں موسم کے اثرات تھے یا خیالات کے دل و دماغ پہ عجیب سی دھند چھائی ہوئی تھی۔

شہلا نے موبائل اسکرین اسکرول کرتے کرتے بے زار ہو کر اسے بند کیا اور ایک طرف ڈال دیا۔ یاسیت نے ہر طرف ڈیرے ڈالے ہوئے تھے۔

''ارے آپ تو ایسے ہی بیٹھی ہیں ابھی تک، چلنا نہیں ہے کیا؟'' بیلا نے آ کر کمرے میں جھانکا۔

''تم لوگ چلی جاؤ، میرا موڈ نہیں ہے۔'' شہلا نے پہلوتہی کی کوشش کی۔

''ہم اکیلے نہیں جا رہے، آپ چلیں گی تو جائیں گے، ورنہ نہیں۔'' بیلا اندر آ گئی۔

''گھر سے نکلیں گی تو موڈ بھی صحیح ہو جائے گا بلکہ اچھا ہو جائے گا'' بیلا نے اصرار کیا۔

''اچھا، چلو، میں آ رہی ہوں۔'' شہلا بے دلی سے کھڑی ہوئی۔

آج انہیں خریداری کے لیے بازار جانا تھا۔ اپنی اور گھر کی کچھ ضروری خریداری کرنی تھی۔

بازار میں ایک کے بعد ایک دکان، انیلا اور بیلا جانے کیا چھانٹ رہی تھیں۔ اللہ اللہ کر کے خریداری تمام ہوئی تو کچھ کھانے پینے کے لیے ریسٹورنٹ میں بیٹھک لگائی اور تب ہی وہ آ کر بیٹھا تھا، سلام کر کے بڑی شرافت سے سامنے کرسی پر نظریں جھکائے بیٹھا تھا۔

''یہ کیا؟'' شہلا جزبز ہونے لگی۔

''آپ سے ضروری بات کرنی تھی اس لیے، ویسے میں عباد سے پوچھ کر آیا ہوں۔ اس کے علم میں ہے۔''

ارسل کا لب و لہجہ شائستہ اور دھیما تھا۔ شہلا متاثر ہونے لگی۔ وہ سر پہ کیپ لگائے ہوئے تھا جینز اور شرٹ میں دراز قد اور کسرتی جسم بہت پرکشش لگ رہا تھا۔ پھر اس کی آنکھوں سے چھلکتی تہذیب اور عزت۔ ہنس مکھ اور کھلنڈرا ارسل اس وقت بہت سنجیدہ لگ رہا تھا۔

وہ شہلا کو امپریس کرنے نہیں بلکہ قائل کرنے آیا تھا۔ بیلا اور انیلا اٹھ کر نزدیکی میز پر چلی گئیں۔

''جلدی جلدی بولیں۔'' شہلا کو یہ سب بہت آکورڈ لگ رہا تھا۔

''انکار کا سبب جاننا چاہتا ہوں۔'' بغیر کسی تمہید وہ سید ھا مدعا پر آیا۔

''پھپھو کی مرضی۔'' شہلا نے مختصر جواب سے ٹالنے کی کوشش کی۔

''اور آپ کی مرضی کیا ہے؟''

''جو پھپھو کی ہے۔''

''اچھا تو پھپھو کے انکار کی وجہ؟''

''آپ کو پتا تو ہے۔'' پیشانی پہ بل ڈال کر اس نے تیور دکھائے۔ انجینئر ہے یا وکیل؟ اتنی جرح؟

''مجھے تو یہ علم ہوا ہے کہ اہمیت اس بات کی نہیں کہ انسان کے سر کے اندر کیا ہے۔ برین یا بھوسا، بلکہ اہم یہ ہے کہ سر کے اوپر کھیتی کتنی ہے؟''

''لک بھی اہم ہوتا ہے کہ انسان کیسا دکھائی دیتا ہے۔''

''اور کیا یہ خاص نہیں کہ وہ کیسا ہے؟'' ارسل کی نگاہیں ایک لمحے کو اس پر مرکوز ہوئیں پھر واپس جھک گئیں۔

''کسی بھی کپل کو دیکھ کر لوگ تبصرے کرتے ہیں کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ کیسے لگ رہے ہیں۔'' شہلا کا لہجہ بھی اس کی دلیل کی طرح کمزور تھا۔

''بارات اور ولیمے کے دو دنوں کے بعد کوئی پرواہ بھی نہیں کرتا کہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ کیسے ہیں؟ خوش یا ناخوش؟

ارسل کے پاس ہر دلیل کا جواب تھا۔ اور شہلا کے پاس مزید کوئی جواز تھا نہیں یا اس نے خاموشی بہتر جانی۔



''میری امی کی کوئی بیٹی نہیں ہے اور وہ ہر لڑکی کو فوراً یوں اپنی بیٹی بنا لیتی ہیں کہ ہم سے بھی زیادہ اس کی امی بن جاتی ہیں، وہ بڑی پیاری اور بے ضرر خاتون ہیں، اس لیے نہیں کہ وہ میری امی ہیں بلکہ اس لیے کہ وہ سچ مچ ایسی ہی ہیں۔ ایسی ساس کا ملنا خوش نصیبی ہے۔''

شہلا کو یقین تھا کہ اس کی امی ایسی ہی ہیں جیسا کہ وہ دعوا کر رہا ہے۔

''مگر زندگی فقط ساس کے ساتھ تو نہیں گزرتی؟'' اس نے فوراً ہی اپنے خیال کا اظہار کیا۔

''ہمارے معاشرے میں تو گزرتی ہے، تب ہی تو ساس کا اچھا ہونا خوش نصیبی کی علامت ہے اور رہی بات اس کی جس کے ساتھ زندگی کا سفر طے کرنا ہے تو وہ تو ہے ہی دل و جان سے آپ کا۔''

ارسل یوں دل کشی سے مسکرایا تھا کہ اس کی مسکراہٹ، شہلا کے سارے جواز، دلائل، خدشات اور اعتراضات سمیٹ لے گئی۔

اسے آج علم ہوا تھا کہ اظہار کتنا طاقت ور اور موثر ہوتا ہے۔ اور لفظوں میں کتنا اثر اور کتنی قوت ہوتی ہے جو وہ خود کو منوا لیتے ہیں اور کہنے والے کی زبان کی تاثیر بھی ہوتی ہے۔ اس کے دل کی سچائی جذبوں کی پذیرائی میں مدد کرتی ہے۔

☆☆☆

ہر موسم اچھا ہے اگر دل کی ترنگ اپنے عروج پر ہے تو، تب ہی ایسی گرم لو کے تھپیڑے بھی محبوب کا لمس بن کر چہرے سے ٹکرا رہے تھے، اپنی جیب سے موبائل نکال کر اس نے میسیجز چیک کیے، ایک دو کے جوابات دیے اور موبائل آف کرنے سے پہلے اسکرین کو غور سے دیکھا۔

''رابطہ کروں یا نہ کروں؟ کچھ دیر کشمکش میں رہنے کے بعد اس نے کانٹیکٹ کر ہی لیا۔

''آپ نے مائنڈ تو نہیں کیا میرا کال کرنا؟'' اپنا تعارف کرا کے سوال کیا تھا اس نے۔

''پتا نہیں، ویسے میرا جی چاہ رہا ہے کہ آپ کو اس کال پر خوشی ہو۔

''کیونکہ آپ کی خوشی پہ مجھے بھی خوشی ہوگی۔''

''آپ اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں پہ ہی خوش ہو جاتے ہیں؟''

''چھوٹی بات؟ آپ سے بات کرنا معمولی بات ہے کیا؟''

''تو؟ کوئی خاص بات ہے کیا؟''

''بالکل ہے۔''

''کیوں؟''

''کیونکہ جو انسان ہمارے لیے خاص ہو، اس سے بات کرنا بھی اہم ہوتا ہے۔''

''اچھا تو کریں بات۔''

''یہی تو سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا کہوں؟'' اس کی بے بسی پر دوسری جانب دھیمی سی ہنسی کی جھنکار سنائی دی۔

''آپ ہنس رہی ہیں مجھ پر؟''

''آپ پر نہیں، آپ کی باتوں پر۔''

''اکثر مجھے وہ سب یاد آتا ہے وہ برف، وہ سردی، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں، آئس کریم اور......''

''اور آئس کریم کی ادائیگی؟''

''کسی غریب کو شرمندہ کرنا اچھی بات نہیں؟''

''شرمندہ ہونا تو اچھے انسان کی علامت ہے۔''

''بس اسی اچھی بات پر ہی، آج کی بات کا اختتام ہو جانا چاہیے۔ پھر مجھے ابھی ہواؤں میں بھی تو اُڑنا ہے۔'' فرمان نے اس کا فون آف کیا تو اس کی مسکراہٹ چہرے پہ جیسے مستقل مہمان ہو گئی تھی اور دوسری جانب بیلا کے لبوں پہ بھی بڑی پیاری سی مسکراہٹ تھی۔

☆☆☆

ایک ماہ، دو ماہ گزر گئے، نہ امی جان کو کوئی جواب دیا گیا نہ ماموں جان کو، دونوں کی جانب سے بھی تقاضا ہوتا پھپھو کا جواب ٹالنے والا ہوتا، ابھی ہم سوچ رہے ہیں، آپس میں مشورہ کر کے بتائیں گے یا استخارہ کر کے بتائیں گے۔

ویسے پہلے تو انہوں نے حسب معمول صاف انکار ہی کر دیا تھا مگر عباد اور بیلا کے اصرار پر سوچنے کی ہامی بھر لی، اب سوچتے سوچتے بھی اتنا وقت ہو گیا تھا۔ شہلا اور انیلا خاموش تھیں۔ اپنے لیے نہیں مگر دونوں بہنوں نے ایک دوسرے کے لیے پھپھو سے سفارش کی کوشش کی مگر ان کی ڈانٹ سن کر اپنا سا منہ لے کر رہ گئیں۔

ماموں صاحب کا ایک بار پھر فون آیا تھا۔

"استخارہ ٹھیک نہیں آیا۔ ہماری طرف سے معذرت۔" پھپھو نے انہیں ٹکا سا جواب دے دیا۔

"بی بی! استخارہ ٹھیک ہے یا نہیں۔ میں نہیں جانتا، مگر آپ کی نیت ٹھیک نہیں ہے، یہ اچھی طرح اندازہ ہو گیا ہے مجھے، شہلا کے لیے آئے کئی اچھے اچھے رشتے آپ نے منع کر دیے۔ آخر کیوں؟ اور جب اس کی نہیں ہوگی تو نہ انیلا کا نمبر آئے گا، نہ بیلا کا نہ عباد کا؟ آپ آخر چاہتی کیا ہیں۔ بچیوں کو گھر بٹھا کر رکھنا ہے ساری عمر؟"

ماموں جان بہت غصے میں تھے۔ اور ان کی باتیں سن کر پھپھو کا پارہ ہائی ہو گیا۔

"میں آپ کے سامنے جواب دہ نہیں ہوں۔ میں......"

"اللہ کے سامنے تو ہیں نا۔" ماموں نے ان کی بات کاٹی۔

"اللہ کے سامنے؟ بس میں ہی جواب دہ ہوں؟ اور کوئی نہیں، وہ جو دنیا سے چلے گئے، ان سے سوال نہیں ہوا ہوگا ان کی ذمہ داری کا جنہوں نے میرے معاملے میں خود غرضی اور بے حسی دکھائی، وہ اچھے رہے، بس ایک میں ہی بری ہوں، غلط ہوں، گناہ گار ہوں۔"

پھپھو نے چیختے ہوئے موبائل پھینک دیا۔ وہ ہسٹریائی ہو کر چیخ رہی تھیں، تینوں لڑکیاں وہیں ان کے آس پاس ہی تو تھیں۔ ان کی حالت دیکھ کر ہکا بکا رہ گئیں شہلا نے ان کے قریب آ کر ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا "بھاڑ میں گئی تمہاری اپو، مر گئی، جل گئی، دفعان کرو مجھے کوئی نہیں ہوں میں کسی کی، جاؤ، میری جان چھوڑ دو، جس کا جہاں دل چاہے شادی کرے، رشتے کرے، منگنیاں کرے، جو تمہاری مرضی ہو کرو، میرے آسرے پہ کوئی نہ رہے، میں کسی کا گھر آباد نہیں ہونے دوں گی، جو کچھ تمہارے ماں باپ نے میرے ساتھ کیا، اس کا بدلہ تم چاروں سے لوں گی۔ تم سب سے نفرت ہے مجھے تمہارے باپ سے، تمہارے ماں سے، تم سب سے نفرت ہے مجھے۔"

بولتے چیختے چیختے بے دم سی ہو کر صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کیں تو بند آنکھوں سے سیلاب رواں تھا۔ وہاں موجود وہ تینوں نفوس گنگ اور دم بخود تھے۔

☆☆☆

چار کمروں، برآمدوں اور بڑے سے صحن والا کشادہ گھر تھا جس کے صحن میں کیاریاں بنی ہوئی تھیں۔ ان میں رنگ برنگے پھولوں والے پودے لگے تھے۔ اس پیارے سے گھر میں طیبہ کی ہنسی کی آواز کے ساتھ چار ننھے منے بچوں کی قلقاریاں گونجتی رہتی تھیں۔

طیبہ نے بچوں کے ہاتھ منہ دھلا کر ان کے کپڑے تبدیل کیے، تینوں بچیوں کے بالوں میں رنگ برنگے کلپ لگائے، پونیاں باندھیں عباد کے بالوں میں کنگھا کیا۔ اور کچن میں آ گئی۔ کھچڑی تیار تھی، دسترخوان لگا کر اس نے سلاد، رائتہ، چٹنی، برتن، پانی باری باری لے جا کر رکھا۔ بچے اس کے ساتھ ساتھ یا آگے پیچھے لگے ہوئے تھے۔

"بھابھی! آ جائیں، کھانا لگا دیا۔" طیبہ نے آواز لگائی۔

ثمرہ سڑ پڑ کرتی کمرے سے نکل آئیں۔ بیلا کی پیدائش کے بعد سے ان کی طبیعت اکثر اپ رہنے لگی تھی۔ آئے دن ہاتھ پیروں پہ سوجن آ جاتی، درجنوں ٹیسٹ کروانے کے بعد ڈاکٹر نے آرتھرائٹس کی تشخیص کی تھی وہ اپنی اور تکلیف کو لے کر ہائے ہائے کرتی رہتی تھیں۔

گھر اور بچوں کو طیبہ نے سنبھالا ہوا تھا۔ گھر کے کام اسے کبھی بوجھ نہیں لگے تھے۔ وہ عادی تھی اور بچوں میں تو اس کی جان تھی۔ انہیں نہلانا، دھلانا، تیار کرنا، ان کے لیے پکانا کھلانا، وہ خوشی خوشی کرتی تھی۔

گھر میں کسی معاملے میں روک ٹوک نہیں تھی۔ گھر کے اخراجات بخوبی پورے کرنے کے علاوہ بھائی جان ایک معقول رقم جیب خرچ کے نام پر اسے دیتے تھے۔ کپڑوں اور دیگر اشیائے ضروری کی خریداری بھی کروا دیتے تھے۔ طیبہ کے لیے فکرات پریشانیاں کم تھیں اور آسانیاں زیادہ تھیں۔

رات کے کھانے میں طیبہ نے کوفتے بنائے تھے۔ کھانے کے بعد بھائی جان آئس کریم لے آئے۔ طیبہ صحن میں بچوں کو بھی کھلا رہی تھی۔ خود بھی کھا رہی تھی، ساتھ ساتھ بچوں کی معصومانہ باتوں سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔

بیڈروم میں عامر بھائی جان اپنی بیگم کے ساتھ گفت و شنید میں مصروف تھے۔ جن کے وہ دیوانے اور بے دام غلام تھے۔

"پھر؟ کیا کہوں، ابرار چچا سے؟"

"دیکھیں، ابھی تو طیبہ فائنل کا امتحان دے گی۔ آگے ماسٹرز کرنے کا بھی کہہ رہی ہے۔ پھر رشتہ لگانا آسان ہے، آج بلائیں، وہ آج منگنی کر کے سال چھ ماہ بعد شادی کا کہیں گے، اتنا جمع جتھا ہے کہاں؟ شادی کہاں سے کریں گے۔ کچھ تیاری تو کر لیں پہلے، اور کیا پتا آگے اس سے اچھا کوئی رشتہ مل جائے اور میرا حال تو آپ کے سامنے ہے، ذرا میں بھی سنبھل جاؤں، آپ کو، بچوں کو، گھر کو دیکھ لوں۔"

ثمرہ کی تقریر کا ایک ایک لفظ ہمیشہ کی طرح ان کے دل و دماغ کو اپنی گرفت میں لے رہا تھا۔

"یہ تو ٹھیک کہا تم نے، میں منع کر دیتا ہوں ابرار چچا کو۔" عامر نے کسی معمول کی طرح اثبات میں گردن ہلائی۔

اگرچہ طبیعت کی خرابی کی وجہ سے وہ کچن میں اب کم کم ہی گھستی تھیں مگر آج شام کی چائے ثمرہ بھابھی نے خود بنائی تھی۔ بازار سے طیبہ کی پسندیدہ کچوریاں اور گلاب جامن بھی منگوائی تھیں۔

"یہ لو بھئی، چائے کا مگ طیبہ کے آگے رکھ کر وہ خود بھی کرسی پر بیٹھ گئیں۔

"تھینک یو بھابھی۔" طیبہ تو بھائی، بھابھی کی ذرا ذرا سی عنایتوں پر ہی نہال ہو جاتی تھی۔

اس وقت بھی کاٹن لان کے کھلے کھلے رنگوں اور خوب صورت پرنٹ کا جوڑا پہنے وہ بڑی مگن سی بیٹھی بیلا کو گود میں بٹھائے کھلا رہی تھی۔ کانوں میں پڑی بالیاں چہرے کی حرکت کے ساتھ ساتھ ہلکورے لے رہی تھیں۔ بالوں کی موٹی سی چوٹی آگے پڑی تھی۔ بیلا کو گدگداتے ہوئے خود بھی ہنسی تو چہرہ اور شاداب ہو گیا۔

"ارے طیبہ! وہ جو ابرار چچا ہیں نا، محمود آباد والے۔" ثمرہ بھابھی نے اسے مخاطب کیا۔

"جی بھابھی!"

"انہوں نے سرمد کا پیغام دیا ہے تمہارے لیے۔"

"جی۔!" طیبہ کی سمجھ میں نہ آیا کیا کہے۔

"میں نے تمہارے بھائی جان سے کہہ دیا، ابھی تو طیبہ پڑھ رہی ہے، عمر ہی کیا ہے جو کسی بھی ٹیڑھے میڑھے رشتے پہ ہاں کر دیں، دیکھا تو ہے تم نے سرمد کو، جی بھر کے سانولا، بلکہ کالا ہی سمجھو، تمہارے ساتھ تو بالکل ایسا لگے گا جیسے حور کے ساتھ لنگور، اب آگے تمہاری مرضی، تمہارے بھیا پوچھیں گے تو جو تمہاری مرضی ہو، انہیں بتا دینا، اور ہو سکتا ہے شازیہ کا فون بھی آئے، وہ تو بھئی ایسے جرح کرتی ہے جیسے ہم جان بوجھ کے تمہاری شادی نہیں کر رہے۔" ثمرہ بھابھی نے منہ بنایا۔

"ایسی بات نہیں ہے بھابھی! دراصل وہ دور ہیں نا، اس لیے انہیں زیادہ فکر رہتی ہے۔" طیبہ نے فوراً اپنی بڑی بہن کا دفاع کیا۔

"ارے بھئی، فکر تو ہمیں بھی ہے مگر آنکھیں بند کرکے تو کہیں بھی نہیں دھکیل سکتے، ماشاء اللہ شکل صورت، کام کاج، سلیقہ طریقہ کسی معاملے میں کسی سے کم نہیں ہو، جو بھی ہو، تمہارے جوڑ کا ہو، تمہارے لائق تو ہو۔"

ہمیشہ کی طرح وہ اپنی چرب زبانی کے جوہر دکھارہی تھیں۔ شازیہ کا کینیڈا سے فون آیا تھا وہ چھوٹی بہن کو ڈانٹ رہی تھی۔

"تمہارا دماغ ٹھیک ہے، تم ہر رشتے کو ٹھکرا دیتی ہو، اتنے نخرے ہوگئے ہیں تمہارے، کوئی سمجھ میں ہی نہیں آتا۔"

"کوئی سوٹ بھی تو کرتا ہو میرے ساتھ، سارے تو ٹیڑھے میڑھے سے ہوتے ہیں۔" طیبہ نے منمناتے ہوئے ثمرہ بھابھی کی زبان بولی۔

"مردوں کی شکل کون دیکھتا ہے؟ شریف ہونا چاہیے، کماؤ ہونا چاہیے۔ اب کیا کوئی آسمان سے اتر کر آئے گا تمہارے لیے؟ بھائی جان اور بھابھی سے بات کرو تو سارا ملبہ تم پر ڈال دیتے ہیں کہ تم انکار کردیتی ہو۔"

"چھوڑو نا آپا! کوئی اور بات کرو، ہوجائے گی شادی، کون سی عمر نکلی جارہی ہے میری۔"

"نکل گئی تو پچھتاؤ گی۔" شازیہ نے ہمیشہ کی طرح کچھ ڈانٹ کر اور کچھ پندونصائح کرکے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

☆☆☆

وقت اپنی رفتار سے گزر رہا تھا، طیبہ کا فائنل ہوئے بھی ایک سال ہوگیا تھا، اس نے آگے داخلہ نہیں لیا تھا۔ گھر میں اوپر کے کاموں کے لیے ملازمہ رکھ لی گئی تھی۔

طیبہ کچن اور بچوں کو سنبھالتی۔ ثمرہ بھابھی کو حسن کی نگہداشت اور اسے نکھارنے کے درجنوں ٹوٹکے آتے تھے، وہ سب طیبہ خود پہ آزماتی رہتی، اس کی خوب صورت جلد اور بھی چمک دار ہوگئی تھی، قاتل حسن مزید غارت گر ہوتا جارہا تھا، خود کو آئینے میں دیکھنا اور دیکھتے رہنا اس کا مرغوب اور محبوب مشغلہ بن گیا تھا۔

کچھ ثمرہ بھابھی کی ہر وقت کی تعریفوں نے دماغ خراب کردیا تھا۔ کچھ آئینے نے اسے ہواؤں میں اڑنا سکھادیا تھا۔ خوب سے خوب ترکی سوچ انتہا پر پہنچ گئی تھی کہ اب کوئی بھی آنکھوں میں جچتا ہی نہیں تھا۔

پچیسویں سالگرہ پہ شازیہ نے وش کرنے کے لیے فون کیا تھا اور کچھ دیر اچھی اچھی باتیں کرکے پھر شادی کے موضوع پر آگئی۔

"کیا ارادے ہیں تمہارے، تم نے پھر ایک پروپوزل ٹھکرادیا۔ شادی کرنی ہے یا نہیں؟"

"ایسے ہی منہ اٹھا کر کسی سے بھی کرلوں؟"

"یہ کیا فضول بات کرتی ہو تم؟ کیا مطلب ہے اس کا؟" شازیہ گرم ہوگئی۔

"مطلب یہ کہ پیچ نہ دیکھوں؟ جس کی شکل اچھی ہو، اس کا گھر اچھا نہیں ہوتا، جس کا گھر اچھا ہو اس کی شکل ایویں ہوتی ہے، کسی کی ایجوکیشن کم ہوتی ہے، فیملی زیادہ اور کوئی......"

طیبہ مزید کچھ کہنے جارہی تھی کہ شازیہ نے بات کاٹ دی۔

"تم کفران رحمت کررہی ہو طیبہ! اتنے اچھے اچھے پروپوزل آئے تمہارے، بلاوجہ میں میکھ نکال کر منع کردیتی ہو۔"

"ہوجائے گی جہاں نصیب ہوگا، وہیں ہوگی۔"

طیبہ کا لہجہ لاپروائی لیے ہوا تھا۔

"نصیب خود چل کر تمہارے پاس آتا ہے، تم بھگادیتی ہو، اب اس کا کیا علاج؟"

"چھوڑو ناں آپا، جب بھی فون کرتی ہو، ایک ہی بات کے پیچھے پڑجاتی ہو۔"

"شکر کرو، کوئی تو ہے جسے تمہاری فکر ہے، بھیا، بھابھی تو بالکل بے فکر ہو کر آرام سے بیٹھے ہیں۔"

"اچھا یہ بتاؤ، احسن بھائی کیسے ہیں اور



تمہارے دونوں یاجوج ماجوج؟" طیبہ نے موضوع ہی بدل دیا۔

☆☆☆

بے فکری اور لاپروائی کے ہنڈولے میں جھولتے ہوئے احساس ہی نہیں ہوا کہ مٹھی میں دبی وقت کی ریت کیسے دھیرے دھیرے ہاتھوں سے پھسل رہی ہے، بڑے بھیا کی اچانک وفات نے سب کو ہڑبڑادیا۔

طیبہ نے خود کو سنبھالتے ہوئے سراسیمہ ہو کر ادھر ادھر دیکھا، بڑی بہن دور تھی، بھابھی پہلے صدمے اور دکھ کی کیفیت میں تھیں پھر سرد مہر، لاپروا اور بے نیاز ہوگئیں۔

شازیہ پردیس سے بار بار کال کرکے طیبہ کا گھر بسانے پر زور دیتیں، آئے دن کی یاد دہانیوں اور اصرار پر ایک روز بھابھی چڑ گئیں۔

"اپنی مرضی سے کنواری بیٹھی ہیں، اتنا ہائی فائی معیار بنایا ہوا ہے۔ اس پر کوئی پورا ہی نہیں اترتا، اب میں کیا بھاگ دوڑ کروں؟ میں تو خود بیمار رہتی ہوں، اپنے گھر میں ہی مشکل سے چلتی پھرتی ہوں، مجھے تو اپنی بچیوں کی فکر لگ گئی ہے، اپنی اولاد کو دیکھوں یا ان کی فکر کروں۔"

بھابھی کے یوں بے نقط سنانے پر شازیہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہوگئی۔ پھر دھیرے سے منت کے انداز میں کہنے لگی۔

"بھابھی! میں اتنی دور ہوں، یہاں سے صرف فکر ہی کرسکتی ہوں، آپ تو وہاں ہیں، کسی سے کہہ سن کر کوئی رشتہ دیکھ لیں۔ باقی میں آکر خود ارینج کرلوں گی۔"

"تمہاری بہن کو کوئی پسند آیا تو بتادوں گی۔"

بھابھی کے لہجے سے لفظوں سے پھر بے زاری ٹپکنے لگی۔ دراصل طیبہ کا معاملہ اب ذرا سنگین ہوتا جارہا تھا۔ سچ تو یہ تھا کہ پہلے وہ خود غرضی کا مظاہرہ کررہی تھیں کہ بیماری کے سبب گھر اور بچوں پر توجہ دینے سے قاصر تھیں۔

لہٰذا طیبہ کی شادی کا معاملہ خود بھی ٹالتی رہیں اور اسے بھی آسانی رہتی کہ ایسے معیار وہ بے معیار، مگر اب انہیں آہستہ آہستہ اپنی خود غرضی کا احساس ہورہا تھا۔ اور پھر قریبی رشتے داروں یا ملنے جلنے والوں نے بھی ان سے سوالات کرنے شروع کردیے تھے۔

اب ہر ایک کو جھڑک کر بے زاری سے جواب دینا ممکن نہیں تھا۔ سارا الزام طیبہ پر ڈالنے سے بھی بات نہیں بن رہی تھی۔

"ارے لڑکیوں کا کیا ہے، وہ تو یوں ہی نخرے دکھاتی ہیں، تم بڑی ہو، سمجھاؤ اور فیصلہ کرو۔" بڑی دادی نے ایک روز بھابھی کے آئیں بائیں شائیں کرنے پر کہا۔

بھابھی خاموش ہوگئیں، اب وہ کیا بتاتیں کہ ان نخروں اور خیالات کو پروان چڑھانے میں بڑا ہاتھ ان کا ہی ہے۔

☆☆☆

دوپہر کا سورج باہر آگ برسا رہا تھا۔ اندر گھر میں ذرا امن تھا۔ ان کے لیے جو کمروں میں اے سی کی ٹھنڈک میں بیٹھے تھے۔ یعنی بھابھی اور بچے، طیبہ کچن میں دہی بھلے تیار کرچکی تھی، اب ان پر بگھار لگارہی تھی۔

کمرے میں آکر بیٹھی تو ایسا لگا جیسے جنت میں آگئی ہے۔

"کھانا لگاؤں بھابھی؟"

"کچھ دیر ٹھہر کر لگا لینا، بچے اپنا گیم ختم کرکے ہی اٹھیں گے۔" بھابھی نے ویڈیو گیم کھیلتے بچوں پہ ایک نظر ڈالی، پھر طیبہ سے مخاطب ہوئیں۔

"شادمان والی حسینہ ممانی ہیں نا، انہوں نے رافع کا پروپوزل بھجوایا ہے۔"

"رافع بھائی کا! مگر ان کا تو ایک ہی ایک بیٹا ہے۔" طیبہ نے ہڑبڑا کر دیکھا۔

"ہاں، ہے تو، بیوی فوت ہوگئی ہیں تو اپنے لیے بیوی بھی چاہیے اور بچے کے لیے ماں بھی۔"

"میں ایک بچے کے باپ سے شادی کروں؟ اس سے اچھے اچھے رشتے میں نے منع کر دیے، اب یہ......" طیبہ کا موڈ خراب ہونے لگا۔

"وقت وقت کی بات ہوتی ہے، بتیس کی ہو رہی ہو، خالی خولی خوب صورتی سے کیا ہوتا ہے، لوگ عمر بھی دیکھتے ہیں، ذرا عقل سے کام لو۔" یہ بھابھی کہہ رہی تھیں، طیبہ کو اپنی سماعتوں پہ یقین نہیں آیا۔ اس نے شاکی نگاہوں سے بھابھی کو دیکھا۔

"پھر بھی بھابھی! شادی شدہ، ایک بچے کا باپ، اب میرے لیے یہی رشتے رہ گئے ہیں؟" طیبہ کے ہر لفظ سے صدمہ اور حیرانی ٹپک رہی تھی۔

"تو پھر وہ دیکھ لو، جو شاہدہ بتا کر گئی ہے۔" بھابھی نے ایک دوسرے پروپوزل کا حوالہ دیا۔

"تصویر دیکھی ہے آپ نے، اتنا کالا، گنجا، توند نکلی ہوئی۔ میرے لیے کیا ایسے ہی ٹیڑھے میڑھے رشتے رہ گئے ہیں۔"

غم و غصے سے طیبہ کا برا حال تھا۔ مگر اس کے غم و غصے سے حقیقت نہیں بدل رہی تھی۔ اور بدلتے وقت اور حقیقت کے مطابق وہ خود کو بدلنے سے قاصر تھی اور پھر حالات نے اچانک جھٹکا کھایا تھا یا اس کی قسمت نے کہ سب کچھ یک دم ہی الٹ پلٹ ہو گیا۔

بھیا کے بعد بھابھی بھی ابدی سفر پہ روانہ ہو گئیں۔ ایک روز اچانک ہی بی پی شوٹ کر گیا یہی موت کا بہانا تھا اور وجہ بھی۔

طیبہ کے سر پہ جیسے آسمان گر پڑا۔ خود کو سنبھالے یا چار بچوں کو، وہ تو بری طرح بوکھلا گئی۔ شازیہ کچھ ہفتوں کے لیے پاکستان آئی تھی۔ سوگ کے دن گزرے تو اس نے طیبہ سے بات کی۔

"میں شادی کر لوں تو بچوں کا کیا ہوگا؟ یہ کہاں رہیں گے؟"

طیبہ نے جذباتی ہو کر جواب دیا۔

"بچوں کی نانی، ماموں، خالہ، سب موجود ہیں، وہ اپنے ساتھ رکھنے کو تیار ہیں، ویسے بھی اچھے لوگ ہیں، سنبھال لیں گے بچوں کو اور پھر فنانشل پرابلم بھی نہیں ہے کوئی، یہ گھر ہے، بینک میں بھی اچھا خاصا اماؤنٹ ہے۔ تم بچوں کی فکر چھوڑو، اپنی فکر کرو۔" شازیہ نے حقیقت پسند بن کر سمجھایا۔

"مگر بچے مجھ سے بہت اٹیچڈ ہیں، میرے بغیر کیسے رہیں گے۔" طیبہ مزید پریشان ہو گئی۔

"رہ لیں گے، بچے اتنے چھوٹے بھی نہیں ہیں پھر نانی، خالہ ہیں دیکھ بھال کرنے والی، وہ لوگ بھی ان سے بہت پیار کرتے ہیں تم جذباتی مت ہو، ریئلسٹک ہو کر سوچو اور فیصلہ کرو۔ میں ڈیڑھ دو ماہ یہاں ہوں، میں چاہ رہی ہوں کہ تمہارا گھر بسا کر ہی جاؤں۔"

"اتنی جلدی کہاں کریں گی؟" طیبہ پھر ہڑبڑا گئی۔ دراصل اتنے عرصے سے بھیا اور بھابھی کی چھاؤں میں رہتے ہوئے وہ خود سے سوچنا اور فیصلے کرنا ہی بھول گئی تھی۔ پھر شادی کے حوالے سے ایک مخصوص سوچ بن گئی تھی کہ اس معیار سے ذرا بھی ہٹ کر ہو تو وہ قابل قبول نہیں۔

"ایک پروپوزل ہے۔" شازیہ ہچکچاتے ہوئے بتانے لگی۔ مگر طیبہ کا ردعمل توقع کے مطابق تھا۔

"کیا اب یہی رشتے رہ گئے ہیں میرے لیے؟ دوسری شادی والے اور بچوں والے؟" طیبہ بری طرح تلملا گئی تھی۔ بڑی بہن سے ایسی امید نہ تھی اسے۔

"عقل سے کام لو طیبہ! نہ کنوارے تمہاری سمجھ میں آتے ہیں نہ شادی شدہ، یہ جو میں بتا رہی ہوں، سہیل کے کوئی رشتے دار ہیں، لڑکا دبئی میں سیٹل ہے۔ پڑھا لکھا ہے، جاب اچھی ہے۔ تم سے تین چار سال ہی بڑا ہوگا۔ سوبر پرسنالٹی ہے، سب کچھ ویسا ہی ہے جیسی تمہاری ڈیمانڈ ہے۔"

"اور چھ سال کی بچی؟ وہ بھی میں نے ڈیمانڈ کی تھی؟" طیبہ مزید تلملائی۔

"بھائی کے چار بچے پالنے پر راضی ہو، اپنا گھر بسا کر کسی کی بچی نہیں پال سکتیں؟ یا پھر اپنی ڈیمانڈز



ذرا کم کر لو، یہاں رشتے ہیں۔"

شازیہ آپا کا منہ بن گیا، طیبہ ابھی تک خوابوں کی دنیا میں جی رہی تھی، حقیقت کا سامنا کرنے کو تیار نہ تھی۔ بدلتے وقت اور حالات میں جینے کو تیار نہ تھی۔

☆☆☆

شازیہ آپا ناکام و نامراد لوٹ گئیں۔ طیبہ خوابوں کے شہزادے کا انتظار کرنے میں مگن ہو گئی۔ چاروں بچوں کو اس نے اپنے ساتھ ہی رکھا ہوا تھا۔ چھٹیوں میں نانی بلا لیتیں، ان کے انتقال کے بعد ماموں، خالہ نے بھی روایت برقرار رکھی۔

طیبہ گزرتے وقت سے آنکھیں چرائے، خوش فہم سپنوں کی دنیا میں گم تھی اور پہلا دھچکا اس روز لگا جب شہلا فرسٹ ایئر میں گئی اور اس کا پہلا رشتہ آیا۔ اور شاید تب ہی طیبہ کو ادراک ہوا کہ بہت عرصے سے کوئی سوالی، اس کے لیے نہیں آیا، اور اب تو شازیہ آپا نے بھی اس سے کہنا چھوڑ دیا تھا۔

آئینے میں خود کو غور سے دیکھتے ہوئے یکا یک ہی اسے اپنے زیاں کا احساس ہوا اور اس نقصان کی ساری ذمہ داری بھیا، بھابھی پہ ڈال کر وہ خود بری الذمہ ہو گئی۔

پہلی بار انتقامی جذبات سے دل آلودہ ہوا اور وقت کے ساتھ اس آلودگی میں اضافہ ہوتا ہی چلا گیا۔ اور یہ عجیب نفرت تھی جو محبت کے ساتھ ساتھ پروان چڑھتی رہی، دونوں جذبے ایک دوسرے کی ہمراہی میں سفر کرتے رہے۔

طیبہ بچوں سے محبت کرتی تھی، ان کا خیال رکھتی تھی مگر کوئی رشتہ یا شادی کا نام آتے ہی اس کے معاندانہ جذبات ابل پڑتے، جو اسباق بھابھی نے اسے پڑھائے تھے، وہ اب ان ہی کا اعادہ شہلا پر کر رہی تھی۔

شہلا شکل صورت اور مزاج میں بالکل طیبہ کا پرتو تھی اور تاریخ خود کو دہرا رہی تھی۔

☆☆☆

کچن میں گرمی کے ساتھ ساتھ اشتہا انگیز خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ شہلا نے بریانی دم پہ لگادی تھی پسندوں کا سالن تیار تھا۔ چکن میں مسالہ لگائے کئی گھنٹے پہلے ہی رکھ دیا تھا۔ اب انہیں فرائی کرنا تھا۔

اس کے علاوہ انیلا نے شازیہ پھپھو کی پسندیدہ ماش کی دال بھی بنائی تھی۔ وہ بہت برسوں بعد پاکستان آئی تھیں۔ اس وقت لاؤنج میں محفل جمی ہوئی تھی۔ اپنا ماضی دہراتے دہراتے دونوں اپنے بچپن کی یادوں پہ قہقہے لگا رہی تھیں۔ جنہیں سنتے ہوئے شہلا سوچنے لگی۔

"شکر ہے۔ امی کی طبیعت ٹھیک ہو گئی۔ ورنہ جس روز وہ چیختے چیختے بے ہوش ہو گئی تھیں۔ گھر میں سب کے ہی ہاتھ پیر پھول گئے تھے۔ اسپتال سے ڈسچارج ہو کر گھر واپس آنے کے بعد بھی وہ گم صم تھیں، تینوں لڑکیاں ان کے آگے پیچھے ہو رہی تھیں۔ ان کا خیال رکھ رہی تھیں۔

ان ہی دنوں میں شازیہ پھپھو کا فون آ گیا۔ شہلا نے یہ الجھن ان سے شیئر کی تو وہ سوچ میں پڑ گئیں۔

"ویسے میرا ارادہ تھا چند ماہ بعد پاکستان آنے کا، مگر اب میں کوشش کرتی ہوں جلدی آنے کی۔"

اور پھر تقریباً ڈیڑھ ماہ بعد وہ پاکستان میں تھیں۔ شہلا اور انیلا پریشان تھیں، وہ شازیہ سے پوچھ رہی تھیں کہ طیبہ کی اس حالت کا کیا سبب ہے؟

"وہ، ہم سے کس بات کا بدلہ لینا چاہتی ہیں؟ انیلا نے سوال کیا۔ اس روز طیبہ کے چیخنے چلانے سے ان کی سمجھ میں کچھ آیا، کچھ نہیں آیا اور جو کچھ سمجھ آیا وہ بھی مبہم تھا۔ ان کے پاس بہت سے سوالات تھے۔ جن کے جواب شازیہ پھپھو کے پاس تھے۔

☆☆☆

لاؤنج میں کپڑوں کا ڈھیر وسط میں پڑا ہوا تھا۔ امی نے سارے کپڑے چھانٹ کر تین ڈھیریاں لگادی تھیں اور اب تینوں لڑکوں کو آواز دے رہی تھیں کہ اپنے اپنے کپڑے تہہ کر کے اپنی الماریوں میں رکھ لیں۔ ایک فرمان ہی تھا جس نے فرماں برداری کا

کروں؟ ''میں ایک بچے کے باپ سے شادی کروں؟ اس سے اچھے اچھے رشتے میں نے منع کر دیے، اب یہ...'' طیبہ کا موڈ خراب ہونے لگا۔

''وقت وقت کی بات ہوتی ہے، بتیس کی ہو رہی ہو، خالی خولی خوب صورتی سے کیا ہوتا ہے، لوگ عمر بھی دیکھتے ہیں، ذرا عقل سے کام لو۔'' یہ بھابھی کہہ رہی تھیں، طیبہ کو اپنی سماعتوں پہ یقین نہیں آیا۔ اس نے شاکی نگاہوں سے بھابھی کو دیکھا۔

''پھر بھی بھابھی! شادی شدہ، ایک بچے کا باپ، اب میرے لیے یہی رشتے رہ گئے ہیں؟'' طیبہ کے ہر لفظ سے صدمہ اور حیرانی ٹپک رہی تھی۔

''تو پھر وہ دیکھ لو، جو شاہدہ بتا کر گئی ہے۔'' بھابھی نے ایک دوسرے پروپوزل کا حوالہ دیا۔

''تصویر دیکھی ہے آپ نے، اتنا کالا، گنجا، توند نکلی ہوئی۔ میرے لیے کیا ایسے ہی ٹیڑھے میڑھے رشتے رہ گئے ہیں۔''

غم و غصے سے طیبہ کا برا حال تھا۔ مگر اس کے غم و غصے سے حقیقت نہیں بدل رہی تھی۔ اور بدلتے وقت اور حقیقت کے مطابق وہ خود کو بدلنے سے قاصر تھی اور پھر حالات نے اچانک جھٹکا کھایا تھا یا اس کی قسمت نے کہ سب کچھ یک دم ہی الٹ پلٹ ہو گیا۔

بھیا کے بعد بھابھی بھی ابدی سفر پہ روانہ ہو گئیں۔ ایک روز اچانک ہی بی پی شوٹ کر گیا یہی موت کا بہانا تھا اور وجہ بھی۔

طیبہ کے سر پہ جیسے آسمان گر پڑا۔ خود کو سنبھالے یا چار بچوں کو، وہ تو بری طرح بوکھلا گئی۔ شازیہ کچھ ہفتوں کے لیے پاکستان آئی تھی۔ سوگ کے دن گزرے تو اس نے طیبہ سے بات کی۔

''میں شادی کر لوں تو بچوں کا کیا ہو گا؟ یہ کہاں رہیں گے؟'' طیبہ نے جذباتی ہو کر جواب دیا۔

''بچوں کی نانی، ماموں، خالہ، سب موجود ہیں، وہ اپنے ساتھ رکھنے کو تیار ہیں، ویسے بھی اچھے لوگ ہیں، سنبھال لیں گے بچوں کو اور پھر فنانشل پرابلم بھی نہیں ہے کوئی، یہ گھر ہے، بینک میں بھی اچھا خاصا اماؤنٹ ہے۔ تم بچوں کی فکر چھوڑو، اپنا فکر کرو۔'' شازیہ نے حقیقت پسند بن کر سمجھایا۔

''مگر بچے مجھ سے بہت اٹیچڈ ہیں، میرے بغیر کیسے رہیں گے۔'' طیبہ مزید پریشان ہوئی۔

''رہ لیں گے، بچے اتنے چھوٹے بھی نہیں ہیں پھر نانی، خالہ ہیں دیکھ بھال کرنے والی، وہ لوگ بھی ان سے بہت پیار کرتے ہیں تم جذباتی مت ہو، ریلیکس ہو کر سوچو اور فیصلہ کرو۔ میں ڈیڑھ دو ماہ یہاں ہوں، میں چاہ رہی ہوں کہ تمہارا گھر بسا کر ہی جاؤں۔''

''اتنی جلدی کہاں کریں گی؟'' طیبہ پھر ہڑبڑا گئی۔ دراصل اتنے عرصے سے بھیا اور بھابھی کی چھاؤں میں رہتے ہوئے وہ خود سے سوچنا اور فیصلے کرنا ہی بھول گئی تھی۔ پھر شادی کے حوالے سے ایک مخصوص سوچ بن گئی تھی کہ اس معیار سے ذرا بھی ہٹ کر ہو تو وہ قابل قبول نہیں۔

''ایک پروپوزل ہے۔'' شازیہ ہچکچاتے ہوئے بتانے لگی۔ مگر طیبہ کا ردعمل توقع کے مطابق تھا۔

''کیا اب یہی رشتے رہ گئے ہیں میرے لیے؟ دوسری شادی والے اور بچوں والے؟'' طیبہ بری طرح تلملا گئی تھی۔ بڑی بہن سے ایسی امید نہ تھی اسے۔

''عقل سے کام لو طیبہ! نہ کنوارے تمہاری سمجھ میں آتے ہیں نہ شادی شدہ، یہ جو میں بتا رہی ہوں، سہیل کے کوئی رشتے دار ہیں، لڑکا دبئی میں سیٹل ہے۔ پڑھا لکھا ہے، جاب اچھی ہے۔ تم سے تین چار سال ہی بڑا ہو گا۔ سوبر پرسنالٹی ہے، سب کچھ ویسا ہی ہے جیسی تمہاری ڈیمانڈ ہے۔''

''اور چھ سال کی بچی؟ وہ بھی میں نے ڈیمانڈ کی تھی؟'' طیبہ مزید تلملائی۔

''بھائی کے چار بچے پالنے پر راضی ہو، اپنا گھر بسا کر کسی کی بچی نہیں پال سکتیں؟ یا پھر اپنی ڈیمانڈز ذرا کم کر لو، یہاں رشتے ہیں۔''

شازیہ آپا کا منہ بن گیا، طیبہ ابھی تک خوابوں کی دنیا میں جی رہی تھی، حقیقت کا سامنا کرنے کو تیار نہ تھی۔ بدلتے وقت اور حالات میں جینے کو تیار نہ تھی۔

☆☆☆

شازیہ آپا ناکام و نامراد لوٹ گئیں۔ طیبہ خوابوں کے شہزادے کا انتظار کرنے میں مگن ہو گئی۔ چاروں بچوں کو اس نے اپنے ساتھ ہی رکھا ہوا تھا۔ چھٹیوں میں نانی بلا لیتیں، ان کے انتقال کے بعد ماموں، خالہ نے بھی روایت برقرار رکھی۔

طیبہ گزرتے وقت سے آنکھیں چرائے، خوش فہم سپنوں کی دنیا میں گم تھی اور پہلا دھچکا اس روز لگا جب شہلا فرسٹ ایئر میں گئی اور اس کا پہلا رشتہ آیا۔ اور شاید تب ہی طیبہ کو ادراک ہوا کہ بہت عرصے سے کوئی سوالی، اس کے لیے نہیں آیا، اور اب تو شازیہ آپا نے بھی اس سے کہنا چھوڑ دیا تھا۔

آئینے میں خود کو غور سے دیکھتے ہوئے یکا یک ہی اسے اپنے زیاں کا احساس ہوا اور اس نقصان کی ساری ذمہ داری بھیا، بھابھی پہ ڈال کر وہ خود بری الذمہ ہو گئی۔

پہلی بار انتقامی جذبات سے دل آلودہ ہوا اور وقت کے ساتھ اس آلودگی میں اضافہ ہوتا ہی چلا گیا۔ اور یہ عجیب نفرت تھی جو محبت کے ساتھ ساتھ پروان چڑھتی رہی، دونوں جذبے ایک دوسرے کی ہمراہی میں سفر کرتے رہے۔

طیبہ بچوں سے محبت کرتی تھی، ان کا خیال رکھتی تھی مگر کوئی رشتہ یا شادی کا نام آتے ہی اس کے معاندانہ جذبات ابل پڑتے، جو اسباق بھابھی نے اسے پڑھائے تھے، وہ اب ان ہی کا اعادہ شہلا پر کر رہی تھی۔

شہلا شکل صورت اور مزاج میں بالکل طیبہ کا پرتو تھی اور تاریخ خود کو دہرا رہی تھی۔

☆☆☆

کچن میں گرمی کے ساتھ ساتھ اشتہا انگیز خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ شہلا نے بریانی دم پہ لگا دی تھی پسندوں کا سالن تیار تھا۔ چکن میں مسالہ لگا کے کئی گھنٹے پہلے ہی رکھ دیا تھا۔ اب انہیں فرائی کرنا تھا۔

اس کے علاوہ انیلا نے شازیہ پھپھو کی پسندیدہ ماش کی دال بھی بنائی تھی۔ وہ بہت برسوں بعد پاکستان آئی تھیں۔ اس وقت لاؤنج میں محفل جمی ہوئی تھی۔ اپنا ماضی دہراتے دہراتے دونوں اپنے بچپن کی یادوں پہ قہقہے لگا رہی تھیں۔ جنہیں سنتے ہوئے شہلا سوچنے لگی۔

''شکر ہے۔ اپو کی طبیعت ٹھیک ہو گئی۔ ورنہ جس روز وہ چیختے چیختے بے ہوش ہوئی تھیں۔ گھر میں سب کے ہی ہاتھ پیر پھول گئے تھے۔ اسپتال سے ڈسچارج ہو کر گھر واپس آنے کے بعد بھی وہ گم صم تھیں، تینوں لڑکیاں ان کے آگے پیچھے ہو رہی تھیں۔ ان کا خیال رکھ رہی تھیں۔

ان ہی دنوں میں شازیہ پھپھو کا فون آ گیا۔ شہلا نے یہ الجھن ان سے شیئر کی تو وہ سوچ میں پڑ گئیں۔

''ویسے میرا ارادہ تھا چند ماہ بعد پاکستان آنے کا، مگر اب میں کوشش کرتی ہوں جلدی آنے کی۔''

اور پھر تقریباً ڈیڑھ ماہ بعد وہ پاکستان میں تھیں۔ شہلا اور انیلا پریشان تھیں، وہ شازیہ سے پوچھ رہی تھیں کہ طیبہ کی اس حالت کا کیا سبب ہے؟

''وہ، ہم سے کس بات کا بدلہ لینا چاہتی ہیں؟'' انیلا نے سوال کیا۔ اس روز طیبہ کے چیخنے چلانے سے ان کی سمجھ میں کچھ آیا، کچھ نہیں آیا اور جو کچھ سمجھ آیا وہ بھی مبہم تھا۔ ان کے پاس بہت سے سوالات تھے۔ جن کے جواب شازیہ پھپھو کے پاس تھے۔

☆☆☆

لاؤنج میں کپڑوں کا ڈھیر وسط میں پڑا ہوا تھا۔ امی نے سارے کپڑے چھانٹ کر تین ڈھیریاں لگا دی تھیں اور اب تینوں لڑکوں کو آواز دے رہی تھیں کہ اپنے اپنے کپڑے تہہ کر کے اپنی الماریوں میں رکھ لیں۔ ایک فرحان ہی تھا جس نے فرماں برداری کا

مظاہرہ کیا اور کپڑے تہ کرنے لگا۔
"یار! میرے کپڑے بھی دیکھ لے ذرا!" ارسل نے اپنے موبائل سے نگاہیں اٹھا کر چھوٹے بھائی پہ آرڈر چلایا۔
"یس، دیکھ لیے۔" فرمان نے اس کے کپڑوں کا ڈھیر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چند سیکنڈ دیکھا اور دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔
"میرے راج دلارے بھائی، میرے کپڑے بھی تہ کر کے الماری تک پہنچا دے، برگر کھلا دوں گا، استری کر دے تو ڈیل اور بڑھ جائے گی۔"
"نہیں بھئی، مجھ سے نہیں ہوتے استری وستری، برگر تک کی ڈیل ٹھیک ہے۔"
"اچھا بھئی شہزادے، جیسے تیری مرضی۔" ارسل کی کال لگ گئی تھی، ہیلو ہیلو کرتا ہوا، وہاں سے چل دیا۔
"کیسی طبیعت ہے پھپھو کی؟"
"ٹھیک ہے پہلے سے بہت بہتر ہے۔"
"شکر ہے۔ اللہ انہیں اور بہتر کرے، تاکہ ہمارا کام آسان ہو اور جلدی ہو۔"
"آمین۔"
"بہت فارورڈ ہیں آپ، خود ہی سب کچھ طے کر لیتے ہیں۔ ابھی پھپھو نے نہ کر دی ہے۔ آپ کو معلوم نہیں ہے؟"
"دل والوں کی راہ میں ایسے پہاڑ تو آتے ہی ہیں، ڈونٹ وری، میں اسے سر کر لوں گا۔" ارسل کے لفظوں میں ہی نہیں لہجے میں بھی یقین تھا۔
"ابھی میری طرف سے بھی ہاں نہیں ہوئی۔" شہلا زیر لب مسکرائی۔
"اس ماؤنٹ ایورسٹ کو بھی تسخیر کر لیں گے میڈم!"
"آپ کو پہاڑ بہت پسند ہیں؟"
"ہاں، لیکن مجھے گہرے سمندر، بہتے دریا، گنگناتے جھرنے اور گاتی ندیاں بھی پسند ہیں۔"
"آپ تو شاعری کرنے لگے۔"
"بس جی، ایسا ہی ہوتا ہے، یہ جذبہ عشق اپنے ساتھ شاعری کے جراثیم بھی لے آتا ہے شاید۔"
"شاعری کے جراثیم ہوتے ہیں؟ کسی شاعر نے سن لیا تو برا مان جائے گا۔" شہلا نے اپنی بے اختیار ہنسی کو روک کر کہا۔
"آپ کو تو اچھی لگی نا میری بات، بس پھر خیر ہے اور ہنسنے میں کنجوسی نہ کیا کریں، میں نے بتایا نا کہ مجھے گنگناتے جھرنے اچھے لگتے ہیں۔"
"کسی کو امپریس...... کرنے کے لیے شاعری ضروری ہے کیا؟"
"بالکل بھی نہیں، اگر ایسا ہوتا تو ہر کامیاب و ناکام شاعر ایک کامیاب عاشق ضرور ہوتا۔" ارسل نے اتنے مزے سے جواب دیا کہ شہلا ایک بار پھر اپنی ہنسی نہیں روک سکی۔
"پھپھو نے ٹھیک کہا تھا، آپ تینوں بھائی ڈراما ہیں۔"
"اجی، پھپھو کو اور میرے بھائیوں کو ایک طرف کر کے اپنی اور میری بات کریں صرف، آپ کی رائے کیا ہے میرے بارے میں؟" ارسل کا لہجہ اشتیاق لیے ہوئے تھا۔
"میری رائے میں آپ ایک ڈراما نہیں بلکہ پوری فلم ہیں۔"
"رومینٹک؟"
"جی نہیں۔ کامیڈی۔"

☆☆☆

گرم اور بوجھل دن ختم ہوا تو شام بھی اسی کا عکس لیے ہوئے تھی، حبس بھی باقی تھا، گرمی بھی، لوڈشیڈنگ معمول کے مطابق تھی، یعنی بے تحاشا مگر گھر میں لگے سولر پینل کی وجہ سے زندگی میں کچھ سکون تھا۔ امی نے چائے کا کپ فرمان کو دیا۔
"جاؤ، اپنے ابو کو دے آؤ۔"
"کاش ہماری ایک بہن ہوتی، لڑکیوں والے سارے کام مجھے ہی کرنے پڑتے ہیں، اب تو مجھے یہ لگنے لگا ہے کہ میں اس گھر کا بیٹا نہیں بلکہ بیٹی ہوں۔"



فرمان نے چائے کا کپ لیتے ہوئے ان شکایات کا اعادہ کیا جو وہ اکثر کرتا رہتا تھا۔
"ہاں، پہلے مجھے بھی بیٹی کا بڑا ارمان تھا۔ ماں کے دکھ سکھ کی ساتھی ہوتی ہے، سہیلی ہوتی ہے، مگر تم نے بیٹی کی کمی پوری کر دی، سچ میں میرا بیٹا، ہیرا ہے ہیرا۔"
امی حالانکہ اتنی محبت سے بول رہی تھیں مگر فرمان آنکھیں پھاڑے انہیں دیکھ رہا تھا۔
"شکر ہے امی، آپ نے یہ نہیں کہا کہ کوئی اچھا رشتہ دیکھ کر جلدی سے اپنے بچے کے ہاتھ پیلے کر دوں۔"
"نہیں خیر، ہاتھ پیلے کرنے کی اب اتنی بھی جلدی نہیں ہے۔ پہلے یہ دونوں تو ٹھکانے لگ جائیں، پھر سوچیں گے تمہارا۔"
امی نے بڑے اطمینان سے جواب دیا تھا اور فرمان کو اتنے ہی تیز پتنگے لگ گئے تھے، ابو کو فٹافٹ چائے دے کر وہ واپس آیا اور دوبارہ سے سلسلہ کلام وہیں سے جوڑا، جہاں سے توڑا تھا۔
"امی حضور! بڑے بھیا کب ٹھکانے لگائیں جائیں گے؟"
"جب شہلا کے گھر سے جواب آئے گا۔" امی نے اس کے لیے چائے نکالی۔
"اور جواب کب آئے گا؟"
"دیکھو، اس کی بڑی پھپھو آئی ہوئی ہیں۔ ہوسکتا ہے۔ باہم مشاورت کر کے جلدی جواب دے دیں۔"
"ویسے...... فیملی اچھی ہے نا ان لوگوں کی؟" فرمان نے سنک میں پڑے برتن کھنگالنے شروع کر دیے۔
"ہاں، اچھے لوگ ہیں۔" امی نے لاپروائی سے جواب دیا۔
"سارے بہن بھائی بہت اچھے ہیں۔" فرمان کی آنکھوں میں ایک پیاری سی شبیہہ لہرائی، برتن کھنگالتے ہوئے وہ کسی اور ہی دنیا میں پہنچا ہوا تھا۔
"اچھا!" امی نے ذرا حیران ہو کر اسے دیکھا۔
"مثلاً کون ہے سب سے اچھا؟ یا اچھی"
"وہ جو سب سے چھوٹی... سب سے چھوٹی ہے" اپنا راز فاش کرتے کرتے وہ یک دم ہی خاموش ہوا تھا پھر زور زور سے پتیلی رگڑنے لگا۔
"میرا مطلب ہے کہ سب ہی اچھے ہیں، بڑے سے لے کر چھوٹے تک۔"
"واقعی؟" امی کی مسکراہٹ گہری ہوتی جا رہی تھی۔
"افوہ، امی! خالی چائے؟ کچھ بنا ہی لیتیں، کوئی بسکٹ نمکو وغیرہ، بچے ہوئے ہیں یا نہیں۔"
فرمان اپنی جھینپ مٹانے کو کیبنٹس کھول کھول کر کوکیز یا چپس نمکو وغیرہ تلاش کرنے لگا اور امی یہ سوچ رہی تھیں کہ اب فرمان کے لیے کوئی لڑکی تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

☆☆☆

ڈرائنگ روم میں محفل جمی تھی۔ لاؤنج کی صفائی ہو رہی تھی باہر موسم بڑا خوشگوار تھا۔ بارش کے بعد گرمی کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ بھیگی بھیگی ہوا میں بڑی لطافت اور فرحت تھی۔ بیلا نے کشن ترتیب سے رکھے۔
"تو کیا سارا قصور میرا ہی تھا۔" طیبہ کے چہرے پہ کرب کے آثار تھے۔ گزرا وقت ملال اور شکستگی بن کر آنکھوں سے جھلک رہا تھا۔
"میں یہ نہیں کہتی کہ سارا قصور تمہارا تھا مگر کچھ تو عقل شعور سے کام لیا ہوتا، تم کوئی موم کی گڑیا تھیں کہ جس نے جہاں موڑ دیا وہیں مڑ گئیں؟"
"مجھے احساس دلایا گیا میری خوب صورتی کا اور میں بھی...... زعم میں آ گئی۔" طیبہ کے لفظوں میں، پیشانی کی لکیروں میں پچھتاوے رقم تھے۔
"زندگی میں ہم جو کچھ چاہتے ہیں، وہ محض حسن کے سہارے نہیں ملتا، تقدیر کا ایک بڑا ہاتھ ہوتا اس میں۔"
شازیہ اور نہ جانے کیا کچھ کہہ رہی تھی، طیبہ اپنے ہی خیالات میں گم تھی۔ وہ اس لمحے کو کھوج رہی تھی جب

اس کے ملال، کرب اور پچھتاوے نے انتقام کی صورت اختیار کرلی تھی۔ وہ سوچتی رہی مگر کوئی سرا ہاتھ نہ آیا۔

"چلو، اب گزرے وقت کو بھولنے کی کوشش کرو، جو دنیا سے چلے گئے، انہیں معاف کردو، کس کا کتنا قصور تھا، اللہ ہی بہتر جانتا ہے آگے بڑھو، بچوں کا کیا قصور ہے، وہ تو بہت چاہتے ہیں تمہیں، ذرا بیمار پڑتی ہو، دن رات ایک کردیتی ہیں۔"

"ہاں، یہ تو ہے۔" طیبہ کے لبوں پہ ایک پھیکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"اور میں ان پیاری بچیوں سے بدلہ لینے چلی تھی۔" اگلے ہی لمحے ندامت کے پل نے اسے اپنے حصار میں لے لیا۔

عین اس لمحے بیلا اور شہلا کی زوردار چیخوں کی آواز سنائی دی۔

"یا الٰہی خیر!" دونوں گھبرا کر کھڑی ہوگئیں، اور ان کے باہر نکلنے سے پہلے ہی عباد اندر آ گیا۔

"توبہ ہے، میرے کان بہرے کردیے، ان لوگوں نے۔" کانوں میں انگلیاں گھماتا ہوا وہ صوفے پہ پھیل گیا۔

"تم کیا ہوا؟"

"کچھ بھی نہیں، سموسے لے کر آیا تھا، ایک سموسہ پچیس روپے کا ہوگیا ہے۔ قیمت سن کر چیخ پڑیں۔"

"قیمت سن کر نہیں، ان کی حالت دیکھ کر، ذرا کیپ اتار دو ابی۔" بیلا اور شہلا بھی اندر آ گئیں اور پیچھے پیچھے ہانپتی کانپتی انیلا بھی جو کچن میں پکوڑے بنا رہی تھی۔

"مجھے کیا ہوا؟ یہ لو۔" عباد نے اپنی کیپ اتار دی اور اس بار شازیہ اور طیبہ دونوں کی چیخ نکل گئی۔

"یہ کیا کروالیا؟"

"کچھ نہیں امی، ذرا ٹنڈ کروائی ہے۔" عباد کا اطمینان قابل دید تھا۔ "کیوں؟"

"ارسل بھائی گنجوں کا گینگ بنا رہے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ جتنا وقت اپنی ہیئر اسٹائلنگ پہ لگاتے ہو، وہ ایکسر سائز میں لگاؤ۔ باڈی اچھی ہو تو پرسنالٹی خود بخود شاندار ہوجاتی ہے۔"

عباد اپنی چمکتی ہوئی ٹنڈ کے ساتھ ارسل کے سنہرے اقوال سنا رہا تھا۔

"یہ دیکھیں آپا، اس لڑکے کی حرکت۔" طیبہ بڑی بہن کے آگے فریاد کناں ہوئیں۔ "ہمارا داماد بننے جا رہا ہے اور......"

"چھوڑو، اس عمر میں سب ہی لڑکے اس طرح کی حرکتیں کرتے ہیں۔ آگے چل کے سب ٹھیک ہوجائے گا۔" شازیہ نے تسلی دی۔

تینوں لڑکیاں اپنی بے قابو ہنسی لے کر باہر آ گئیں۔

"کیا چیز ہیں ارسل بھائی!" بیلا نے کہا۔

"بہت بڑی شے ہیں، سوچ لو آپا!" انیلا نے شہلا کو مخاطب کیا۔ "سر پہ بال نہیں ہیں مگر سر کے اندر دماغ بہت چلتا ہے۔"

"پرسنالٹی تو اچھی ہے۔ آنکھیں کتنی بولتی ہوئی ہیں۔" شہلا نے ارسل کا دفاع کیا یا شاید اپنے دل کا۔

"زبان بھی بہت بولتی ہوئی ہے۔" انیلا کچن میں جاتے جاتے بولی۔

"ساس، سسر تو بہت میٹھے ہیں۔" شہلا کی حمایت جاری تھی۔

"حیرت کا مقام ہے، آپا بالڈ (گنجا) پرسنالٹی پہ کلین بولڈ ہوگئیں؟"

"تو کیا ہوا؟ سر پہ بال نہ ہوں تو کیا سینے میں دل بھی نہیں ہوتا؟"

شہلا خوش تھی، مطمئن تھی اور لوگوں کے اعتراضات اور مذاق کے لیے تیار بھی، اس نے اپنی خوب صورتی نہیں بلکہ ارسل کے دل کا حسن دیکھا تھا جس میں اس کے لیے عزت، محبت اور قدر تھی اور زندگی اتنا حسن نہیں بلکہ ان ہی جذبوں کے سہارے گزرتی ہے۔



# آبلہ

ثریا ظفر

"سنو! ابو کو مت بتانا کہ مس فریحہ نے آج مجھے ڈانٹا ہے" میں نے ولی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ارے! تمہارے لیے جان بھی حاضر" یہ ولی کا یقین دلانے کا سب سے پیارا انداز تھا۔

میں مطمئن ہوگیا۔ وہ مجھ سے ایک سال چھوٹا تھا لیکن ابو نے ہمیں ایک ہی جماعت میں داخل کروایا تھا، اسی لیے ہم ساتھ پڑھتے تھے۔ ہمارے بستے، جوتے، کلائی میں بندھی گھڑی حتی کہ بال بھی ایک جیسے بنے ہوتے تھے۔ اگر ہمارے چہروں کے خدوخال مختلف نہ ہوتے تو شاید لوگ ہمیں جڑواں خیال کرتے۔

"عمر! وہ دیکھو!! روز کی طرح آج بھی اسکول

سے گھر واپس جاتے ہوئے، اس نے میری توجہ اس گاڑی کی جانب مبذول کروائی تھی۔ میں نے اشتیاق سے گاڑی کو دیکھا۔ روزانہ اسکول سے واپس جاتے ہوئے راستے میں پڑنے والے اس پوش علاقے کے بنگلے کے سامنے ہم کچھ دیر ٹھہرا کرتے تھے۔

بنگلے کا مالک نہ صرف امیر بلکہ گاڑیوں کا شوقین بھی معلوم ہوتا تھا۔ تقریباً ہر ماہ بعد اس کے گھر کے گیراج میں نئی گاڑی کھڑی ہوتی تھی۔ وہ جب بھی نئی گاڑی لیتا پچھلی والی بیچ دیا کرتا تھا، ولی کو تو جیسے انتظار ہوتا تھا کہ کب ایک ماہ گزرے اور گھر کے گیراج میں نئی گاڑی کھڑی ہو۔ کبھی کبھی ایک ماہ سے تین چار دن اوپر بھی ہو جاتے تھے، تب میں اور ولی تاریخ گنتے رہتے کہ اب نئی گاڑی آئے گی کہ تب؟

آج پھر پرانی گاڑی کی جگہ نئی گاڑی نے لے لی تھی۔ گاڑی کے مالک کو پتا بھی نہ تھا کہ دو دس سال کے بچے اس کی گاڑی کو روزانہ شوق سے دیکھتے ہیں۔ یہ ہمارا ایک بہترین مشغلہ ہوا کرتا تھا۔

مجھے اور ولی کو گلی میں بچوں کے ساتھ کھیلنا بہت اچھا لگتا تھا لیکن شاید انہیں، ہم پسند نہیں تھے۔ میں جب بھی کسی کھیل سے باہر ہو جاتا۔ عین اسی لمحے ولی بھی وہ کھیل چھوڑ دیتا، یہی وجہ تھی کہ محلے کے بچے ہمیں اپنے ساتھ کسی بھی کھیل میں شامل کرنا نہیں چاہتے تھے۔ میں جب ولی سے کہتا کہ وہ میرے خاطر کھیل کیوں چھوڑ دیتا ہے تو وہ مسکراتے ہوئے کہتا تھا کہ

"تمہارے لیے جان بھی حاضر"

پھر میں نے اور ولی نے بھی ان کے ساتھ کھیلنا چھوڑ دیا۔ ہم سرما کی نرم، گرم دھوپ میں سائیکل پر ریس لگایا کرتے تھے، اور ریس لگاتے جب ہم تھک جاتے تو قریب بنے پارک میں ایک بینچ پر بیٹھ جاتے۔ اس بینچ کے پیچھے ایک بڑا سا درخت ہوا کرتا تھا جس نے پوری بینچ کو سائے میں لیا ہوا ہوتا، وہ ہماری من پسند جگہ ہوا کرتی تھی۔

ولی کو رنگوں سے بہت لگاؤ تھا وہ ایک اچھا مصور تھا۔ ایک مرتبہ وہ اپنے ساتھ ہرے رنگ کی شیشی اور برش لایا اور اس نے برش کو رنگ میں ڈبو کر بینچ پر "عمر ولی" لکھ دیا۔ اور پھر وہ بینچ ہماری ہو گئی۔ ہم اسکول میں بھی ساتھ رہتے تھے، محلے میں بھی حتیٰ کہ گھر میں بھی ہمارا کمرہ مشترک تھا۔ میرا ولی کے علاوہ کوئی دوست نہ تھا اور اس کا بھی میرے علاوہ کوئی دوست نہ تھا۔ میں اور وہ جیسے ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم تھے۔

ہمارے برابر والوں نے اپنے گھر میں آم کا درخت لگایا ہوا تھا، جون اور جولائی کی تپتی ہوئی گرمیوں میں، ان کے درختوں پر وافر مقدار میں آم آتے تھے، جسے وہ ہمارے گھر بھی بھجواتے تھے لیکن جو مزا، اپنی غلیل سے ان کی درخت پر موجود کیریاں توڑنے کا تھا، وہ آم کھانے میں کہاں آتا تھا۔

گرمیوں میں یہ ہمارا پسندیدہ مشغلہ ہوتا تھا، کئی بار پکڑے جانے پر، ابو سے ہمیں ڈانٹ بھی پڑتی تھی لیکن ولی ہر مرتبہ الزام اپنے سر پر لے لیتا تھا۔ میرے لیے تو وہ جان بھی دے دیتا۔ پھر سردیاں آتیں تو ہم لحاف میں دبک کر چلغوزے کھایا کرتے، اشتیاق احمد اور ابن صفی کے ناول پڑھا کرتے، سردیاں ہمارا پسندیدہ موسم ہوا کرتی تھیں۔ ہماری لڑائیاں بھی بہت ہوا کرتی تھیں، کبھی کبھار ناراضی اتنی ہوتی کہ ہم بول چال بھی بند کر دیتے لیکن کبھی بھی ایک دن سے زیادہ ناراض نہ رہتے۔

ولی میرے پاس آتا میں اُسے نظر انداز کرتا اپنی کتاب پڑھتا رہتا، حالانکہ میں کن انکھیوں سے اُسے ہی دیکھ رہا ہوتا تھا۔ پھر وہ با آواز بلند کہتا۔

"جو شخص اپنے بھائی سے تین دن سے زیادہ ناراض رہتا ہے اس کی نماز قبول نہیں ہوتی۔"

میں بے ساختہ مسکرا دیتا، کبھی وہ میرا پسندیدہ کھلونا لے آتا تو کبھی آکر، مجھے بتاتا کہ پچھلی گلی والے انکل نے نئی گاڑی لے لی ہے اور میں جلدی سے اٹھ کر، اس کے ساتھ باہر بھاگتا اور یوں ہماری صلح ہو جایا کرتی۔

ہمیشہ ولی ہی مجھے منایا کرتا تھا میں نے اسے کبھی منانے کی کوشش نہیں کی کیونکہ مجھے لگتا تھا کہ میں اس سے ایک سال بڑا ہوں تو اسے ہی منانا چاہیے۔ اور وہ ہمیشہ مجھے منا لیا کرتا تھا۔

ولی جب پیدا ہوا تب ہماری امی کا انتقال ہو گیا تھا۔ ان کے جانے کے بعد ہمیں ابو نے پالا تھا انہوں نے ہی ہمیں چلنا اور بولنا سکھایا تھا۔ میں نے جو پہلا لفظ سیکھا وہ "ابو" تھا۔ لیکن ولی نے جو لفظ سیکھا وہ "عمر" تھا۔

☆☆☆

15 اکتوبر 2002

میں نے اور ولی نے بہترین نمبروں سے میٹرک کا امتحان پاس کیا تھا۔ ہم دونوں نے کالج میں داخلہ کے لیے درخواستیں بھی جمع کروا دی تھیں۔ ولی کا نام، شہر کے اوّل نمبر کے کالج کی میرٹ لسٹ میں تھا، جبکہ میرا دوسرے نمبر کے کالج میں، لیکن ولی نے داخلہ میرے کالج میں لے لیا۔ جس نے بھی سنا وہ حیران ہوا کہ بھلا اوّل نمبر کے کالج کو بھی کوئی چھوڑتا ہے کیا؟ حتیٰ کہ میں نے بھی اس سے پوچھا۔ اس کا کہنا تھا۔ "عمر اور ولی ہمیشہ ساتھ رہیں گے"۔

سال گزرتے گئے، ہم کالج سے فارغ التحصیل ہو کر یونیورسٹی میں داخل ہو گئے تھے۔ یہاں بھی ہم ساتھ تھے۔ بچپن گزرا تو ترجیحات بھی بدل گئیں۔ اب ہم راتوں کو جاگ، کر ناول پڑھنے کے بجائے اسائنمنٹ بنایا کرتے تھے، ہمارے گھر ٹی وی آ گیا تھا اور اب ہمارا پسندیدہ مشغلہ "نیشنل جیوگرافک" کے ایڈونچر دیکھنا ہوتا تھا۔ اب ہم سائیکل کی ریس لگانے کے بجائے کرکٹ کھیلا کرتے تھے اور محلے کے لڑکے کہیں ہمیں کھیل سے باہر نہ نکال دیں، اسی لیے ہم کبھی بھی مخالف ٹیم میں نہیں ہوتے، بلکہ ہمیشہ ایک ہی ٹیم میں ہوا کرتے تاکہ ہمیں ایک دوسرے کے مخالف نہ کھیلنا پڑے۔

لیکن ایک چیز جو نہیں بدلی تھی وہ "عمر ولی" کی وہ بینچ تھی جس پر ہمارا نام ہمیشہ کے لیے لکھا رہ گیا تھا۔ ہم آج بھی تھک کر اس بینچ پر بیٹھ جاتے تھے۔ اپنی قوت بڑھانے کے لیے جوس پیتے، کبھی ایک دوسرے کا مذاق اڑاتے، تو کبھی ڈوبتے سورج کے سامنے بیٹھے مستقبل کے لیے اونچے اونچے خواب دیکھتے، اور اندھیرا ہوتے ہی گھر واپس چلے جایا کرتے تھے۔

ہم نے اپنی تعلیم ساتھ ہی مکمل کی، اور ڈگریاں لینے کے بعد خوشی سے ایک دوسرے کو گلے لگایا تھا۔ یہ منظر ابو نے اپنے کیمرے میں قید کر لیا تھا۔ کیمرا رول سے تصویر نکلوانے کے بعد ابو نے ہماری تصویر فریم کروا کے دیوار پر لگا دی تھی۔ ہم دونوں ایک ہی جیسے قد کاٹھ کے تھے، کالے گاؤن پہنے اور سر پر گریجویشن کیپ لگائے ہم نے ایک دوسرے کے کندھوں پہ ہاتھ رکھا ہوا تھا۔ میرے چہرے کے خدوخال ابو جیسے تھے بلکہ ملنے جلنے والے تو کہتے تھے کہ ابو بھی اپنی جوانی میں، بالکل میرے جیسے تھے جبکہ ولی نے ہوبہو امی کے خدوخال لیے تھے۔ وہی معصوم چہرہ اور ہر دم قائم رہنے والی مہربان مسکراہٹ۔ اور امی کی طرح وہ بھی مجھ سے بہت پیار کرتا تھا۔

☆☆☆

3 جنوری 2008

ہم دونوں نے ایک ہی آفس میں نوکری شروع کی تھی اور یہ ہماری قسمت تھی کہ ہمیں ایک ہی آفس میں کام مل بھی گیا تھا۔ قدرت بھی ہمیں ساتھ ہی رکھنا چاہتی تھی۔

ہمارے اب بھی جھگڑے ہو جایا کرتے تھے اور ولی اب بھی مجھے منا لیا کرتا تھا۔ ہمیں یہاں کام کرتے ہوئے ایک سال گیا تھا۔ سب کچھ ٹھیک تھا لیکن پھر ایک دن آفس میں ایک نیا ایمپلائی آیا۔ وہ مزاج کا کافی گرم اور زبان کا تیز تھا۔ دو ایک بار میری بھی اس سے تلخ کلامی ہوئی تھی، جس کی وجہ سے وہ چند ہی دنوں میں مجھے سخت ناپسند ہو گیا تھا۔

اس دن آفس کی طرف سے اُسے کوئی ضروری کام دیا گیا تھا، وہ اپنے سسٹم پر وہی کر رہا تھا۔ وہ کچھ دیر کے لیے اٹھ کے باہر گیا تو مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ اس کا سسٹم بند کر دیں کیونکہ وہ سارا کام آخر میں محفوظ کرتا تھا۔

"کیا کر رہے ہو عمر؟" ولی نے مجھے اس کے سسٹم سے چھیڑ چھاڑ کرتے دیکھ لیا تھا۔

"تمہارا دماغ تو صحیح ہے؟ وہ بے چارہ صبح سے کتنی محنت سے کام کر رہا ہے۔ تم کیوں اس کی محنت پر پانی پھیرنا چاہتے ہو؟"

"تا کہ اس کی ساری زبان درازی اور اکڑ نکالی جا سکے" میں نے نفرت سے کہا۔

"تمہیں اس کی تلخ زبان سے کیا مسئلہ ہے؟"

"تم کیوں اس کی طرف داری کر رہے ہو؟"

"میں کسی کی طرف داری نہیں کر رہا، میں تمہیں سمجھا رہا ہوں کہ کسی کا نقصان کرنا بہت بڑا گناہ ہے؟"

"اور وہ جو اتنی بدتمیزی سے بات کرتا ہے؟"

"تو؟ اگر وہ بدتمیزی سے بات کرتا ہے تو یہ اس کا فعل ہے تم اس سے بات نہ کیا کرو، لیکن اس نے تمہیں کوئی نقصان تو نہیں پہنچایا ناں۔" میں لاجواب ہو گیا تھا۔

"مجھے تمہاری بات نہیں سننی۔"

"میں تمہیں وارن کر رہا ہوں، ایسا مت کرو" اس نے سختی سے کہا۔

"ورنہ کیا کرو گے؟"

"میں بتا دوں گا باس کو" میں نے اچنبھے سے اُسے دیکھا اور اُسے دیکھتے ہوئے ہی بس ایک بٹن دبایا اور سارا سسٹم بند ہو گیا۔ وہ ہکا بکا رہ گیا۔

"یہ کیا کیا تم نے؟"

"جاؤ بتاؤ اب باس کو۔۔۔۔" میں کہتے ہوئے واپس اپنی کرسی پر جا کر بیٹھ گیا۔

وہ حیرت سے مجھے دیکھتا رہا اور پھر غصے سے وہاں سے چلا گیا۔ میں جانتا تھا کہ وہ جتنا بھی غصہ کرے، کبھی میری شکایت نہیں لگائے گا۔ تھوڑی دیر بعد جب میرا کولیگ، واپس آیا تو اپنی محنت کو برباد ہوا دیکھ کر سر پکڑ کر رہ گیا تھا۔ مجھے ایک عجیب سی خوشی ہوئی تھی۔ لیکن یہ خوشی دیرپا ثابت نہ ہو سکی کیونکہ کچھ ہی دیر میں باس نے مجھے اور میرے کولیگ کو کمرے میں بلایا۔ وہاں ولی بھی موجود تھا۔ مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔

اس نے اُنہیں سب بتا دیا تھا اور جب بھائی ہی خلاف گواہی دے دے تو کون یقین کرے گا۔ مجھے باس نے سخت سست سنائیں اور اُسی لمحے مجھے یہ کہہ کر فائر کر دیا کہ اُنہیں کسی خودغرض انسان کی ضرورت نہیں ہے۔

آفس سے نکلتے ہوئے میں نے ایک نظر ولی کو دیکھا، اس کے چہرے پر افسوس تو تھا لیکن شرمندگی نہ تھی، جیسے اُسے یقین ہو کہ اس نے جو بھی کیا صحیح کیا تھا۔

اس کے بعد میری اس سے بول چال بند ہو گئی، مجھے لگا کہ شاید وہ مجھے منانے آئے گا پر وہ نہیں آیا، حتیٰ کہ اس نے میرے نوکری سے نکالے جانے کے بعد بھی نوکری نہیں چھوڑی، حالانکہ وہ کبھی بھی اس جگہ پر نہیں رہتا تھا جہاں سے مجھے نکال دیا جائے۔ ایک کے بعد ایک میرے تمام اندازے غلط ثابت ہو رہے تھے۔ ایسا پہلی بار ہوا کہ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو منانا تو دور کی بات، مخاطب کرنا بھی چھوڑ دیا تھا۔

☆☆☆

5 مئی 2008

گھر میں میری شادی کی تیاریاں چل رہی تھیں، اس واقعے کے کچھ عرصے بعد ہی مجھے دوسری نوکری بھی مل گئی تھی۔ لیکن میری اور ولی کی بول چال اب تک بحال نہ ہو سکی تھی، ابو نے ہمارے درمیان کا یہ تناؤ محسوس کر لیا تھا لیکن کہا کچھ نہیں، شاید شادی کی وجہ سے، گھر مہمانوں سے بھرا پڑا تھا اور وہ سب کے سامنے بات نہیں کرنا چاہتے تھے۔ کئی مرتبہ میں نے سوچا کہ میں ہی، اُسے منا لیتا ہوں لیکن ہر بار باس کے آفس میں ہوئی اپنی تذلیل یاد آ جاتی۔

ٹھیک ہے مجھے یہ احساس ہو گیا تھا کہ غلطی میری تھی لیکن کیا یہ صحیح تھا کہ ولی میری شکایت لگا دیتا؟ وہ مجھے بعد میں آرام سے سمجھا بھی تو سکتا تھا نا؟ اور پھر وہ اب تک مجھے منانے بھی نہیں آیا۔

میرے نکاح سے دو روز قبل، میں نے اُسے ابو سے کہتے سنا کہ اس نے کمپنی کی جانب سے لاہور میں، ایک پروجیکٹ سائن کیا ہے۔ اسی سلسلے میں اسے وہاں منتقل ہونا ہے۔ چونکہ کام تین سے چار سالوں پر محیط تھا۔ اسی لیے رہائش کا انتظام بھی ان ہی کی جانب سے کیا گیا تھا۔

"کب جانا ہے؟" ابو نے پوچھا، میں بظاہر ٹی وی دیکھ رہا تھا لیکن میرے کان اُسی جانب لگے تھے۔

"کل۔۔۔" اس نے بتایا۔ اور پھر وہ چلا گیا۔ اس نے میرے نکاح تک رُکنا گوارا نہ کیا۔ جب وہ سامان باندھ کر، دروازے پر ابو سے گلے مل رہا تھا تو میرا دل چاہا، اُسے روک لوں۔ اس سے کہوں کہ دو دن بعد چلا جائے۔ میں کہتا تو وہ ضرور مان لیتا کیوں کہ وہ میری کسی بات کو رد نہیں کرتا تھا۔ لیکن میری انا نے مجھ سے کہا کہ، جب اُسے احساس نہیں ہے کہ اس کے بھائی کی شادی ہے تو میں کیوں اُسے روکوں؟ میں اس سے بڑا ہوں، اُسے آنا چاہیے میرے پاس، میں نے اُسے نہیں روکا۔ جب وہ جانے کے لیے گاڑی میں سامان رکھ رہا تھا تو ایک لمحے کو میں نے اپنی انا کو بھلا کر اس سے کہا۔

"خیال سے جانا۔۔۔"

اس نے مجھے دیکھا اور آگے بڑھ کر، مجھے گلے لگایا پھر خدا حافظ کہہ کر چلا گیا۔ وہ جیت گیا تھا۔ اس نے مجھے گلے لگانے میں پہل کی تھی۔ لیکن اُسی لمحے میری انا نے پھر مجھ سے کہا۔

"وہ معافی بھی تو مانگ سکتا تھا نا؟ اس نے معافی تو نہ مانگی۔"

☆☆☆

7 جولائی 2012

ولی کی شادی تھی وہیں لاہور میں۔ ابو دو ماہ پہلے سے ہی اس کے پاس رہنے جا چکے تھے۔ مجھے بھی ساتھ چلنے کو کہا لیکن میں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ابھی دو ماہ باقی ہیں ناں، میں بعد میں جاؤں گا۔ لیکن میں شادی پر بھی نہیں گیا، اپنی بیوی اور دونوں بیٹیوں کو بھیج دیا لیکن اپنے کام کا بہانا بنا کے خود میں کراچی میں ہی رہا تھا۔

ولی لاہور میں مستقل طور پر رہائش پذیر ہو گیا تھا۔ اُسے کمپنی کی جانب سے دوسرا پروجیکٹ بھی وہیں دے دیا گیا تھا۔ خود وہ کراچی ایک مرتبہ بھی نہیں آیا تھا، البتہ ابو اس کے پاس رہنے چلے جایا کرتے تھے لیکن زیادہ تر وہ، میرے پاس ہی رہتے تھے کیونکہ میری دونوں بیٹیوں میں ان کی جان اٹکی رہا کرتی تھی۔

ولی سے میری پچھلے چار سالوں میں کوئی بات نہ ہوئی تھی، ابو سے ہی اس کی خیر خیریت پتا چل جاتی تھی۔ انہوں نے کئی بار مجھے سمجھانے کی کوشش کی لیکن میں نے ان کی بات نہ سنی۔

ولی کا یوں اچانک میری شادی سے چلے جانا

مجھے بہت برا لگا تھا۔ وہ چھوٹا تھا، مجھ سے اپنی غلطی کی معافی نہ بھی مانگتا تو مجھ سے ملنے تو آ ہی سکتا تھا نا؟ کم از کم بات کرنے میں ہی پہل کر لیتا لیکن جب، وہ ایسا نہیں کر رہا تھا تو میں کیوں کرتا؟ میں نے بھی اس سے دوبارہ کوئی بات نہ کی، مجھے آج بھی اپنے سابقہ آفس میں ہوئی وہ تذلیل نہیں بھولتی تھی جس کی وجہ، صرف ولی تھا اور وہ بجائے معافی مانگنے کے اکڑ کے بیٹھا تھا۔

میری انا ہمیشہ مجھے بھلا دیتی تھی کہ جاتے ہوئے، مجھے گلے لگانے میں اس نے ہی پہل کی تھی۔

☆☆☆

9 نومبر 2014

میں اپنی بیٹیوں کو اسکول چھوڑ کر اپنے آفس کی طرف رواں دواں تھا، جب مجھے ابو نے کال کر کے بتایا تھا کہ ولی کا ایکسڈنٹ ہوا ہے۔ وہ رو رہے تھے، وہ لمحہ...... بس وہی لمحہ تھا جب میں نے سب بھلا دیا۔ مجھے کچھ یاد نہ تھا، کون سا جھگڑا، کیسی ناراضی؟ میرا بھائی حادثے کا شکار ہوا تھا، اس کے پاس کوئی نہیں تھا اور مجھے وہاں جانا تھا۔ میں نے گھر آتے ہی اپنا سامان باندھا اور ابو کو تسلیاں دیتا لاہور کے لیے نکلا۔ ابو بیمار تھے، انہیں ڈاکٹر نے سفر کرنے سے منع کیا تھا اسی لیے وہ ساتھ نہیں جا سکتے تھے۔ تقریباً ڈھائی گھنٹے کے بعد میں لاہور میں موجود تھا۔ ہسپتال پہنچتے ہی مجھے جو اطلاع ملی اس نے میرے رونگٹے کھڑے کر دیے تھے۔ وہ اپنی فیملی کے ساتھ تھا جب اس کا ایکسڈنٹ ہوا تھا۔ اس کی بیوی جانبر ثابت نہ ہو سکی تھی۔

خود وہ تشویش ناک حالت میں لایا گیا تھا۔ میں اس سے ملنے گیا تو وہ مصنوعی سانسوں کے ذریعے زندہ تھا۔ چہرے پر جگہ جگہ زخم لگے تھے، شدید کرب کے عالم میں وہ آنکھیں کھولے مجھے ہی دیکھ رہا تھا۔ میں اس کے پاس بیٹھ گیا۔ اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اُسے یقین دلایا کہ میں اس کے پاس ہی ہوں اور وہ جلد ٹھیک ہو جائے گا۔ اس نے مجھ سے کہا۔

"تم مجھ سے ناراض تو نہیں ہو؟" مجھے لگا میں شرم سے زمین میں گڑ گیا ہوں۔ میں اس سے کیسے ناراض ہوتا؟ وہ میرا بھائی تھا، میرا واحد دوست۔۔۔

"تم ہمیشہ منا تو لیتے ہو۔" میں نے کہا تھا۔

پھر میں پوری رات اس کے پاس ہی بیٹھا رہا۔ کوئی گلہ کوئی شکوہ نہ کیا، بس پرانی باتیں یاد کرتا رہا۔ بچپن کی باتیں، میری اور اس کی باتیں۔۔۔ میں نے اُسے بتایا کہ میں جب اپنی بچیوں کے ساتھ پارک جاتا ہوں تو اُسی بینچ پر بیٹھتا ہوں، جہاں اس نے میرا اور اپنا نام لکھا تھا، گو کہ اب وہ کافی حد تک مدھم ہو چکا تھا لیکن "عمر ولی" آج بھی پڑھنے کے قابل تھا۔

میں نے اُسے یقین دلایا کہ جب وہ ٹھیک ہو جائے گا تو ہم دونوں واپس کراچی چلیں گے۔ اُسی بینچ پر جا کر بیٹھا کریں گے۔ میں نے اُسے بتایا کہ پچھلی گلی میں جو انکل رہا کرتے تھے، وہ اب گاڑیاں نہیں بدلتے جیسے پہلے بدلا کرتے تھے۔

"شاید وہ غریب ہو گئے ہیں" میں نے اندازہ لگاتے ہوئے کہا تو وہ شدید تکلیف کے باوجود بھی ہنس پڑا۔

مجھے اس دن اپنا بچپن شدت سے یاد آ رہا تھا۔ جب ہم راتوں کو چلغوزے اور مونگ پھلیاں کھایا کرتے تھے، بچوں کے لیے لکھے گئے ناول پڑھا کرتے تھے۔ بچپن کتنا اچھا تھا نا؟ لڑتے بھی تھے، جھگڑتے بھی تھے لیکن قطع تعلقی سے ڈرتے تھے۔ فوراً سے مان جایا کرتے تھے۔ صبح فجر تک میں اس سے پرانی باتیں کرتا رہا، وہ صرف مجھے دیکھ کر مسکراتا رہا پھر اچانک بولا۔

"میرا ایک بیٹا ہے، تُم جانتے ہو نا؟" میں جانتا تھا۔ اس کا چند ماہ کا بیٹا تھا۔ وہ معجزاتی طور پر اس حادثے میں محفوظ رہا تھا۔

"عمر! میرا ایک کام کرو گے؟" اس نے پوچھا۔

"تمہارے لیے جان بھی حاضر" میں نے پیار سے کہا تھا۔ وہ یہ سن کر جیسے مطمئن ہو گیا تھا

☆☆☆

10 نومبر 2021

محمد ولی

ولد محمد فرید

قبر پر لگی تختی پر لکھا ہوا تھا۔ آج میں اس کی ساتویں برسی پر فاتحہ پڑھنے قبرستان آیا ہوں۔ ہر بار قبرستان آتے ہوئے مجھے وہ دن یاد آتا ہے جب میں نے، ولی کو اپنے ہاتھوں سے قبر میں اتارا تھا۔ سب چلے گئے تھے لیکن میں قبر کے سرہانے ہی بیٹھا رہا تھا۔ مجھے لگا تھا کہ میں اپنے بھائی کو یہاں چھوڑ کے جانے کی ہمت نہیں کر سکتا، سب مجھے کہتے رہے صبر کرو، میں کیسے صبر کروں؟ میرا بھائی چلا گیا تھا۔

ہر بار اس کی قبر پر آتے ہوئے مجھے ایسا لگتا ہے کہ جیسے میں واپس نہیں جا پاؤں گا۔ لیکن مجھے جانا ہوتا ہے، اپنے ابو کے لیے، کیونکہ ولی کے جانے کے بعد وہ مزید بیمار ہو گئے ہیں۔ ان کو اپنے بیٹے کا دُکھ ہے لیکن مجھے تو دُکھ کے ساتھ ساتھ پچھتاوے بھی ہیں۔ اب میں سوچتا ہوں کہ کاش میں وہ ساڑھے چھ سال ولی سے ناراض ہو کر نہ گزارتا، اگر مجھے پتا ہوتا کہ وہ اتنی جلدی چلا جائے گا تو میں اُسے کبھی جانے ہی نہیں دیتا۔ وہ بھی تو انتظار کرتا ہو گا کہ اس بار پہلے میں اُسے منا لوں، وہ بھی تو چاہتا ہو گا کہ پہلے میں ناراضی ختم کروں، کاش کہ میں خود ہی اس کو منا لیتا! ہم اُن ساڑھے چھ سالوں کا ایک ایک لمحہ ساتھ گزارتے۔ لیکن میری تو انا میری محبت سے زیادہ بڑی تھی۔ میں آج بھی اس بینچ پر جا کے بیٹھ جایا کرتا ہوں، جہاں اس کی لکھائی میں "عمر ولی" لکھا ہوا ہے۔ لیکن اُسے لکھنے والا خود دوسرے جہان جا چکا ہے، آج بھی پڑوسیوں کے درخت پر کیریاں لگتی ہیں لیکن اُنہیں توڑنے والا اب کبھی واپس نہیں آئے گا۔ ہماری گریجویشن کی آخری تصویر آج بھی دیوار پر لگی ہے اور میں روز، وہاں سے گزرتے ہوئے اُسے دیکھتا ہوں۔ میرا دل کٹ کے رہ جاتا ہے۔ کاش وہ زندہ ہوتا۔

کوئی میرا سب کچھ لے لے، لیکن میرا بھائی واپس لا دے، اُسے نہ لا سکے تو وہ ساڑھے چھ سال ہی واپس لا دے جس میں، میں نے اس سے قطع تعلق کیا تھا۔ میں اس سے پھر کبھی ناراض نہ ہوں گا۔ ہماری انا ہم سے ایسا کیوں کرواتی ہے؟ کیوں ہمیں پچھتانے کے لیے چھوڑ دیتی ہے؟

"بابا! گھر چلیں؟" ولی نے میرے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا تو میں نے سر اٹھا کر اُسے دیکھا۔ وہی معصوم چہرہ اور مہربان مسکراہٹ جو اس کے باپ کے چہرے پر ہوا کرتی تھی۔ ولی نے اپنی آخری سانسیں لیتے ہوئے اپنے بیٹے کی ذمہ داری مجھے سونپی تھی۔

"کیا نام ہے تمہارے بیٹے کا؟" میں نے اس سے پوچھا تھا۔

"عمر۔۔۔ عمر ولی" اس نے کہا تھا۔ یہ ولی کی میرے لیے محبت تھی۔

اس کے بیٹے کا نام، تمام کاغذات میں عمر ہی تھا لیکن میں اُسے ولی پکارتا تھا کہ یہ ولی کے لیے میری محبت تھی۔ وہ کہتا تھا کہ عمر ولی ہمیشہ ساتھ رہیں گے۔

میں نے کھڑے ہوتے ہوئے اس کا ہاتھ تھاما اور اس کے ساتھ چلنے لگا۔

"بابا! آپ مجھے راستے سے آئس کریم لے کر دیں گے؟" اس نے معصومیت سے پوچھا۔ میری بیٹیوں کی طرح وہ بھی مجھے بابا کہتا تھا۔ میں نے مسکراتے ہوئے اُسے دیکھا اور پیار سے کہا،

"تمہارے لیے جان بھی حاضر"

وہ ہنسنے لگا تو میں بھی مسکرا دیا۔ ہم دونوں باتیں کرتے ہوئے گھر کی جانب رواں دواں ہے۔ میں نے یہ سوچ لیا ہے کہ میں اپنے بچوں کو معاف کرنا اور معافی مانگنا دونوں سکھاؤں گا۔ میں انہیں پہل کرنا سکھاؤں گا۔ اور انہیں بتاؤں گا کہ

"انا" محبت سے بڑی نہیں ہونی چاہیے۔

❁

کاٹ رہی تھیں تو میں اوپر آگئی۔ ابھی سالن تیار ہوجائے گا اور روٹیاں تانیہ بنالے گی۔" چاچی، چاچو تو گھر میں نہیں کہ بندہ ادھر ہی چلا جائے۔ نفیسہ، سعدیہ بہت یاد آرہی ہیں۔"

"آجائے گی نزہت کل شام تک کہہ رہی تھی جلدی آجائے گی۔"

وہ اداسی سے نیچے دیکھ رہی تھی۔ جامن کے گھنے درخت کی چھاؤں تلے اس کی نزہت چچی لوہے کا چولہا لے آتیں۔ گرمی میں کھانا یہاں پکاتیں کبھی پکوڑے تلے جارہے ہیں، گھر کی ہی کسی سے کڑھی بن رہی ہے۔ منشا اول تو ان کے پاس ہی پہنچ جاتی نہیں تو اوپر چھت سے براہ راست شامل رہتی۔

دونوں گھر ملے ہوئے تھے۔ ان کے گیٹ کے ساتھ ہی افتخار چاچو کا گیٹ تھا۔ نزہت چچی بہت محبت کرنے والی خاتون تھیں، امی نے خود انہیں افتخار چاچو کے لیے پسند کیا تھا۔

پھر دادی جان نے ان کے آنے سے پہلے ہی گھر دو برابر حصوں میں تقسیم کرکے درمیان میں دیوار کھینچ دی کہ آپس کی رنجشیں ساری عمر پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ اچھے تعلقات کے لیے، ان کا الگ رہنا ہی بہتر تھا اور وقت گواہ ہے کہ امی اور نزہت چچی میں چھوٹی اور بڑی بہن ہی کی طرح کی محبت تھی، بھلے وہ اپنے اپنے گھر کی حکمران رہی ہوں مگر ایک دوسرے پر حکمرانی کا کبھی کسی نے سوچا تک نہیں۔

بہت ہی پیارے چمکتے سانولے سے رنگ کی منشا کو اپنے چچا، چچی بہت پیارے تھے۔ وہ دوسرے نمبر پر تھی، پہلے نمبر پر سونیا اور آخر میں تانیہ، سب سے چھوٹا عاصم جو ابھی آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ نزہت چچی کی نفیسہ اور سعدیہ سے بڑا جواد تھا۔ کسی اچھی سی جاب کی تلاش میں تھا۔

منشا نے بھی ایم بی اے کے بعد کئی جگہ جاب کی کوشش کی، ناکامی ہوئی اور ذرا ذرا سی ٹیوشنز کے لیے دل آمادہ نہیں ہوا تھا۔ امی کا خیال تھا، اسے گھر داری میں بھی طاق ہونا چاہیے۔ تینوں بہنیں ہی گھر کے کام کاج میں دلچسپی لیتی تھیں۔ وہ بہت اچھا تو نہیں مگر کافی اچھا، روٹی سالن بنالیتی تھی۔ سونیا کے ہاتھ میں بہت ذائقہ تھا۔ امی کو اس کے ہاتھ کا کھانا بہت پسند تھا، امی نے اس پر بہت محنت کی تھی۔ وہ اپنی طرف سے ہر ہنر میں ہی طاق تھی۔ سلیقہ شعار، وفادار، کم گو سی۔

وہ جلدی سے نیچے اترنے لگی، ٹوکری اٹھاکر آلو مٹر دھوئے اور سالن میں ابھی پہلا چمچہ ہی چلایا تھا کہ موبائل کی بیل نے اسے اپنی طرف متوجہ کرلیا تھا۔

"سونیا آپی! آپ کا فون ہے۔" سلمان کالنگ کے الفاظ نے اس کے اندر سکون اتار دیا تھا۔

"چلو خیال تو آیا انہیں بھی۔" لیکن سونیا آپی اسے مزید پریشان دکھائی دے رہی تھیں۔ سونیا آپی کی سلیقہ شعاری، کم گوئی ہی گلے کا پھندا ثابت ہورہی تھی۔ کچھ بولتی ہی نہ تھیں۔

سلمان بھائی بھی کوئی بہت زیادہ الٹرا ماڈرن مرد نہ تھے مگر بیوی کو طعنوں کی زد میں رکھنا جیسے ان کا مشغلہ تھا۔

اسے سونیا آپی کی معصومیت پر بہت ترس آتا تھا، ساس نندوں کو تو ایسی خدمت گزار بہو بہت پسند آئی تھی، مگر سلمان بھائی اکثر لتاڑ کر رکھ دیتے تھے۔ ان کی طبیعت میں ایک عجیب سا بچپنا تھا۔

آپی باہر فون پر بات کررہی تھیں سہمی سہمی سی۔ اس کا سلمان بھائی کو کھری کھری سنانے کا دل چاہ رہا تھا۔ اس نے سالن کو جلدی سے پانی کا چھینٹا دے دیا کہ وہ بھی، اس کی جلی ہوئی سوچوں کی طرح جل ہی نہ جائے۔

☆☆☆

سکھ چین کی ٹھنڈی چھاؤں تلے سب کرسیاں ڈالے سلمان کے اردگرد ہی جمع تھے۔

"سلمان بیٹا! تمہاری بیوی ہے۔ جیسے چاہے رکھو مگر اس طرح سے کسی کی دل آزاری بھی کوئی اچھی بات نہیں، خیال رکھا کرو بیٹا، میری صرف سونیا ہی بیٹی نہیں تم بھی میرے ہی بیٹے ہو، اگر اس کی طرف سے کوئی کوتاہی ہوئی ہے تو میں معذرت کرلیتی ہوں تم سے۔"

امی بیٹیوں کی ماؤں کی طرح داماد کے سارے نخرے برداشت کرنے کو تیار تھیں۔

"شادی کو ابھی سال بھی نہیں ہوا۔ ایک دوسرے کو سمجھنے کے لیے بہت وقت پڑا ہے۔ کہیں بھی ایڈجسٹ ہونے میں وقت تو لگتا ہے۔ کوئی بات اگر اچھی نہیں لگ رہی تو اسے بتادو، یہ خیال رکھے گی۔"

تانیہ کی اپنی سوچ تھی سر پر دوپٹہ لیے چائے کے کپ سب کو پکڑاتی وہ بہت سمجھدار لگ رہی تھی۔

سلمان بھائی اس کے مشورے پر مسکرائے اور چائے کا کپ میز پر رکھ کر کہنے لگے۔

"خالہ جی! اگر مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہے تو سو بار معافی مانگنے کے لیے تیار ہوں، انسان ہوں تھک ہار کر بندہ گھر آئے اور آگے سے محترمہ رو رہی ہوں اور پوچھنے پر جواب بھی نہ ملے اور بیگم صاحبہ میکے جانے کا کہہ دیں تو بندہ آخر کرے کیا؟ اور چچا جان آپ ہی بتایے، سونیا نے آپ سے میری کیا شکایت کی ہے اگر اسے کچھ برا لگتا ہے تو سب کے سامنے کہے میں ازالہ کرنے کے لیے تیار ہوں، یوں روز روز سب کے سامنے شرمندہ تو نہ کرے۔"

سلمان بھائی نے بات ختم کرکے چائے کا کپ اٹھایا تو اس میں ایک خاموش موٹی سی مکھی تیر رہی تھی کپ واپس رکھ کر بولے۔

"اب اس کی خاموشی کا کیا کروں تانیہ بیٹا!"

"میں اور چائے لے آتی ہوں سلمان بھائی! آپی ایسی ہی ہیں۔" تانیہ ہنستے ہوئے بولی۔

"لو اب تمہاری اپنی بہن ہی تمہیں خاموش مکھی کہہ رہی ہے۔"

اس پر سب ہنسنے لگے تھے، موقع پاکر خاموش

بیٹھا عاصم، پلیٹ میں پڑے گول بسکٹ کھانے لگا۔
سعدیہ، نفیسہ اور منشا سونیا کو دیکھ کر ہنسنے لگیں۔
"او تانیہ بی! سب کے لیے چائے لے بھی آئی۔" ابا نے سب کی توجہ چائے کی طرف دلائی۔
"اور ایک کپ میرے لیے بھی۔" تھکا تھکا جواد بھی چلا آیا تھا۔ اس کے تایا کا گھر تھا، کسی وجہ کی ضرورت شروع سے نہیں تھی۔
"السلام علیکم سلمان بھائی!" گھر کے داماد کی سب ہی عزت کرتے تھے۔
"نہیں، پہلے تم سلمان بھائی کو تو دو پھر میرے لیے بنالاؤ۔"
جواد نے گرم چائے کے کپوں کی ٹرے سلمان کی طرف بڑھادی تھی۔
"اور سناؤ جواد! کیا چل رہا ہے؟" گفتگو کا رخ کسی اور طرف مڑ چکا تھا ماحول خوش گوار ہو چکا تھا۔
"سونیا! تم جلدی سے اپنے کپڑے سمیٹ لو امی جان کا حکم ہے، آج شام تم انہیں گھر پر ملو۔"
سونیا آپی بھی اٹھ کر چل دیں الماری کھولے کپڑے نکال کر بیڈ پر ڈھیر کرنے لگیں۔
"منشا! یہ والا دوپٹہ میں رکھ لوں۔" ایک بڑا سا نیلا دوپٹا جس پر بہت پیارا پرنٹ سجا تھا۔
"اب بیگ میں چلا گیا ہے تو کیا کہہ سکتی ہوں بھلا۔" منشا کو اپنی بہن بہت ہی پیاری ہنسی ہنستی ہوئی اچھی لگ رہی تھی۔ اللہ کرے اب سب اچھا رہے منشا نے دل سے دعا کی۔

☆☆☆

امی نزہت چچی کی طرف گئی تھیں، منشا نے مشین لگالی تھی کہ کافی کپڑے جمع ہوئے پڑے تھے۔ کپڑے نچوڑ نچوڑ کر تار پر ڈالتی جارہی تھی ۔ تانیہ اخبار اپنے سامنے پھیلائے کسی سستی سی ڈش کی تلاش میں سرگرداں تھی۔ ایسی مزے دار ریسپی جس کے سارے اجزاء گھر میں موجود ہوں اور اسے کوئی مشکل پیش نہ آئے۔ کیا ہو سکتی تھی۔
"مونگ کی دال اور اچار سے تو کچھ نہ گرہ سے رہا" منشا نے اسے اخبار سے باہر کی دنیا دیکھنے پر مجبور کر دیا تھا۔
"ملے گا کچھ نہ کچھ۔ پچھلے اتوار کو یاد ہے تم ہی نے ختم کی میری بیگن کے پکوان والی ڈش۔"
"مجھے اگر بھوک نہ ہوتی تو۔"
"ایک کپ چائے مل سکتی ہے لیڈیز!" جواد آج پھر کہیں جارہا تھا۔ یہ ماننے والی بات تھی کہ وہ ہار ماننے والوں میں سے نہیں تھا روز ہی وہ چیک کرتا، کپڑے استری کر کے کہیں نہ کہیں جانے کو تیار رہتا۔ کمال ثابت قدم انسان تھا۔
"آپ کو تو ہم چائے پلادیں گے پر ہمیں چائے کون پلائے گا۔" تانیہ کے ہاتھ کی سب کو چائے ہی پسند تھی۔
"مجھے کہیں جاب مل جائے پھر اپنی کزنز کو کسی اچھے ریسٹورنٹ سے کھانا کھلا کے لاؤں گا۔"
جواد نے چائے کی پہلی چسکی بھری اور خود کو تازہ دم محسوس کرتے ہی، اپنے اس وعدے کو بھی تازہ کرنا ضروری سمجھا۔ جو وہ کتنی ہی بار جاتے ہوئے کر چکا تھا۔ نفیسہ اور سعدیہ کو برانڈڈ ڈریس دلوانے کا وعدہ بھی اسے یاد تھا۔
"اس دفعہ تم لوگ بہت دعا کرنا میرے لیے۔" جواد بہت سارے لوگوں کی امیدوں کا مرکز تھا۔
"پہلے ہی سے کوئی نہ کوئی بندہ رکھ لیا ہوتا ہے اور یہ انٹرویو تو ڈھونگ کرتے ہیں لوگ۔" اس کے لہجے میں نمی اتر آئی تھی۔
منشا کئی ایسے انٹرویوز دے کر آئی تھی لمبے چوڑے اشتہارات، لائنیں اور نتیجہ میرٹ کو پوچھتا ہی کون ہے۔
منشا اداس ہوگئی تھی، اس کا خواب تھا کہ وہ اپنے ابا کی مالی مشکلات کم کرتی۔ چھوٹی سی کریانے کی دوکان، گھر کی گاڑی کھینچتے تھک رہی تھی۔ مگر اس کی محنت سے حاصل کی گئی ڈگریوں نے اسے کچھ بھی نہ دیا تھا۔



"اداس مت ہوا کرو منشا! مجھے اچھا نہیں لگتا۔" جواد خود بھی اداس ہوگیا تھا۔ "میں کرتا ہوں کچھ، تم پریشان مت ہو، کچھ نہ کچھ ہو ہی جائے گا۔"
جواد جو خود کسی نوکری کی تلاش میں تھا، اب اسے بھی کسی اچھی جگہ ایڈجسٹ کروانے کا سوچنے لگا تھا۔ جواد بہت ہی محبت کرنے والا احساس انسان تھا، اس میں کبھی کوئی شک نہیں رہا تھا۔ دونوں اسے جاتا دیکھے گئیں۔

☆☆☆

نفیسہ اور سعدیہ، پرانی تصویریں نکالے بیٹھی تھیں، پاس ہی امی اور چچی بیٹھی تھیں، گرمی میں مسالے دار اچار سے تندوری روٹی کھائی جارہی تھی، کھیر پکائی جارہی تھی اور امی کے دکھ سکھ بھی جاری تھے۔
نزہت چچی، اپنی بہن کے بارے میں سوچ کر ہمیشہ ہی آبدیدہ ہو جایا کرتیں، کوئی سکھ بھی نصرت خالہ کے حصے میں آیا ہی نہیں تھا، ایک تو دل کی مریض اور اوپر سے جیٹھانی کے در پر پڑی تھیں۔ شہلا ان کی اکلوتی بیٹی تھی، وہ ابھی چھ برس کی تھی کہ جب انتظار حسین ان کے بہنوئی روڈ ایکسیڈنٹ میں چل بسے تھے۔ بڑے جیٹھ نے بھائی کا حصہ تو کیا دینا تھا۔ گھر کے کام کاج کے لیے دو دو ملازمائیں مفت کی ہاتھ آ گئیں۔ تو انہوں نے ہاتھ سے جانے نہ دیں۔ شہلا کی خاطر، شوہر کی محبت میں نصرت نے اسی تنکے کو سہارا جانا اور وہیں بیٹھی رہیں۔ جیٹھانی بہت بری نہیں تھی، پر ایسی اچھی بھی نہ تھی نگران کی مجبوری تھی۔ یتیم و یسیر شہلا کے لیے انہوں نے اپنے بیٹے کو سوچ رکھا تھا۔
نزہت چچی کا بھی شہلا کو اپنے گھر لانے اور نصرت کا بوجھ بانٹ لینے کا ارادہ تھا۔
"سعدیہ! یہ والی تصویر لانا ذرا۔ یہ دیکھیں بھابھی! چھوٹی سی شہلا جب ان کے گھر آئی تھی، امی بھی اسے سو دو سو تھمانا کبھی نہیں بھولیں۔
پیلے سے فراک میں ملبوس، معصوم سی شہلا کو امی بچپن سے دیکھتی آرہی تھیں۔ اگلے ہی لمحے میں پہچان کر اس کے نیک نصیب کی دعا کرنے لگی تھیں۔
"سچ اگر نصرت جیسی صابر عورت کی دوسری کوئی بیٹی ہوتی، تو میں اپنے عاصم کے لیے ایک پل بھی نہ سوچتی۔"
دیورانی، جیٹھانی کی سوچ ایک ہی تھی، جس سے سب واقف تھے، نہ اعتراض افتخار احمد کو تھا نہ ابرار احمد کو (منشا کے ابو) کو۔
ہوائیں سرسراتی ہوئی، جامن کے پیڑ سے نکلیں اور سارے صحن میں پتے اڑانے لگیں۔
"موسم بدل رہا ہے بھابھی! ایک بہار ایسی آئے کہ جس کے بعد کوئی خزاں ہمارے نصیب میں نہ ہو۔" نزہت چچی نے دعا کی تھی۔
"اب اٹھ جاؤ تم دونوں بھی ۔ تمہارا بھائی آنے والا ہوگا۔"

☆☆☆

اور وقت بدل گیا جواد کی مستقل مزاجی کام آئی اسے ایک نامور فرم نے بہت اعلا جاب آفر کی تھی۔ وہ اپائنٹمنٹ لیٹر تھامے، ہواؤں پر قدم رکھتا سیدھا ان ہی کی طرف آیا تھا۔ مٹھائی کا ڈبہ لیے اس نے ایک ایک کو پکڑ پکڑ کر منہ میٹھا کروایا تھا۔
"لو بھئی منشا! اب تم بھی تیار ہو جاؤ، تمہاری سیٹ بھی وہیں نکلے گی۔ میں پوری کوشش کروں گا۔"
آج منشا بھی بہت خوش تھی، اس لیے اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔
جواد کی پہلی تنخواہ آتے ہی، نزہت چچی نے مٹھائی کا ڈبہ لیا اور بہار کی خوب صورت شام، کراچی روانہ ہونے سے پہلے جواد سے کہنے لگیں۔
"لو بھئی، اب اپنا گھر بسانے کی بھی تیاری کرلو۔ کچھ میرے پاس جمع جتھا ہے اور کچھ تم پیسے اکٹھے کرلو تو میں، شہلا کو بہو بنا کر گھر لے آؤں۔ بہت دکھ دیکھے ہیں تمہاری خالہ نے۔"
نزہت چچی بہت پرجوش تھیں۔ جواد کو شہلا اور

نصرت خالہ سے محبت تھی ہمدردی تھی۔ ایسا اس نے
کئی بار سنا تھا اور اب ایسا ہونے جا رہا تھا۔
اس کا بچپن ایسی باتیں سنتے گزرا تھا مگر اب
جب وہ آہستہ آہستہ خود کو بھی سننے لگا تھا، جاننے لگا تھا
تو امی مٹھائی لے کر اچی چلی گئی تھیں۔

آفس کیبن میں وہ خالی نظروں سے فائلز کو تکتا رہ گیا
تھا۔ وہ منشا سے ضرور کہہ کر رہے گا۔ امید باقی تھی
اسے کچھ کرنا ہوگا۔

جیسے ہی وہ آفس سے گھر لوٹا تھا۔ تائی جان
کے گیٹ کے سامنے ایک اچھی حالت والی کار موجود
تھی۔ نفیسہ اور سعدیہ بھی گھر نہ تھیں۔ نل کے ٹھنڈے
پانی سے منہ ہاتھ دھو کر وہ صحن میں ٹھک ٹھک گرتی
جامنوں کو دیکھنے لگا وقت کتنی جلدی گزر جاتا ہے وہ
اپنے ہی خیالوں میں گم تھا کہ نفیسہ اور سعدیہ چلی آئی
تھیں۔

"پتا ہے جواد بھائی کون آیا ہوا ہے، ایک
خاتون آئی ہوئی ہیں منشا آپی کو دیکھنے، تائی جان کے
گھر پہلے بھی ایک رشتہ آیا تھا منشا آپی کا، مگر وہ لوگ
لالچی معلوم ہوتے تھے۔ اس لیے ہاں نہیں کی ان
لوگوں نے۔ ریحان دبئی میں ہوتا ہے۔ بہت کھاتے
پیتے لوگ لگتے ہیں اور اتنا مزے دار پلاؤ بنا ہوا ہے۔"
وہ اٹھ کر چل پڑا تھا۔ پتا نہیں وہ کہاں جانا چاہتا تھا۔
کھلے گیٹ سے سیدھا اندر چلا آیا تھا۔ خاتون
کی نظر جواد پر پڑی تو ابا نے بتایا کہ وہ ان کا بھتیجا ہے
وہ دیکھ رہی تھیں۔ اتنا کڑیل جوان یہ بھتیجا تو کوئی
پاگل ہی اگنور کر سکتا ہے، وہ لوگ ان کی نظر میں بہت
ہی شریف تھے کہ انہوں نے پاس کھڑے جواد کے
بجائے اپنی بیٹی کے لیے کسی اور کو چنا تھا۔ کوئی چکر
چلا لیتے تو جواد کو اپنی بیٹی آسانی سے دے سکتے تھے۔
انہیں منشا بہت اچھی لگی تھی اب ان کی بیٹیاں
داماد وغیرہ اسے اوکے کر دیں تو بس وہ شادی کر کے
لے جائیں گے۔ انہوں نے سوچا اور منشا کو اپنے
پاس بٹھا لیا۔

☆☆☆

دونوں طرف ہی خوشیوں نے بظاہر ڈیرے
ڈال لیے تھے۔ نزہت چچی اپنی بھانجی شہلا کو انگوٹھی
پہنا آئی تھیں اور منشا کا رشتہ طے ہونے جا رہا تھا۔
تانیہ، نفیسہ اور سعدیہ مہندی سے ایک دوسرے کے
ہاتھوں پر نقش و نگار بنانے میں مصروف تھیں مگر اداس
بھی تھیں۔

منشا اپنے اور تانیہ کے کمرے میں چلی آئی
تھی۔ ابھی تو اس کا ارادہ کوئی جاب وغیرہ کرنے کا تھا
اور اس کی شادی ہونے جا رہی تھی۔ امی مطمئن تھیں
، ان لوگوں کی کوئی ڈیمانڈ وغیرہ بھی نہیں تھی۔ ریحان
اچھا کما رہا تھا انہیں صرف شریف نیک لڑکی کی تلاش
تھی، جاتے ہوئے وہ تصویر دے کر گئی تھیں اور اس
کی تصویر بھی پرس میں رکھ لی تھیں۔ امی نے کہا تھا کہ
وہ اگر تصویر دیکھنا چاہے تو دیکھ لے۔ جب وہ اندر
آئی تو جواد ٹی وی دیکھ رہا تھا۔
بلب کی روشنی بہت مدھم تھی کمرہ بھی اداس لگ
رہا تھا۔ "اسے ڈھونڈ رہی ہو ناں، یہ لو۔" تصویر اس
کے پاس تھی مڑی تڑی سی۔
"تایا جان نے دیکھنے کو کہا تو میں نے اپنے
پاس ہی رکھ لی۔" جواد کی آواز اسے بھاری معلوم
ہو رہی تھی اور روئی آنکھیں۔
"منشا! تم بہت خوش رہو اور اللہ کرے میرے
دل کو قرار آ جائے۔" وہ دل میں بھی دعا کرتا ہوا
کمرے سے باہر چلا گیا تھا۔ منشا اسے دیکھنے لگی جو
عام سا آدمی تھا۔ "کچھ خاص تو نہیں ہے۔" اس نے
سوچا تھا جیسے سڑک رکشوں، بسوں، میں روز نظر آتے
تھے اسے۔

☆☆☆

ریحان کی دونوں بڑی بہنیں اسے دیکھنے آ رہی
تھیں امی نے کہیں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ شامی
کباب، گرم سموسے، بسکٹ اور گرما گرم روٹیوں کے
ساتھ بروسٹ بھی منگوا لیا تھا۔ میز پر تمام لوازمات
چنے جا چکے تھے۔ بڑی رغبت سے انہوں نے کھانا
کھایا۔ نزہت چچی جان، امی کے ساتھ بیٹھی تھیں،

باتوں باتوں میں منشا کو بھی امی نے اشارے سے
بلوا لیا تھا۔ فیروزی اور سرخ امتزاج والے لان کے
سوٹ میں وہ اچھی لگ رہی تھی۔
"یہ تو کالی ہے باجی! چھوٹی والی ٹھیک ہے۔"
دونوں کی سرگوشی جیسی آواز، منشا کے کانوں میں پگھلے
سیسے کی طرح اتر گئی تھی، وہ خاموشی سے اٹھ کر چلی
گئی تھی۔ ٹھیک ہے کہ انہوں نے مہنگے برانڈڈ سوٹ
پہن رکھے تھے، مگر اندر سے، چھینٹ سے بھی سستی
نکلی تھیں۔ ان کی پھیلی، چوڑی ناک خود ان کا
مذاق اڑا رہی تھی، رنگ بھی کوئی خاص نہ تھے۔ مگر
دوسروں میں عیب نکالنا تو لوگوں کا مشغلہ ہے ناں،
امی اور نزہت چچی بھی ان کے گریز کو بھانپ چکی
تھیں۔ سرخ ٹائلوں والے دھلے فرش اور اس قدر
صاف ستھرے چمکتے گھر کے کونے میں رکھے
تھوڑے سے پانی میں کہیں اس کے دو گرم آنسو بھی
جذب ہو گئے تھے، جس بات کا کسی نے کبھی نوٹس ہی
نہیں لیا تھا، وہ آج شدت سے محسوس ہوئی تھی، ایسی
شدت سے کہ دل درد سے بھرا جا رہا تھا۔
جاتے جاتے وہ منشا کے بجائے تانیہ کے رشتے
کا کہہ کر چلتی بنی تھیں۔
اور تانیہ ایسے گھٹیا لوگوں کو دینے کا کوئی سوچ
بھی نہیں سکتا تھا۔ اس دن اس نے اپنی چھوٹی بہن
تانیہ کو غور سے دیکھا تھا۔ صاف شفاف گوری رنگت،
تیکھے نین نقش وہ واقعی سراہے جانے کے لائق تھی۔
اسے پسند کیا جانا بنتا تھا۔

☆☆☆

گھر کی فضا میں عجیب سے سوگواری بسی تھی امی
پریشان ہو گئی تھیں۔ پتا نہیں کیسے کیسے وہم انہیں
ستانے لگے تھے۔ منشا چپ ضرور ہوئی تھی، اسے بھی
اچھا نہیں لگا تھا مگر وہ دل سے لگانے کی قائل نہ تھی۔
سعدیہ نفیسہ نے اسے بانہوں میں بھر لیا تھا،
"ہماری منشا آپی کے وہ لوگ قابل ہی نہ تھے انہیں
کھوٹے کھرے کی پہچان ہی نہ تھی، سونے میں
تولے جانے کے قابل ہیں آپ اور آپ کی سوچ۔"

نفیسہ نے بہت سارے رسالے پڑھے تھے
لیٹرز وغیرہ بھی لکھا کرتی تھی، سترہ اٹھارہ برس کی
سعدیہ اسے محبت سے تک رہی تھی۔
"اور نہیں تو کیا اور آج امی، پکوڑے بھی
بنا رہی ہیں، واپسی پر گرما گرم ملیں گے، پودینے کی
چٹنی کے ساتھ، میں امی سے کہہ آئی ہوں کہ ہم سب
جواد بھائی کے ساتھ آج کھانا باہر کھائیں گے اور
کڑاہی ہماری واپسی پر ہی چولہے پر چڑھے۔" کتنے
پیار کرنے والے تھے۔ اس نے سوچا اور مسکرا دی۔

☆☆☆

کیسی ہے عجب رات یہ کیسا ہے عجب شور
صحرا ہی نہیں گھر بھی مچاتا ہے عجب شور
رات جانے کتنے راز لیے کون سی منزل کی
تلاش میں ہولے ہولے رواں تھی۔
جواد نزہت چچی کی چارپائی پر بیٹھا جامن کے
درخت ہی کی طرح پراسرار لگ رہا تھا۔ آنکھیں
آنکھیں کوئی دلیل کو ڈھونڈ نکالنے کے درپے تھیں، وہ
خواب جو اس نے دیکھا تھا۔ اب اسے حقیقت کا
روپ ضرور ملنا چاہیے۔
"رشتے دلوں سے جڑتے ہیں امی! اور میرا
دل منشا سے جڑا ہے، میں آپ سے کہنا چاہتا تھا۔
میں شہلا کے ساتھ خوش نہیں رہوں گا کبھی۔"
نزہت چچی کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے، وہ
کوئی بہت بری ماں نہیں تھیں مگر ان کی خواہش تھی کہ وہ
شہلا اور اپنی بہن کو سہارا دیں۔ جواد ان کا بیٹا تھا اور
بیٹے اپنی مرضی میں زیادہ خوش رہا کرتے ہیں بیٹیاں
راضی رہ لیتی ہیں۔ مگر جواد بیٹا تھا۔
"تمہاری تائی نے اس طرح کہا نہیں، منشا
کے لیے ابھی وقت ہے، اگر کوئی راستہ نکلتا ہے تو میں
تمہاری خالہ سے خود بات کراوں گی، تمہیں خاموش
رہنا ہوگا۔"
امید کا کوئی سرا تو ہاتھ نہیں لگا تھا مگر اس کے
ہاتھ میں کہیں کوئی جگنو ضرور تھا۔ نزہت چچی کروٹ
بدل کر سونے لگیں۔ ایک طرف دکھی بہن اور دوسری

طرف یتیم بھانجی اس کی انگلی سے انگوٹھی کیسے کھینچ لیتیں۔

"کہاں لا کھڑا کیا تھا جواد نے، کاش وہ کچھ وقت پہلے ہی بتا دیتا۔ اب کوئی وقت تھا بتانے کا، بہت سے لمحے بیت رہے تھے آہستہ آہستہ، اللہ! میں کیا کروں، کیسے بہن کو دیا دلاسا چھین لوں۔ آخر کیسے۔"

☆☆☆

اک بجھاؤ، اک جلاؤ خواب کا کیا ہے
آنکھوں میں رکھ کر سو جاؤ، خواب کا کیا ہے

منشا ٹوٹنے والوں میں سے نہیں تھی۔ یہ تو ایک عام سی بات تھی نہ اس نے الٹی سیدھی کریموں سے اپنا چہرہ خراب کیا نہ کسی اور منفی سوچ میں پڑی، منیرہ ہمدانی اس کی دوست ارفع کی امی تھیں، انہوں نے منشا کو اپنے اسکول کے لیے ایک اچھی آفر دی تھی تنخواہ بھی ٹھیک ٹھاک تھی۔ دوسرے مصروفیت بھی مل جاتی وہ مصروف ہونا چاہتی تھی۔ صبح ہی صبح وہ تیار ہوئی، چادر اوڑھے جب گھر سے باہر نکل رہی تھی کہ کوئی بیل پر ہاتھ دھرنے سے پہلے سوچ رہا تھا۔

"یہ جواد کا گھر ہے؟" اس نے منشا سے پوچھ ہی لیا تھا۔

"آپ کون۔" جواب کے بجائے سوال۔

"جی میں حسان ہوں ان کا کولیگ۔"

"آپ جو بھی ہو، یہ دوسرا گھر جواد کا ہے۔" وہ رکھائی سے بولی۔

وہ ہکا بکا اس عجیب لیے دیے انداز والی کو دیکھنے ہی والا تھا کہ حسان کے سامنے جواد آ گیا تھا۔

"او یار! کتنی دیر سے کھڑا ہوں سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ گیٹ تمہارا ہے کہ یہ دوسرے والا۔"

وہ خوش گوار موڈ میں تھا۔ "منشا رکو میں چھوڑ آتا ہوں، اتنی دور تک پیدل کیسے جاؤ گی۔" جواد نے کہا تو منشا رک گئی تھی۔

وہ دونوں آگے بیٹھ گئے اور منشا پچھلی سیٹ پر دونوں اپنے کھڑوس باس سے متعلق باتیں کرنے لگے تھے۔ انہوں نے منشا کو اسکول ڈراپ کر دیا تھا۔ مشہور معروف نجی اسکول کا اسٹاف سارا ہی ویل ایجوکیٹڈ اور عزت کرنے والا تھا۔ منشا دنوں میں ہی ان میں گھل مل گئی تھی۔

☆☆☆

نزہت چچی کچن میں اکیلی بیٹھی کھیرا کاٹ رہی تھیں، پاس ہی بریانی کو دم لگا رکھا تھا۔ یہ آج پہلا بار ہوا تھا جب گھر کا کوئی کام انہوں نے اکیلے کیا تھا۔ ورنہ تو اتنی ساری بچیوں میں کام بٹتا تھا کہ خبر ہی نہ ہوتی تھی کہ کام ختم ہوا کیسے ہے، کسی نے پیاز کاٹ دی، کسی نے مسالہ پیس دیا، کوئی چاول دھولائی، اتنی گرمی میں گرم چپاتیاں بھی، منٹوں میں تیار ہو جاتیں اور سچ تھا کہ منشا پھرتیلی بھی بہت تھی، اسی لیے چچی اکثر دعوت کا سا اہتمام بھی کر لیتیں، بریانی کسٹرڈ اور دوسرے ایک دو طرح کے میٹھے بنوا لیتیں اور خود ہی دسترخوان سجا کر بیٹھ جاتیں۔

منشا پکوڑے بہت شوق سے بناتی تھی، خاص طور پر برستی بارش میں۔ تھوڑے سے کھانے میں برکت بھی خوب ہوتی مگر آج معاملہ اور تھا۔ پسینے میں شرابور نزہت بار بار اپنا چہرہ صاف کر رہی تھیں۔ جواد نے شام کو ہی گھر لوٹنا تھا۔ سعدیہ، نفیسہ جواد کی شہ پا کر اپنی پھوپھی کی طرف گئی تھیں۔ سارا گھر وہ سمیٹ چکی تھیں فریج میں آخری کچھ شامی کباب پڑے تھے انہوں نے ایک انڈا توڑا تھا، کم ہی نہ پڑ جائے اس لیے کفایت شعاری سے تھوڑا تھوڑا لگائی گئیں ساری ٹکیاں ہی بن گئی تھیں۔ لیموں پیاز ٹماٹر کھیرے ہر شے ہی میسر تھی۔ بریانی تیار تھی۔ جب سے جواد کی جاب لگی تھی بہت کچھ اچھا ہو گیا تھا مگر سب اچھا تو کہیں بھی نہیں ہوتا، کبھی نہیں وہ جانے کن سوچوں میں گم تھیں، اپنی اولاد، ہاں کبھی کبھی اپنی اولاد ہی بڑی آزمائش بن جاتی ہے، اس لیے اولاد کو آزمائش کہا گیا ہے۔

شام کی ٹرین سے کوئی اترا تھا۔ جن کا چچی نے



بڑے دل سے استقبال کیا تھا۔ وہ نصرت خالہ اور شہلا تھیں، جن کے لیے آج صبح سے اہتمام ہو رہے تھے۔ پہلے مہمان تھے جن کے آنے کی خبر آتے جاتے سنائی نہ گئی تھی۔ منشا سوچ کر اداس تھی۔

"چچی آپ بتا ہی دیتیں۔ ہم ہیلپ ہی کروا دیتے۔" ثانیہ جلدی سے کچن بنا کر لے آئی تھی۔

"بس بھئی۔ آج خود ہی کر لیے سارے کام۔" کس دل سے انہوں نے جواب دیا تھا، ناراضی بھی نہ تھی، محبت بھی نہ تھی، عجیب سرد مہری تھی۔ آتی سردیوں کی طرح، یہ رویہ منشا کو محسوس بھی بہت ہوا تھا۔

شہلا بھی کوئی مظلوم سی روتی دھوتی لڑکی نہیں تھی اتنے پیارے بال تھے، شہد رنگ اور سیاہ آنکھیں منشا اور ثانیہ دیکھتی ہی رہ گئیں۔

"وہ اپنا بہت خیال رکھتی ہوگی اسی لیے تو ایسی ہے اتنی پیاری چمکتی رنگت اور دوسرے کا دل موہ لینے والا "انداز"۔ اس کا تو ہر کوئی گرویدہ ہو رہا تھا۔ ثانیہ نے فوراً اس کے سلکی بالوں کا راز حاصل کر لیا تھا۔ وہ شہلا کے ساتھ جڑ کر بیٹھی تھی اپنے مسئلے مسائل لے کر۔

"مگر اس شیمپو سے تو میرے بال گر جاتے ہیں۔"

"تو تم کوئی اور لے لو۔ شاید یہ تمہیں سوٹ نہ کرتا ہو سب سے پہلے تو اپنی ڈائٹ پر دھیان دو تب سب اچھا ہو جاتا ہے۔" شہلا نے مشورہ دیا تھا۔

منشا اور شہلا چھت پر آ گئی تھیں۔

"تمہارا گھر تو بہت بڑا ہے منشا! وہاں کراچی میں تو چھوٹے چھوٹے سے گھر ہیں ہوا اور روشنی کا تو گزر ہی نہیں ہوتا۔"

شہلا نے بھی بی ایس سی کیا تھا حالات چاہے جیسے بھی رہے ہوں، وہ لڑکی مثبت سوچ کی مالک تھی۔ نہ شکوہ نہ شکایت۔ آسمان ستاروں سے بھر چکا تھا، ہر طرف چھائی چاندنی میں منشا اور شہلا نے بے شمار باتیں کی تھیں اور سب سے مضبوط تاثر یہی ابھرا تھا کہ وہ حالات سے گھبرائی ہوئی نہیں تھی۔

ثانیہ چائے کے تین کپ لیے اوپر چلی آئی تھی۔ سب نے مل کر چائے پی، نمکین بسکٹ کھائے اور تب تک نیچے نہیں اترے جب تک نزہت چچی اور نصرت خالہ کھانا کھا کر سونے نہیں چلی گئیں۔

"شہلا! تم نے تو کھانا بھی نہیں کھایا۔ آلو گوشت اور چپاتیاں پڑی ہیں، کہو تو لے آؤں۔" منشا کو یاد آیا تھا۔

"ارے نہیں ڈیئر! اتنا کچھ تو کھلا دیا اب اور بھوک نہیں۔ میں بس سوؤں گی۔" ایسی اپنائیت تھی جیسے برسوں کا ساتھ ہو۔

وہ چچی کا گیٹ پار کر گئی تھی۔ اندھیرا دھیرے دھیرے پھیل رہا تھا۔ وہ بھی جلدی سے لائٹ آف کر کے سو گئی تھی۔

صبح ہی صبح جواد کو شہلا نظر آئی تھی، شہلا کا بچپن کا ناک نقشہ کہیں کھو گیا تھا۔ وہ اب کسی کا بھی دل جیت سکتی تھی شاید جواد کا بھی۔

جب نزہت چچی نے پہلا پراٹھا اتارا اور اسے شہلا کے سامنے لا رکھا، تب جواد کو بولنا پڑا تھا۔

"امی پلیز، مجھے دیر ہو جائے گی۔"

"اس سلسلے میں آپ کو ادھر رابطہ کرنا پڑے گا۔" پراٹھے کا چھوٹا سا لقمہ، گرم چائے کے ساتھ کھاتے شہلا مسکرا کر بولی تھی نصرت خالہ بھی چائے پی رہی تھیں۔

"دے دو ناں، کیوں تنگ کر رہی ہو، اٹھا لو جواد بیٹا!" نصرت خالہ نے ہی مسئلہ حل کر دیا تھا۔

کچن میں ایک خوش گوار سا ماحول تھا، جس میں محبت اور اپنائیت بھی جیسا جواد نے سوچا تھا۔ ویسا کچھ بھی نہیں تھا، شہلا اور نصرت خالہ بالکل بے ضرر طبیعت کی تھیں۔ شہلا نے زبردستی اس کے دل میں گھسنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

"جاؤ اللہ کی امان میں۔" نصرت خالہ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر رخصت کیا تھا، البتہ شہلا صبح

منگوایا حلوہ چمچے سے کھا رہی تھی، نزہت محبت سے اسے دیکھے جا رہی تھیں۔

☆☆☆

نصرت خالہ اور نزہت چچی صبح ہی صبح بازار جا رہی تھیں۔ نزہت چچی نے چادر سر پر لے رکھی تھی جب منشا آئی تھی۔

"چچی! سالن پڑا ہوگا؟ صبح صبح انڈا آلو کھانے کا دل نہیں میرا۔ عجیب ملغوبہ بنا دیتی ہیں امی!"

"چلو شبلا! کچن میں جو نہاری پڑی ہے اسے دے دو۔"

"ارے اسے کیوں بھگا رہی ہیں، میں مہمان تھوڑی ہوں، خود ہی لے لیتی ہوں۔" وہ خود ہی کچن میں گھس گئی تھی اور شبلا اپنی فیورٹ مووی دیکھنے میں مگن رہی تھی۔ جواد فل اسکرین ایل ای ڈی لایا تھا اتنی بڑی تصویر تھی کہ دل دھڑکنا بھول جائے۔ بالکل سامنے کھلی دنیا۔ منشا وہیں اس کے پاس بیٹھ گئی دو پراٹھے بھی پڑے مل گئے تھے، ناشتا شان دار تھا وہ وہیں بیٹھ کر کھانے لگی۔

"اچھا بھئی۔ گیٹ بند کر لو۔" نزہت چچی نے تاکید کی تھی۔ شبلا نے گیٹ بند کیا تھا۔

☆☆☆

شبلا نے چائے بنائی تھی اور جواد نمکو کے پیکٹ کھول رہا تھا، منشا اور تانیہ سموسے کھا رہی تھیں، جب سے جواد کی تنخواہ کا سلسلہ ہوا تھا تب سے وہ اکثر ہی کچھ نہ کچھ لے کر آتا۔ کبھی گول گپے، دہی بھلے، مٹھائی اکثر فرمائشیں بھی ہوتی رہتی تھیں۔ نزہت چچی پاس چارپائی پر بیٹھی تھیں۔

"ارے بچوں! اتنی گرمی میں تمہیں چائے کی سوجھ رہی ہے۔ روح افزا بنا ٹھنڈا ٹھار۔ خود بھی پیو اور شبلا کو بھی پلاؤ بلکہ نصرت آتی ہوگی۔ اسے بھی پلانا۔"

"چچی!" شبلا نے خود کہا ہے کہ وہ چائے سب سے الگ بناتی ہے، اس جیسی چائے کوئی دوسرا بنا ہی نہیں سکتا۔ کوئی دم والی، چائے کا کہہ رہی تھی۔

پتا نہیں کون سا دم درود کرتا ہے اس نے۔"

شبلا ٹرے اٹھائے آرہی تھی۔ پہلا ہی گھونٹ بتا گیا تھا کہ دعویٰ سچا تھا، جواد اور شبلا ساتھ ساتھ بیٹھے کتنے پیارے لگ رہے تھے اور منشا بھی مطمئن سی ہنس رہی تھی۔

"میں نے خواہ مخواہ دل برا کیا رب کی رب ہی جانتا ہے منشا ایسی نہیں ہے۔" چچی کے دل نے بھی گواہی دی تھی۔ "نکالو اب ہزار روپے شرط کے، وہ شبلا کو۔"

منشا نے یاد دلایا تھا اور جواد کو دیتے ہی بنی تھی۔

کل شام کو سیر کا بھی پروگرام سیٹ کیا گیا تھا۔ نزہت چچی خوشی سے نہال ہوگئی تھیں۔ جواد ویسا ہی پرانا جواد لگ رہا تھا۔

☆☆☆

نفیسہ اور سعدیہ کل واپس آگئی تھیں، وہ پھوپھو زاہدہ کی طرف گئی ہوئی تھیں زاہدہ کے اکلوتے بیٹے کی بری کی تیاری خوب زور و شور سے جاری تھی۔ ایسی شان دار شاپنگ۔ سونے کے زیورات، نزہت بھیجنا تو نہیں چاہتی تھیں مگر جواد اور ذیشان کا دوستانہ ڈھکا چھپا نہیں تھا۔ جواد خود جا کر نفیسہ اور سعدیہ کو پھوپھو کے ہاں چھوڑ کر آیا تھا ادھر منشا اور تانیہ کا بھی جانے کا ارادہ تھا مگر شبلا کی آمد نے سب کچھ بھلا ڈالا تھا۔ نفیسہ نہا کر ابھی ابھی نیا سوٹ پہن کر منشا اور شبلا کو دکھانے آئی آئی تھی۔ شبلا کو سوٹ کا رنگ دل سے پسند آیا تھا تو منشا کو کٹنگ اچھی لگی تھی۔

"سچی آپی! یہ سوٹ تو کچھ بھی نہیں ہے جو جوڑے زاہدہ پھوپھو نے بری میں رکھے ہیں۔ ایسے تو بس خواب میں ہی دیکھے جاسکتے ہیں۔ ذیشان بھائی کی دلہن ہیں بھی بے حد پیاری۔ دیکھو تو بس دیکھتے رہ جاؤ زاہدہ پھوپھو خوش بھی بہت ہیں۔ عقان بھائی کی شادی میں سب چلیں گے۔"

"ہاں ضرور، تھوڑے سے تو دن رہ گئے ہیں۔ بڑا عرصہ ہوگیا زاہدہ پھوپھو سے ملے بھی، امی اور میں بھی مل کر آئیں گے۔" شبلا نے سادگی سے کہا۔



اور پھر امی کے لیے چائے بنانے اٹھ گئی۔

☆☆☆

"سونیا آئی تھی مگر اس دفعہ لڑ جھگڑ کر دل برا کر کے نہیں بلکہ شبلا سے ملنے آئی تھی۔ ارے شبلا تم تو بالکل ہی بدل گئیں میری جان۔" ان کی اس بات پر شبلا شرما گئی تھی کیا وہ بھی اچھی لگ سکتی ہے کسی کو۔ سونی نے شبلا کو گلے لگا لیا تھا، نصرت خالہ سے بھی ملی اور پھر کمرے میں اپنا سامان سیٹ کرنے چلی گئی تھی۔

اس بار وہ دبی سہمی ہوئی نہیں تھی بلکہ اچھی خاصی خوش دکھائی دے رہی تھی۔

"اس خوشی کی وجہ؟" منشا اور تانیہ سونیا کے سر پر کھڑی تھیں۔

"تمہارے دولہا بھائی بدل گئے ہیں منشا! یا پھر میں ہی بدل گئی ہوں۔ کمرہ بھی علیحدہ لے کر دینے کا وعدہ کیا ہے اور تم دونوں خالہ بننے کی تیاری کر لو۔"

شبلا بھی سن کر خوشی سے اچھل پڑی تھی۔

"اچھا تو اس لیے اتنی محبت چہرے سے چھلک رہی ہے، امی کو بتایا؟ میں ابھی بتا کر آتی ہوں۔"

تانیہ بھاگ گئی جبکہ سونیا روکتی ہی رہ گئی۔

"ارے بدھو انہیں کب کا بتا چکی ہوں۔ اور تم نے منشا، اپنے بھائی کو کھانے چائے کا بھی پوچھا کہ نہیں، اگر نہیں تو فوراً بھاگو، قورمہ بنایا ہے امی نے ساتھ دو روٹیاں ڈال دو اور چائے دینا مت بھولنا۔"

منشا فوراً چلی گئی تھی۔ بیڈ پر بیٹھی شبلا محبتوں سے بھرے اس گھر کو دیکھتی رہ گئی، ایسے ماحول کی وہ ترسی ہوئی تھی۔

☆☆☆

شبلا نے آج پھر چھت پر رات کا کھانا کھانے کی فرمائش کی تھی۔ منشا نے اپنے پرس سے پیسے نکالے اور عاصم سے کہہ کر برگر منگوا لیے تھے۔ تانیہ چاول اور قورمہ لے کر اوپر آگئی تھی۔ آج موسم بھی پیارا ہو رہا تھا۔ جواد اپنے کمرے میں لیپ ٹاپ پر مصروف تھا۔ اس کے کمرے سے روشنی چھن چھن کر باہر آرہی تھی۔

اس کی شکل کچھ عجیب سی لگ رہی تھی "ڈریکولا کہیں کا" شبلا نے سرگوشی کی تو منشا ہنسنے لگی۔

شبلا چائے پیتے خاموش بیٹھی تھی۔

"کتنا سکون ہے تمہارے گھر میں۔" سب ایک دوسرے کا احساس کرتے ہیں، محبت سے رہتے ہیں، ایسی چاہت مجھے ساری عمر نہیں ملی۔ ابا کے جانے کے بعد زندگی یکسر بدل گئی ہماری۔"

"شبلا! تم اداس مت ہو۔ تم بھی جلد اسی گھرانے کا حصہ بننے والی ہو، وہ وقت گزر گیا لیکن اب تمہاری زندگی میں سکون ہی سکون ہوگا۔ میرا یقین کرو۔"

"وقت کا کیا ہے وہ تو گزر ہی جاتا ہے۔ تمہیں پتا ہے منشا! تائی میری شادی اپنے بڑے بیٹے زوار سے کرنا چاہتی ہیں۔ ہر وقت آنکھیں سرخ رہتی ہیں اس کی۔ سارا دن سویا رہتا ہے۔ وہ نشہ کر کے ختم ہوگیا ہے۔ کبھی کبھی آنکھ کھلے تب مجھ سے شادی کی فرمائش کر لیتا ہے اور تائی اس کی فرمائش پوری کرنا چاہتی ہیں، اپنے گھر رکھنے کا تاوان، میری زندگی کی صورت میں لینا چاہتی ہیں مگر میں نے اور امی نے صاف انکار کر دیا۔ اب یہاں آئی ہوں تو بھی آگ کا دریا پار کر کے آئی ہوں۔ کہتی تھیں، جواد سے ملوانے لے جا رہی ہے تمہاری ماں۔"

شبلا کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"حالانکہ ایسی تو کوئی بات ہی نہیں، میں نے تو کبھی جواد سے بات تک نہیں کی۔ مگر تائی کچھ بھی بولتے سوچتی تک نہیں، کسی کا احساس کر لینا انہوں نے سیکھا ہی نہیں ہر وقت اپنی منوانا چاہتی ہیں۔ ہم بھی زندہ انسان ہیں ہمیں بھی اپنی زندگی اپنی مرضی سے جینے کا حق حاصل ہے۔"

"اور تمہارے تایا جان، وہ کچھ نہیں بولتے۔"

"وہ کیا کہیں، وہ بے بس ہیں وہ کچھ نہیں کر سکتے ہمارے لیے۔"

منشا نے اسے تسلی دے کر باتوں میں لگا لیا تھا۔

باپ کا سایہ سر سے اٹھ جائے تو رشتہ دار یتیم لڑکیوں کو لوٹ کا مال سمجھ لیتے ہیں۔ نصرت خالہ کی مصیبتیں ابھی ختم نہیں ہوئی تھیں۔

☆☆☆

صبح کے ساڑھے سات بج رہے تھے جب منشا نے گرم چائے کا آخری گھونٹ لیا تھا، امی روکتی ہی رہ گئیں۔

''منشا! صبح صبح خالی پیٹ چائے نہیں پیتے۔'' مگر چونکہ وہ ایسا بچپن سے کرتی آرہی تھی۔ بچپن تک کرنے والی تھی۔

''کچھ نہیں ہوتا امی!'' اور امی پراٹھے کا نوالہ بنا کر اس کے پیچھے پیچھے۔ ''تم نے کب بڑے ہونا ہے منشا؟ شہلا کو دیکھو، کتنی سمجھدار بچی ہے ماشاء اللہ بھی کی ہے اس نے ضد، اور تم ہو کہ ابھی کلاس ٹو کی بچی کی طرح ماں کو پیچھے بھگائے رکھتی ہو۔''

امی توے پر دوسرا پراٹھا ڈال چکی تھیں، منشا نے بیگ میں اپنی ضروری اشیاء چیک کیں اور مسکرا کر بولی۔

''یہ پراٹھا اپنے میاں کو دیں۔ انہیں آلو گوبھی کا سالن کتنا پسند ہے اور آپ یہاں وقت ضائع کر رہی ہیں۔''

''تمہارے کچھ نہیں لگتے وہ؟'' آج بھی امی کو شرم آتی تھی۔

''لگتے ہیں ناں میری امی اور ابا۔'' وہ جلدی سے باہر نکل گئی تھی۔ آج موسم کافی حسین تھا اس نے سفید والی چادر سر پر لے رکھی تھی۔

نزہت چچی کی طرف واپسی پر جانے کا ارادہ تھا۔ یہی وقت جواد کے بھی نکلنے کا تھا۔ سامنے ہی اسے حسان نظر آ گیا تھا۔

''منشا!'' جواد نے بائیک اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا تھا۔ وہ ان سنی کرتی آگے بڑھ گئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ اسے ساتھ چلنے کا کہہ رہا تھا مگر وہ انجان بن گئی تھی۔

حسان کی گاڑی میں بیٹھتے اور اسے نظر انداز کرتے دل ایک دفعہ دھڑکا تو تھا۔ کتنی شامیں ایسے ہی دھڑکا تھا اسے کون دیکھ رہا تھا۔ مگر اس کا کام ہی دھڑکنا ہے اس پر کیا دھیان دینا۔ جواد اسے جاتے دیکھتا رہ گیا تھا مگر وہ چلی گئی تھی۔ پیچھے مڑ کر دیکھا آج راستہ منٹوں میں طے ہو گیا تھا۔ جواد اسے خوش لگ رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ ان کی فیملی کا حصہ بنتا جا رہا تھا۔

کل جب چچی نزہت کا بی پی سخت لو ہو گیا تو اچانک انہیں ٹھنڈے پسینے آنے لگے تھے۔ تب جلدی سے منشا کو لینے آ گیا تھا۔ واپسی پر بھی وہیں شام تک۔

جب منشا نے سب کے لیے چائے بنائی تب اس نے بھی اپنا کپ، بڑی بے تکلفی، اپنائیت سے ٹرے میں سے اٹھا لیا تھا۔ اس کی امی، آسیہ بیگم بھی آ گئی تھیں بالکل اپنے گھر والا ماحول تھا اور اس میں حسان ایڈجسٹ بھی خوب ہو رہا تھا۔

''یہ ہینڈسم کون ہے؟ منشا سے شہلا نے سرگوشی کی تھی۔''

''ارے یہ جواد کا بیسٹ فرینڈ ہے۔''

''اتنا کیوٹ بیسٹ فرینڈ کہاں چھپا رکھا تھا جواد نے شہلا۔'' نے فدا ہونے کی اداکاری کی تھی۔

''تم اپنے کیوٹ کی فکر کیا کرو میڈم! نزہت چچی کو پتا چلا تو جان نکال لیں گی تمہاری۔''

''ہائے میری قسمت۔'' منشا اور شہلا نے اس رات کافی انجوائے کیا تھا۔

''ہاں تمہاری قسمت''

شام میں جواد اسے کافی چپ چپ لگا تھا عجیب بجھی بجھی طبیعت ہو رہی تھی۔ کوئی اور وقت ہوتا تو نزہت چچی نے فوراً ابا کو بھیج دینا تھا۔

''آؤ آؤ اور پتا کرو۔ لڑکے کو ہوا کیا ہے۔''

مگر آج انہوں نے بلاوا نہیں بھیجا اور وہ بھی نظر انداز کر کے ٹی وی دیکھتی رہی پتا نہیں کیا چل رہا تھا۔ جب وقت بدل جائے تو خود بھی بدل جانا چاہیے، ورنہ وقت بڑی بے دردی سے ہمیں بدل



ڈالتا ہے۔

آج کی شب جواد نے جاگ کر گزاری تھی۔ اس کے کمرے کی لائٹ شام سے آف تھی اور منشا نے جی بھر کر خبریں سنیں ایک آدھ گانا بھی سن لیا۔ پھر دیر تک بہنوں سے گپ شپ میں مصروف رہی۔ البتہ نزہت چچی کافی خاموش تھیں ان کی طبیعت اب پہلے سے بہت بہتر تھی۔

نصرت خالہ نے انہیں دودھ گرم کر کے دیا تھا پھر گرم بستر میں لیٹی نجانے کیا سوچتی رہیں اور پھر نیند کی وادیوں میں اتر گئیں۔ ان کے ساتھ ہی نصرت خالہ بھی سو گئیں۔ رات کافی گہری اور اندھیری تھی کون جانے ان ہی راتوں سے کس کے لیے سویرا ابھرے، اس گھر کو روشنی اور محبت کی ضرورت تھی اور محبتیں، خون کا خراج وصول کیا کرتی ہیں، سچے دل سچا خراج دے سکتے ہیں، یہ ہر کسی کا کام نہیں۔

☆☆☆

ریحان کی امی آئی تھیں اور خاصی شرمندہ شرمندہ بھی نظر آئی تھیں۔

''ایسے گھرانے سے ہمارا رشتہ جڑے، یہ میرے دل کی خواہش ہے بہن! میری بچیاں غلطی کر گئیں، اس کی سزا مجھے اور ریحان کو نہ دیں، میرا دل کہتا ہے کہ آپ کی بیٹی کا نصیب میرے بیٹے سے جڑا ہے۔ میرے ریحان کے کردار کی گواہی آپ جس سے چاہیں، لے لیں۔ میرے بیٹے جیسا کوئی دوسرا ریحان نہیں ملے گا آپ کو۔'' اس کی امی کہتی جا رہی تھیں۔ نزہت چچی نے ان کی رنگت پر خاصا غور کیا تھا۔ پھر پوچھا

''آپ کی بڑی بیٹی تھی وہ؟'' ان کے ذہن میں اس کے نقوش گھوم رہے تھے۔ موٹے موٹے اور بال بھی گھنگھریالے تھے، اس کا تو قد بھی چھوٹا تھا۔ مگر ریحان کی امی کے بال سیدھے تھے،۔

وہ مسکراتے ہوئے کہنے لگیں۔ ''نزہت بہن وہ میری اپنی بچیاں ہی سمجھ لیجیے۔ جب فراز صاحب نے مجھ سے نکاح کیا تھا۔ بڑی بیٹی ریحانہ ماشاء اللہ شادی شدہ تھی، چھوٹی فرزانہ کی شادی، سال بھر بعد کی مگر ان میں اور میرے ریحان میں کوئی فرق والی بات نہیں ہے، اگر آپ پوچھتی نہیں تو بتاتی بھی نہیں۔'' فرق تو واقعی انہوں نے کوئی نہیں کیا تھا۔ اسی لیے تو دونوں باجیوں نے اچھی بھلی منشا میں کیڑے نکال کر اپنی راہ لی تھی ان کا تو کام ہی شاید یہی تھا۔ اچھی بہنیں ہیں بھئی۔''

نزہت نے سوچا تھا مگر ریحان کی امی کے خلوص پر شک نہیں تھا۔ بہرحال امی نے منشا کے ابا سے پوچھ کر بتانے کا کہہ دیا تھا، یوں چٹا جواب دینا بغیر چھان بین کے ٹھیک نہیں تھا، پہلے ڈھونڈنا تو انہوں نے منشا رشتہ ہی تھا۔ اور خیر سے حسان کی امی کی آنکھوں کی اپنائیت بھی ڈھکی چھپی نہیں تھی اور انہیں حسان بھی بہت پسند تھا۔ ملنسار لڑکا تھا گھل مل کر رہنے والا۔ کسی خوب صورت خیال کے تحت انہوں نے آنکھیں موند لی تھیں۔

رات دیر تک مشورے ہوتے رہے تھے، ریحان کسی بھی طرح ٹھکرائے جانے کے لائق نہیں تھا۔ اس کی شرافت کی گواہی پوری کالونی دے سکتی تھی۔ چند ایک نے دی بھی تھی۔ ابا مطمئن تھے۔ اتنا شریف اس کا نام شرافت ہونا چاہیے تھا یا پھر شریف، مگر رکھا ریحان ہے۔ منشا کو ان کے آنے پر اعتراض بالکل نہیں تھا، البتہ ثانیہ کی خیر خبر نہیں تھی کہ وہ کیا چاہتی ہے۔ امی پوچھتیں تو بتا دیتی شاید، مگر ابھی فیصلے ہو رہے تھے۔ ثانیہ ابھی تھرڈ ایئر میں تھی، رشتہ بہت اچھا تھا مگر تعلیم ادھوری تھی۔

منشا نے دیکھا کہ ثانیہ بے خبر دودھ ابال رہی تھی۔ وہ ایسے ہی مگن ہو کر کام کرتی تھی۔

''میں کس بات کا سوگ مناؤں، اس کی تصویر میں نے تو دیکھی بھی نہیں تھی اگر وہ ثانیہ کا نصیب ہے تو مجھے کیا اعتراض'' وہ اپنے کمرے میں چلی آئی تھی۔ کوئی پرانا رسالہ ڈھونڈتے، ایک کتاب اس کے قدموں میں گر پڑی۔ ایک تو کتابوں کا انبار اکٹھا تھا اور پڑھ کر سنبھال کر رکھنے کا رواج نہیں۔ ثانیہ کی

رکھی بک میں سے ریحان کی وہی تصویر گر پڑی تھی۔

"اوہ" اس نے تصویر واپس ویسی کی ویسی رکھ دی تھی۔ اب پتا چلا، تانیہ نے چھپالی تھی۔ تانیہ کا دل ٹوٹنا نہیں چاہیے اور ایسی کوئی رنجش بھی نہیں۔

"مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ اپنی چھوٹی سی بہن کی خوشیوں پر، اس نے خود کلامی کی تھی۔

جب امی ابا فیصلہ کرنے بیٹھے تب وہ بھی آکر بیٹھ گئی تھی۔

"امی! تانیہ ریحان کے ساتھ ہی جچے گی۔ آپ خوب سوچ سمجھ کر جواب دیں ریحان کی امی کو، ریحان مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ یہ تو اپنے اپنے نصیب کی بات ہے۔"

امی نے منشا کا ماتھا چوم لیا تھا، واقعی ان کی اولاد ان کی سوچ سے بڑھ کر اچھی تھی، دوسروں کے لیے اچھا سوچنے والے، کبھی خالی دامن بھی رہے ہیں۔ بھلا "اللہ میری منشا کے مقدر سنوار دینا۔ وہ کسی کے لیے بھی بری نہیں اس کے ساتھ بھی برا نہ کرنا۔"

امی کی آنکھوں میں شکر کے آنسو تھے۔ لبوں پر دعائیں۔

☆☆☆

نزہت چچی بہت بدل گئی تھیں۔ ان کی وہ مسکراہٹ کم ہوگئی تھی جس کی منشا عادی تھی اور عادتیں مشکل سے ہی بدلا کرتی ہیں۔

"امی! اگر تانیہ ان لوگوں کو پسند ہے تو چھوٹی بڑی کا کیا قصہ، آپ اس کی منگنی کردیں۔ بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی، دنیا کسی سے خوش نہیں ہوتی مر کر بھی۔ اللہ کو ناراض کرکے بھی، کوئی آپ سے راضی نہیں ہوگا۔ تو آپ پروا کیوں کررہی ہیں ویسے بھی مجھے ریحان پسند نہیں آیا تھا اگر تانیہ کو پسند ہو تو آپ پہلے اس کا سوچیں۔" منشا نے ایک بار پھر امی کو سمجھایا تھا۔

"باقی جو تانیہ کی رائے ہو۔" امی اپنے بستر پر کتنی دیر تک بیٹھی رہیں۔ ابرار باہر خاموش بیٹھے تھے، کوئی نہ کوئی فیصلہ تو کرنا تھا کوئی کسی نتیجے تک پہنچ نہیں پایا۔

☆☆☆

"منشا! میں نے ساری زندگی تمہارے سوا کسی کا خواب نہیں دیکھا اور تم نے میری موٹر سائیکل پر اس کی گاڑی کو ترجیح دی، تم تو ایسی نہیں تھیں، تم ایسا کیسے کرسکتی ہو، میں جانتا ہوں منشا، یہ سب پیسہ نہیں ہے۔ وہ ریحان اس کی بہنوں کی باتیں سنی تھیں تم نے، وہ بے روح لوگ ہیں تم، ان سے کیسی آس لگا کر بیٹھی ہو تم میرے ساتھ خوش رہو گی اور تم جانتی بھی ہو اچھی طرح۔"

سرشام ہی وہ تانیہ اور اس کے مشترکہ کمرے میں تقریباً دوڑ کر پہنچا تھا۔ امی پڑوس میں کسی کام سے گئی تھیں۔ تانیہ عاصم کے ساتھ بازار گئی تھی۔ اس خاموشی میں جواد کی آواز نے بہت بڑی دراڑ ڈال دی تھی۔

"میں نے تمہارے بارے میں ایسا کبھی نہیں سوچا، تمہیں ہمیشہ ایک اچھے دوست، ہم درد کے روپ میں دیکھا مگر مجھے افسوس ہے کہ تم بھی ایک عام انسان ہی نکلے ہو جواد! جو شخص اپنے رشتوں کو ٹھکراتے ہوئے اک پل نہ سوچے، وہ بھلا کیسے کسی سے مخلص ہوسکتا ہے۔" جواد سکتے میں آگیا تھا۔

"منشا! یہ تم نہیں ہو۔"

وہ اسی جلدی سے چلا بھی گیا تھا جیسے آیا تھا۔ دو آنسو منشا کی آنکھوں سے نکلے جنہیں اس نے راستے میں ہی سمیٹ لیا تھا۔ وہ نفرت نہیں محبت کی طلب گار تھی۔ رشتوں کو جڑا ہوا دیکھنا چاہتی تھی۔ اسے اپنے فیصلے پر ذرا بھی ندامت نہیں تھی مگر آنکھوں سے آنسو آخری بار بہہ رہے تھے۔ اس دریا پر اس نے بند نہیں باندھا، ان آنسوؤں کو بھی اس دل میں رہ جانے کا کوئی حق نہیں۔

☆☆☆

حسان کو یقین تھا کہ منشا اس کا نصیب ضرور بنے گی، بہت دل سے اللہ سے اسے مانگا تھا اور اچھی نیت سے مانگنے والے خالی دامن نہیں رہتے۔ وہ خود



دکان پر جاکر ابا سے ملا تھا۔ اس کی اماں کو بھی منشا بہت پسند آئی تھی۔ اس لیے انہیں راضی کرنے میں کوئی دشواری نہیں پیش نہیں آئی تھی۔

شہلا اور جواد ساتھ ساتھ بیٹھے بے حد پیارے لگ رہے تھے بار بار، چچی جواد کو چوم رہی تھیں۔ شہلا کی امی بھی مطمئن دکھائی دے رہی تھیں۔ نفیسہ، سعدیہ اور منشا نے اس شادی کو خوب انجوائے کیا تھا۔ منشا ڈراموں والی ہیروئن نہیں تھی، جو ڈرامے کی ریٹنگ بڑھانے کے لیے تماشے کرتی پھرے۔ حقیقت میں سمجھ دار لڑکی تھی جو دنیا کو حقیقت کی نظر سے دیکھتی تھی اور خوابوں، خیالوں کے بجائے حقیقی دنیا میں رہنا پسند کرتی تھی۔ سب آنا فانا ہی ہوا تھا اور نکاح جیسی تقریب کے لیے کتنی چیزوں، کتنے انتظامات کی ضرورت ہوتی ہے۔

منشا نے نہ بار بار روتے ہوئے آئینہ دیکھا، نہ منظر سے غائب ہوئی، نہ چہرے پر بارہ بجاکر رکھے۔ محبت رسوا کرنے والا جذبہ نہیں ہے۔ سچی محبت سنوار دیتی ہے اور ویسے بھی ہماری اصل سچی محبت کا حق دار صرف اور صرف اللہ ہے۔ کسی سے بھی کرکے دیکھ لو کتنی بھی شدت سے چاہو نتیجہ صفر ہی رہتا ہے۔ وہ اللہ ہے جو اس ایک صفر میں لاتعداد صفر بڑھا دیتا ہے۔

شہلا کو جواد کے کمرے میں پہنچادیا گیا تھا باہر جواد دوستوں کی محفل میں تھا۔ تب چچی نے سب کے لیے چائے بنائی تھی۔ منشا، نفیسہ نے چائے چھان کر مہمانوں کو پیش کی تھی۔

"ارے چائے تو ٹھنڈی ہوگئی۔" ایسی ہی آوازوں میں شام بیت گئی، رات بیت گئی، وقت کا کام ہے گزر جانا تو کیا ہی اچھا ہو بلکہ بہترین ہو کہ کیفیات کو بھی گزرنے دیا جائے انہیں روک کر بھی کیا ہے بے کار۔ کاٹھ کباڑ اکٹھا کرنے کا کوئی فائدہ ہے خواہ مخواہ کی خواری۔

☆☆☆

صبح ہی صبح شہلا اور جواد کا خصوصی ناشتا لگادیا گیا تھا، وہ دونوں مسکرا رہے تھے۔ چچی بھی مسرور نظر آرہی تھیں، باقی ٹھنڈا گرم، موسم تو آتا جاتا ہی ہے ایک ہی موسم، ایک ہی مزاج سے دل اوب بھی تو جاتا ہے۔ مٹھائی کا چھوٹا سا ٹکڑا شہلا نے منہ میں ڈالا تھا۔

"سیر کرنے کہاں جاؤ گے؟" نفیسہ اور سب نے مل کر پوچھا تھا

"مری ہی پر۔" جواد نے کچھ اس انداز میں کہا تھا کہ شہلا کے منہ سے مٹھائی نکل گئی تھی۔ سب ہنس ہنس کر بے حال ہوگئے تھے۔

منشاء کی شادی کسان سے طے پاگئی۔

☆☆☆

شادی کی تقریب بالکل سادہ تھی۔

امی نے اپنا صندوق کھولا اس میں ان کا ایک دوپٹا تھا جو انہیں بہت پیارا تھا، جو نانی نے انہیں رخصتی کے وقت دیا تھا، جسے اوڑھ کر آج تک وہ رو پڑتی تھیں۔

"میں یہ برکت والا دوپٹا اپنی منشا کے ساتھ بھیجوں گی۔"

شادی کا جوڑا حسان کی طرف سے آیا تھا۔ وہ بہت پیارا تھا، برانڈڈ جوڑوں کی نکلی بھوک اسے نہیں تھی جو صاف ستھرا مل جائے وہی پہن لینے والی لڑکی تھی۔ برانڈ کے جوڑے پہننے والے کچھ لوگ، خود کو اونچی چیز سمجھنے لگتے ہیں اور انسانوں کو انسان سمجھنا بھی انہیں بھولنے لگتا ہے۔ باریک لباس اللہ کی پسندیدہ بندیاں نہیں پہنتیں۔

حسان کی امی نے جوڑا بھیجا تھا، وہ امی کے بیڈ پر پھیلا ہوا تھا منشا اسے ساتھ لگا کر دیکھ رہی تھی۔ اندر سے خوب صورت لوگ، ہر جوڑے میں ملائمت اور محبت سے بھرے نظر آتے ہیں۔ یہ جوڑا بہت جچ رہا تھا۔

نزہت چچی اور شہلا بھی آکر کبھی امی کو مشورے دینے لگتیں، کبھی گھر کے کام کاج میں ہاتھ بٹانے لگتیں، صبح ہی، شہلا نے سب کا مشترکہ ناشتا

بنایا تھا۔ کل منشا نے رخصت ہو جانا تھا دوپہر میں شبلا اور نفیسہ، سعدیہ وغیرہ نے سب کھانے اس کی پسند کے بنانے کا سوچا تھا۔
شبلا صبح سے انتظامات میں لگی ہوئی تھی۔ سلاد کے لیے پیاز ٹماٹر کاٹ رکھے تھے، قورمے کے لیے گوشت بھونا۔ کھیر کے لیے دودھ ابالا، کسٹرڈ کے لیے اسٹرابیری کیوبز میں کاٹی۔ شبلا کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ساری دنیا کی مزے دار چیزیں، کٹ کٹ کر کے کاٹ ڈالتی۔
اس نے چمن پلاؤ کو دم لگایا تھا اور گاڑھی گرم کھیر میں چمچ چلایا اور پھر کافی ساری کشمش دھو کے ڈال دی تھی کیونکہ
منشا کو کشمش بہت پسند تھی وہ بھی کھیر میں
جب کھانا کھانے بیٹھے تب منشا نے سوچا تھا۔
"یہ محبت کتنی قیمتی ہے۔"
☆☆☆
حسان ابراہیم کے لیے آج زندگی کا سب سے قیمتی دن تھا۔ کیا محبتیں یوں بھی مل جایا کرتی ہیں۔ آج تک کوئی دل کو لگا ہی نہیں تھا۔ اسے اپنی قسمت پر رشک آرہا تھا۔ کافی سارے مہمان رخصت ہو گئے کچھ باقی بھی تھے۔ کچھ خواتین بریانی کھانے میں مشغول تھیں، کچھ گپیں لگا رہی تھیں۔ بچے کھیل کھیل کر تھک چکے تھے۔ اب شاید سونا بھی چاہتے ہوں مگر ماؤں کا ارادہ شاید نہیں سلانے کا نہیں تھا۔
جب امی نے اس سے کھانے کا پوچھا تب اس کی بھوک ہرگز نہیں چمکی تھی۔
مگر امی نے جس دلار سے کہا تھا انکار کرنا مناسب نہیں لگا۔ تب وہ ٹرے سجا کر لے آئی تھیں جسے وہ اٹھائے اوپر آ گیا تھا۔ خواہ مخواہ ہی کسی کے ساتھ کھانا کھانے کو جی چاہنے لگا تھا۔ کوئی مہندی لگے ہاتھ سے کھائے بھی اور کھلائے بھی، اس نے سوچا اور مسکراتے ہوئے سیڑھیاں چڑھنے لگا تھا۔ کمرا پھولوں سے بھرا ہوا تھا اس کے دوستوں کی مہربانی کی وجہ سے پورے کمرے میں اتنے پھول تھے کہ جیسے گلابوں کی دوکان ہو مہکی ہوئی۔ وہ پہلا دولہا تھا، جو اپنی دلہن کو گفٹ پیش کرنے کے بجائے کھانا کھانے کی آفر کرنے والا تھا۔
"کھانا کھاؤ گی۔"
وہ کچھ اس ادا سے سہما تھا کہ منشا ہنس پڑی تھی، حسان ابراہیم کی محبت اسے مل گئی تھی۔ پورے دل کے ساتھ اور کھانا بھی اس نے کھالیا تھا۔ اسی طرح جس طرح اس نے سوچا تھا، تو کیا زندگی خوب صورت ہے؟ ہاں مگر صرف پوزیٹو لوگوں کے لیے باقی نیگیٹو لوگ سوچوں کا بوجھ اٹھا کر جینے والے تو خواریاں ہی سمیٹتے ہیں دلداریاں انہیں کون سمیٹنے دیتا ہے۔
میکے میں خوش و خرم ہنستی مسکراتی منشا کا پہلا چکر تھا۔ ثانیہ کی بھی منگنی ہو گئی تھی پیپرز کے بعد رخصتی تھی۔ سب سے پہلے پیشانی چومنے والی نزہت تھیں۔ شبلا کی گرم جوشی، اس کا پیار سب بھولنے والا نہیں تھا۔ جواد اس کا فیورٹ آئس کریم فلیور لے کر آیا تھا۔
جب سب کھانا کھا کر فارغ ہوئے تب جواد اور نزہت چچی نے مل کر آئس کریم سب کو دی تھی۔
اور سب سے زیادہ منشا کو ملی تھی۔
"اتنا خرچا!" وہ مسکرائی تھی۔ جب کبھی جواد کوئی چیز تھوڑی لے کر آتا تب سب اسے کنجوس بھی کہتے تھے۔
"بھائی کا ہاتھ بہت کھلا ہے منشا!" ثانیہ بھی بیچ میں کود ی تھی۔
"اور اس سے ڈبل خرچا تو ہم اپنی ثانیہ کی شادی پر کریں گے۔"
سب ثانیہ کے لیے دعا گو تھے اور منشا کے لیے بھی، جس کی آنکھوں میں جگنو چمک رہے تھے۔ جگنو نہیں بلکہ بلب فٹ تھے۔ سچ ہے، محبت اور رشتوں میں کسی ایک کا انتخاب کرنا ہو تو بندہ رشتوں کا ہی انتخاب کرلے۔ ساری عمر چاہتوں کے درمیان رہنے کے لیے کارگر نسخہ ہے۔



ساری روداد سنا دینے کے بعد شبو عرف شبانہ نے حمایت طلب نظروں سے آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو لے کر سامنے بیٹھی خالہ سکینہ کو امید بھری نظروں سے دیکھا
جبکہ خالہ سکینہ اپنے چہرے پر ہاتھ کا پنکھا اس انداز میں جھلا رہی تھیں گویا اس وقت یہی دنیا کا اہم ترین کام ہو۔ چہرے پر تنفر و تکبر کے ملے جلے تاثرات نمایاں تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ موصوفہ کو بہو کے جھگڑوں سے رتی برابر سروکار نہیں۔ ان کی طرف سے بھاڑ میں جاؤ۔
رہی سہی کسر منع نے پوری کردی۔
"بھابھی! تم کیا روز روز امی کے سامنے بھائی کی شکایتوں کی پٹاری کھولے آ جاتی ہو۔ ہمارے اپنے بھی سو مسئلے ہیں۔"
"مگر اسے کہاں سمجھ میں آنے والی ہے یہ بات؟"
قبل ازیں کہ شبانہ منہ کھولتی سکینہ بول پڑیں۔
"سمجھوتا کرو بھئی سمجھوتا! عورت جب دنیا میں آتی ہے تو سمجھوتے کا عہد باندھ کر پیدا ہوتی ہے۔ جب شادی ہوتی ہے تو اسے سمجھوتے کا چولا پہن کر باپ کی دہلیز چھوڑنی پڑتی ہے۔ پھر اولاد کو دنیا میں لانے کا کٹھن کام بھی عورت کا ذمہ ہے۔ اسے بھی تم ایک "سمجھوتا" ہی سمجھو لو۔"
سکینہ خالہ وعظ کرنے کے انداز میں بولتی چلی گئیں۔

حمیرا عروش

# سمجھوتہ

شبانہ خالی الذہنی کی سی حالت میں یک ٹک ساس کا چہرہ دیکھے گئی۔ جو ساس ہونے سے قبل خالہ تھیں اور اپنی بہن کے انتقال کے بعد بظاہر اسے بڑی چاہ سے بیاہ کر لائی تھیں کہ اس کا بھرپور خیال رکھیں۔ مگر خیال رکھنا تو درکنار الٹا انہوں نے شبانہ کو اپنے اکلوتے فرزند کی ملازمہ خیال کر لیا تھا۔ ملازمہ بھی وہ جو بغیر تنخواہ، بغیر جتائے اور بنا اپنے حقوق کا اظہار کیے، ان کے انوکھے لاڈلے کی خدمتوں میں جتی رہے۔
یہ بھید بھی بعد میں ہی کھلا کہ سکینہ کو بھانجی سے زیادہ اس کا ہنر مند ہونا پسند تھا۔ تب ہی شادی کے دو ماہ بعد کپڑوں کے آرڈر بڑے دھڑلے سے لینے لگیں اور وہ سلائی مشین کے ساتھ الجھ کر رہ گئی۔
خالہ کے ہاتھ اچھی خاصی رقم آ جاتی تھی سو وہ

بڑی نہال تھیں اور دل ہی دل میں اپنی دانش مندی پر خود کو داد دیتے نہ تھکتی تھیں۔ شمع کے جہیز کے لیے محلے میں ہی کمیٹی ڈال لی تھی۔ شبانہ کے ہاتھ پر ہر ماہ ہزار روپے رکھ کر گویا اس پر احسان عظیم کر دیا جاتا۔ شمع کو وہ ہزار بھی بڑے کھلتے تھے۔

"واہ بھئی، واہ نواب ہے۔ ہزار روپے ماہانہ خرچا اور مجھے ایک دھیلا بھی نہیں۔" وہ تڑخ کر بولی۔

"پورا مہینہ کام بھی تو گدھوں کی طرح کرتی ہے وہ۔" خالہ ڈپٹتیں۔

"یہاں رہتی نہیں؟ کھاتی نہیں ہے کیا؟" وہ تنفر بھرے انداز میں بولتی۔

"میری بچی! مجھے معلوم ہے مگر تیرے جہیز کے لیے پانچ ہزار کمیٹی بھی تو بھرنی ہوتی ہے۔ وہ تمہارے ہی کھاتے میں ہی۔ گھر کے باقی خرچے بھی پورے کرنا ہوتے ہیں۔ تیرے بھائی کا کام ٹھیک کہاں چلتا ہے۔ کبھی گرمی بہت اور کبھی سردی اتنی شدید پڑتی ہے کہ بے چارے سے دوکان پر بیٹھنا محال ہو جاتا ہے۔" ماں کا بیٹی کے لیے لاڈ امڈ آتا۔ ساتھ ہی صاحبزادے کے لیے لہجے میں پیار ہی پیار ہوتا۔

☆☆☆

شبانہ دو بچوں کی ماں بن گئی مگر معاملہ اسی طرح چلتا رہا۔

پہلا اور لاڈلا پوتا رضا کب دو سال کا ہوا، پتا ہی نہ چلا۔ پھپھو کی آنکھوں کا تارا اور دادی کے دل کا اجالا تھا۔ پورا دن ماں کی پروا نہ کرتا اور دادی کی گود میں محلے بھر کی سیر کرتا پھرتا۔ گھر میں اکلوتی پھپھو لاڈ اٹھاتے نہ تھکتی۔

دو سال بعد رمشا کی پیدائش ہوئی تو حقیقی معنوں میں دونوں ماں بیٹی کو دن میں تارے نظر آ گئے۔

اسے سنبھالنا ناممکن تھا۔ وہ ماں کے بغیر ایک منٹ نہ رہتی۔ کچھ انہوں نے بھی اسے خاص لاڈ پیار نہ دیا تھا۔ ممتا کا پیالہ تو رضا کی محبت سے ہی بھر گیا تھا۔ یہ نئی ذمہ داری نری بکواس تھی۔

وہ وقت مقررہ پر کام دینے کے لیے گھر گھر مشین چلاتی اور رمشا ماں کے دوپٹے کا پلو پکڑے کھیلتی رہتی۔

بیٹی کی ماں بننے کے بعد عورت کی غیر محسوس حسیات از خود بیدار ہو جاتی ہیں۔ ذہن وقت پردے ہٹا کر نجانے کون کون سے پہروں میں جا کر جھانکنے لگتا ہے۔

سادہ مزاج شبو بھی پیچھے مڑ کر روتی بلکتی، کبھی ہنستی کھیلتی رمشا کو دیکھتی تو خاموشی سے اپنی ذات سے کوئی عہد باندھ لیتی۔ اپنی زندگی کے تجربوں سے تمام تر ناپسندیدگیاں اور ناخوش گوار لمحات جیسا کوئی ایک لمحہ بھی اپنی بیٹی کی زندگی میں نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ خواب دیکھتی اور خوابوں میں جینے لگی۔

☆☆☆

شمع کی شوخ آنکھوں کے تارے مدھم پڑنے لگے تھے۔ بڑھتی عمر کے ساتھ اس کے قہقہے بھی کھوکھلے سے ہو چلے تھے۔ فلموں اور رومانوی افسانوں سے لیا گیا چاند سے شہزادے کا سبق جو اسے سالوں سے یاد تھا۔ اب صرف ایک مذاق لگنے لگا تھا۔ سوالی آتے اور لوٹ جاتے۔ جو ٹھہرتے تھے۔ وہ اس قابل ہوتے کہ جوڑ اور بے جوڑ کے معنی باور کرا دیتے۔

سکینہ کو اپنی "چاندی بیٹی" کی گہری رنگت اور پھیکے نقش سمجھ میں آنے لگے۔

☆☆☆

ایک کے بجائے دو کمیٹیاں جمع ہو گئیں تو سکینہ نے اوپر کا پورشن بنوانے کے لیے کام شروع کرا دیا۔ کرائے پر دے دیتیں تو گھر کی آمدن میں اضافہ ہی ہوتا۔

شبو کے چہرے پر آج کل طمانیت کا بسیرا تھا۔ اسے شوہر کی کام چوری کھلتی۔ نہ ہی اس کی شکایتیں کر کے ساس کے سامنے دل ہلکا کرتی ورنہ مہینے میں ایک بار اسے یہ دورہ ضرور پڑتا تھا۔

اس کی طرف سے سکینہ خوش تھیں کہ چلو چھ سال بعد ہی سہی "سمجھوتہ" کرنا سیکھ ہی گئی۔

شمع چپ چاپ گھر کے کام کیے جاتی۔ سکینہ کی اس پر نگاہ پڑتی تو دعاؤں کا متروک سلسلہ دل ہی دل میں جاری ہو جاتا اور پھر ہر شے سے دل ہٹ جاتا۔



☆☆☆

گھر کا تعمیری کام مکمل ہوا اور آخر کار شمع کے لیے بھی مناسب جگہ سے رشتہ آ ہی گیا۔ سکینہ نے بیٹی کے ہاتھ پیلے کرنے میں دیر نہ لگائی۔

اوپر پورشن میں کرائے دار آ گئے۔ آمدن کا کچھ ذریعہ ہوا تو شبانہ نے بھی سکون کا سانس لیا۔

شمع کی رخصتی کے بعد سکینہ جیسے لاشعوری طور پر ایک دکھ کی کیفیت سے نہیں نکل پا رہی تھیں۔

شبانہ نے آہستہ آہستہ گھر کا سارا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ شمع کے جانے کے بعد یوں بھی سکینہ میں چالاکیاں مفقود ہو چکی تھیں۔ زبان پر جوڑوں کے درد اور کمر درد کی کہانی ہی رہنے لگی۔

شبانہ ساس کا بھرپور خیال رکھتی مگر ہر خرچے میں توازن رکھ کر بچوں کے مستقبل کے لیے بھی ضرور پس انداز کرتی۔

یہ الگ بات تھی کہ سلائی، گھر کے جھمیلوں، پیسوں کے جوڑ توڑ، کرایہ داروں کے مسائل اور ساس کی بیماریوں میں اس کی اپنی ذات گم ہو چکی تھی۔ اپنی مرضی سے کھانا اور سونا تو خواب و خیال ہو گیا تھا۔

☆☆☆

"بہت دنوں سے شمع فون کر رہی ہے کہ اماں ملنے کے لیے آ جاؤ۔ جاوید مجھے موٹر سائیکل پر شمع کی طرف چھوڑ کر دکان پر چلے جانا آج۔"

سکینہ پوری یکسوئی سے ناشتہ کرتے بیٹے سے مخاطب ہوئیں تو اس نے محض سر ہلا کر تابعداری کا مظاہرہ کرنے پر اکتفا کیا۔

شبانہ بیٹے کو اسکول چھوڑ کر آنے کے بعد اب کچن سمیٹ رہی تھی۔ رمشا ابھی جاگی نہیں تھی۔

سکینہ خود کلامی کرتے ہوئے بولیں۔

"وہ بھی کیا دن تھے۔ پیدل ہی دنیا جہان میں گھوم پھر لو کچھ محسوس ہی نہ ہوتا تھا، اب تو دو قدم چلنا بھی محال ہے۔"

☆☆☆

شمع ماں کو دیکھ کر کسی چھوٹے بچے کی طرح اس سے لپٹ گئی۔

سکینہ بیٹی سے مل کر خوش تھیں کہ آخر مہینہ بعد مل رہی تھی مگر ظاہر ہے، ماں کے محسوسات بہت کچھ بھانپ لیا کرتے ہیں سو ان کا بھی ماتھا ٹھنکا۔

شوہر کام پر جا چکا تھا۔ ساس نند کوئی تھی نہیں، لہٰذا شمع ماں کو کمرے میں بٹھا کر بلا خوف و خطر ماں کے آگے حال دل بیان کرنے لگی۔

"اماں! جمال تو غصے کا بہت تیز ہے۔ ایک منٹ میں آنکھیں لال انگارہ کر لیتا ہے۔ بات بے بات بھڑک اٹھتا ہے۔ ہر کام میں مین میخ نکالنے کی قسم کھا رکھی ہے جیسے۔"

وہ آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو بھر لائی۔

سکینہ کو لگا۔ کوئی پہاڑ سا ان پر آن گرا ہو۔ لمحہ بھر میں انہوں نے خود کو سنبھالا۔ آخر بیٹی کو حوصلہ دینا بھی ضروری تھا۔ پھر بڑی مشکل سے بولیں۔

"سمجھوتہ...... بچے سمجھوتہ کر۔" لفظ ٹوٹ ٹوٹ کر ان کی زبان سے ادا ہو رہے تھے جیسے آج ہی ان الفاظ کا کرب ان پر آشکار ہوا تھا۔ آج سے پہلے لفظ "سمجھوتہ" اتنا اذیت ناک تو نہ تھا۔

نصیحتوں کی ایک زنجیری دکھ بھرے انداز میں بنتی چلی گئی۔

"میاں بیوی کو ایک دوسرے کا مزاج سمجھنے میں کچھ وقت تو لگتا ہے پتر! جب تک صبر اور خاموشی سے وقت گزار لے اور...... ہاں...... سمجھوتے سے بھی! میں جمال سے بات کر کے گھر رکنے کے لیے لے جاؤں گی تو دل بہل جائے گا تیرا۔ خوش رہنے کی کوشش کیا کر! اپنے لیے اور اپنے ہونے والے بچے کے لیے۔"

کچھ دیر بعد بیٹی کا دکھ اور بوجھ اپنے دل پر منتقل کر کے، وہ اجازت طلب کرتی اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

سکینہ پیدل ہی گھر کی جانب قدم گھسیٹنے لگیں۔ انہیں اپنے کسی درد کی پرواہ تھی اور نہ ہی تھکن کی۔ انہیں صرف شبانہ کو گلے لگانے اور اس سے معافی طلب کرنے کی جلدی تھی، تب ہی ان کے دل کو قرار آنا ممکن تھا۔

☆

شازیہ جمال طارق

# برسے گا ٹوٹ کر

خانساماں آج پھر چھٹی پر تھا۔

کاشفہ کی جان پر بن آئی تھی۔ اصغر صاحب کو ہر آدھے گھنٹے کے بعد کچھ نہ کچھ کھانے کے لیے چاہیے ہوتا تھا ورنہ ذرا سی شوگر لو ہونے پر وہ سارا گھر سر پر اٹھا لیتے۔

ناہید بیگم پر ان کے اس ''شور شرابے'' کا کچھ خاص اثر نہیں پڑتا تھا کہ بقول ان کے اصغر صاحب محض اپنی زبان کے چسکے پورے کرنے کی خاطر کبھی شوگر ہائی تو کبھی لو کا سیاپا ڈالے رکھتے ہیں۔

بیوٹی کانشیئس عائلہ کو چولہے کے نام سے الرجی تھی کجا کہ کچن میں جا کر کھانا بنانا؟

رضا کا آدھا دن یونیورسٹی اور آدھا باہر دوستوں کے ساتھ گزرتا تھا۔ وہ شاذ و نادر ہی گھر والوں کے ساتھ ڈائننگ ٹیبل پر پایا جاتا۔ خانساماں چھٹی پر ہوتا تو کاشفہ ''اندھوں میں کانا راجا'' کے مصداق مارے باندھے کھانا بناتی اوپر سے ابا کی فرمائشیں...... اکثر وہ اپنے بال نوچنے کو آ جاتی۔

''قسم لے لیں امی! اس سے زیادہ بدمزہ کھانا شاید ہی دنیا میں کہیں اور بنتا ہو۔''

رضا نے ''چائنز رائس'' کے نام پر چاولوں اور سبزیوں کے ملغوبے سے آدھی بھری پلیٹ پرے کھسکائی۔ کاشفہ نے کھا جانے والی نظروں سے اسے گھورا۔

''بری بات رضا! نعمتوں کی ناقدری نہیں کرتے۔'' رغبت سے کھاتے اصغر صاحب نے بیٹے کو ڈپٹا۔

"نعمتوں کی ناقدری نہیں کر رہا بابا! بلکہ نعمتوں کے اس قدر بے تحاشا زیاں پر افسوس کر رہا ہوں۔"

ڈائننگ ٹیبل کی طرف بڑھتے وقت کہ ناعمہ آپا دھاڑ سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئیں۔ "ہم برباد ہو گئے، ہم لٹ گئے۔" افراد خانہ نے دم سادھ لیا۔

"شجاع نے چھپ کر دبئی میں شادی کر لی......"

پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ انہوں نے دھماکا کر دیا تھا۔

☆☆☆

جتنی دل دہلانے والی خبر تھی اس سے زیادہ جان لیوا انداز خبر سنانے والی ناعمہ آپا کا تھا۔

"کیا اول فول بک رہی ہو ناعمہ! میرا شجاع ایسا نہیں کر سکتا۔" ناہید بیگم تڑپ ہی تو اٹھی تھیں۔ ناعمہ نے دائیں بائیں سرکتی ماں کو سہارا دے کر اپنے پاس صوفے پر بٹھایا۔

"صادقہ بھابھی کا بھائی برسوں سے مقیم ہے دبئی میں۔ اسی نے دیکھا ہے شجاع کو "اس" کے ساتھ۔ اونچی لمبی، گوری چٹی، پرکٹی کبوتری......"

ناعمہ گویا ساری معلومات لے کر ہی آئی تھیں۔

"آپ ہی بتائیں صادقہ بھابھی کے بھائی کو کیا پڑی ہے ہم سے اتنا بڑا جھوٹ بولنے کی۔ میں نے تو جب سنا میرے قدموں تلے سے زمین نکل گئی۔ مت پوچھیں کیسے ان قدموں پر چل کر یہاں تک پہنچی ہوں۔ نجانے کس کم بخت نے ہمارے سیدھے سادے بھائی کو پھانس لیا۔"

ناعمہ آپا بولے جا رہی تھیں اور ناہید بیگم کو اپنا دل کسی گہری کھائی میں ڈوبتا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ بہت مضبوط اعصاب کی مالک تھیں۔ لیکن اس وقت انہیں خود پر قابو پانا بہت مشکل لگ رہا تھا۔

"پورے چار دن گزر گئے شجاع بھائی نے کال نہیں کی۔ ایسا پہلے تو کبھی نہیں ہوا۔"

عائلہ کے توجہ دلانے پر بابا بھی چونک گئے۔

"رضا تم کال ملاؤ شجاع کو۔"

"ملا رہا ہوں ابا! لیکن وہ کال نہیں اٹھا رہے ہیں۔" رضا نے مایوسی سے جواب دیا۔

☆☆☆

رات کے کسی پہر لینڈ لائن کی چنگھاڑ نما تان نے سب کو جھنجھوڑ ڈالا تھا۔

ناہید بیگم نے لپک کر ریسیور اٹھاتے ہوئے کان سے لگایا۔ سب اس وقت لاؤنج میں کارپٹ پر تکیے رکھے ادھر ادھر لڑھکی ہوئی تھیں۔ ناعمہ آپا بھی "ایمرجنسی" آج یہیں رک گئی تھیں۔ سب کی سماعت ایئر پیس سے ابھرتی شجاع کی آواز پر لگی ہوئی تھی۔

"السلام علیکم امی! کیسی ہیں آپ؟ بہت مصروف تھا۔ ابھی ابھی فارغ ہوا تو دیکھا امی سے اتنی ساری مسڈ کالز آئی ہوئی تھیں۔ سب خیریت تو ہے نا؟"

"ہاں بیٹا! اب تمہیں کہاں فرصت ملے گی ہم سے بات کرنے کی؟ تمہاری "کسی" اجازت دے گی تب ہی ہماری کال اٹھاؤ گے نا؟"

"کون کی؟"

"تمہاری بیوی اور کون؟"

"بیوی؟" دوسری طرف وہ جیسے اچھلا تھا۔

"کیا کہہ رہی ہیں امی آپ؟"

"دیکھو شجاع! تمہیں اگر اپنی پسند سے شادی کرنی ہی تھی تو ہم سے چھپانے کی کیا ضرورت تھی؟" ناہید بیگم پھوٹ پھوٹ کے رو دیں۔ اس سے زیادہ ضبط وہ خود پر نہیں رکھ سکتی تھیں۔

دوسری طرف بالکل خاموشی چھا گئی۔ لیکن جب وہ بولا تو اس کا لہجہ بہت مضبوط تھا۔

"ایسا کچھ نہیں ہے امی! اتنا بڑا قدم میں آپ کی اجازت اور رضامندی کے بغیر بھلا کیسے اٹھا سکتا ہوں؟"

"ہائیں؟ تو اس کا مطلب ریاض اور اس کی فسادن بہن نے جھوٹ بولا ہے؟" ان پر جیسے شادی مرگ کی کیفیت طاری ہونے لگی۔

"میں نہیں جانتا، کسی نے آپ کو کیا کہا ہے۔ کام کے سلسلے میں ہزاروں لوگوں سے ملنا ملانا رہتا ہے۔ لیکن دکھ اس بات کا ہے امی! میرے بارے میں آپ کو کوئی کچھ بھی کہے گا تو آپ اس پر یقین کر لیں گی؟ اتنا سا بھی اعتبار نہیں رہا آپ کو اپنے شجاع پر؟" اس کی اتنی سعادت



مندی اور سادہ دلی ہی تو تھی جو انہیں رلا گئی۔ بھلا ان کا اتنا فرماں بردار بیٹا ایسے کیسے کر سکتا تھا؟ اس صادقہ کی تو میں خوب خبر لوں گی۔

"میں نے تو آپ کو یہ خوش خبری سنانے کے لیے فون کیا تھا کہ مجھے چھٹی مل گئی ہے۔ اگلے ماہ پاکستان آ رہا ہوں۔"

ناہید بیگم کے اندر اطمینان کی لہر سی پھیل گئی۔

"بس میں نے فیصلہ کر لیا ہے اس بار تمہیں شادی کر کے ہی واپس بھیجوں گی۔" انہوں نے بہت مان سے کہا۔

"آپ کا ہر فیصلہ میرے لیے حکم کا درجہ رکھتا ہے امی!" شجاع نے ان کا مان بڑھا دیا تھا۔

☆☆☆

"یہ کیا کہہ دیا امی آپ نے؟ اتنی جلدی شجاع سے شادی کی بات کرنے کی کیا ضرورت تھی؟" ناعمہ کو لگا ماں خوشی اور جوش میں کچھ زیادہ ہی بول گئی ہیں۔

"اب بھی جلدی نہ کروں؟ اگر اس ریاض کی بات سچ ثابت ہو جاتی تو اس وقت سر پر ہاتھ رکھ کر رو رہے ہوتے ہم سب۔"

"لیکن پھر بھی...... شجاع کی شادی کرنے کا مطلب جانتی ہیں آپ......"

ناعمہ نے انہیں معاملے کی سنگینی کا احساس دلانا چاہا۔ "اور کچھ نہیں تو کاشفہ والا معاملہ ہی ٹھنڈا ہونے دیتیں۔"

خانساماں کو ناشتے کی ہدایت دیتی کاشفہ تیر کی طرح سیدھی ان کے سر پر جا پہنچی تھی۔

"کون سا کاشفہ والا معاملہ بھئی؟ میرا کوئی معاملہ نہیں ہے۔ مجھے بس عدیل سے ہی شادی کرنی ہے۔" وہ دو ٹوک انداز میں بولی تھی۔

"ایک نمبر کے لالچی اور خبیث لوگ ہیں تمہارے اس عدیل کے گھر والے۔" ناعمہ آپا نے کپ میں چائے انڈیلتے صاف گوئی سے کہا۔

"جب اتنا لمبا چوڑا برانڈڈ جہیز لے کر جاؤں گی تو ان لالچی، خبیث لوگوں کے منہ بند ہو جائیں گے۔ ویسے بھی مجھے عدیل سے مطلب ہے اس کے گھر والوں سے نہیں۔" کاشفہ ترکی بہ ترکی بولی تھی۔

"ہونہہ! جس نے تمہیں لاکھوں کا برانڈڈ جہیز دینے کا وعدہ کیا تھا اس کی لگامیں بہت جلد کسی اور کے ہاتھ میں جانے والی ہیں۔ بھول جاؤ میری بہن۔" ناعمہ کے تمسخر پر ناہید بیگم کی غصیلی رگ بہت زور سے پھڑکی تھی۔

"آپ ہماری ماں کو ہلکا لے رہی ہیں آپا۔ ان کی اجازت کے بغیر شجاع بھائی سانس لے لیں، بڑی بات ہے۔" نفاست سے جوس کا گلاس تھامے گھونٹ گھونٹ حلق میں اتارتی عائلہ کے کہنے پر ناہید بیگم کی گردن پھر سے تن گئی۔

اصغر صاحب کو رات ہی شجاع کی شادی کی جھوٹی افواہ کے بارے میں بتا دیا گیا۔ اگلی صبح ناشتے کی میز پر خاندان بھر کی لڑکیاں کھنگال کر چیک کر دی گئیں۔

"شجاع بھائی سے ایک بار پوچھ لیں۔ کیا پتا انہیں کوئی پسند ہو۔" رضا کے مشورے کو کسی نے درخور اعتنا نہ سمجھا۔

"میرا شجاع ایسا نہیں ہے۔ لڑکی پسند کرنے کا مکمل اختیار اس نے مجھے دے دیا ہے۔"

ناہید بیگم کا وہی حکمرانہ انداز۔ "جو میں چاہوں گی جیسا میں چاہوں گی۔"

"پھر بھی ایک بار پوچھ لینے میں کیا حرج ہے؟" لمبی ڈکار لینے کے بعد پیٹ پر ہاتھ پھیرتے اصغر صاحب بھی بول پڑے، ناہید بیگم بری طرح چڑ گئیں۔

"آپ اپنے کام سے کام رکھیں تو بہتر ہوگا۔"

اصغر صاحب منہ بنا کر اٹھ کر چل دیے۔

"رخشندہ خالہ سے بات کریں امی! ان کا کافی لوگوں سے ملنا ملانا رہتا ہے۔ ہو سکتا ہے ان کی نظر میں کوئی اچھی لڑکی ہو۔" بیٹی کا مشورہ سیدھا ان کے دل کو جا کے لگا تھا۔

☆☆☆

تجھ کو سوچوں تو ایسے لگتا ہے
جیسے خوشبو سے رنگ ملتے ہیں
جیسے صحرا میں آگ جلتی ہے

جیسے بارش میں پھول کھلتے ہیں!!!

اپنی مخصوص کرسی پر آلتی پالتی مارے گود میں رکھی کتاب پر نظریں جمائے آس پاس سے بے خبر عنادل مسکرا اٹھی۔ ہوا کے جھونکے نے ڈھیر سارے ننھے منے زرد پھول اس کی جھولی میں ڈال دیے تھے۔ کچھ گھنگھریالے بالوں میں اٹک گئے۔

"کتنی دیر سے آواز دے رہی ہوں بیٹا! چھت سے کپڑے اتار لاؤ۔ اتنا خطرناک موسم ہو رہا ہے۔ اوپر سے تمہاری چچی اور فریحہ کا بھی کچھ پتا نہیں۔ مال میں شاپنگ کرتے وقت موسم کی طرف دھیان کہاں جاتا ہے بھلا؟" منیزہ بیگم کے لہجے میں پریشانی در آئی تھی۔

"اتنے رومانٹک موسم کو آپ خطرناک کہہ رہی ہیں؟ کتاب بند کر کے چپل پاؤں میں اڑستی وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"ارے کاہے کا رومانٹک؟ ادھر میری جان پر بنی ہوئی ہے۔ تمہاری چچی اور فریحہ خیر سے گھر آ جائیں پھر بھلے چھاجوں مینہ برستا رہے۔"

"اوہو! تو آپ عاقب بھائی کو کال کریں نا! وہ انہیں لیتے آئیں گے۔"

"لو دیکھو ذرا! اس طرف تو میرا دھیان ہی نہیں گیا ابھی عاقب کو کال ملاتی ہوں۔"

منیزہ بیگم فوراً اندر کی طرف بڑھی تھیں۔ "اور تم جلدی سے کپڑے اتار لاؤ۔ چھت پر موسم کے مزے لینے نہ کھڑی ہو جانا۔"

جاتے جاتے اسے تاکید کرنا نہیں بھولیں۔

عنادل ہنستے ہوئے سیڑھیاں چڑھ گئی پہلے حسب عادت منڈیر پر بیٹھے کبوتروں کو اڑایا۔ پھر تار سے کپڑے اتارنے لگی۔ موسم واقعی دلفریب ہو رہا تھا۔

کالی گھنگھور گھٹائیں جھوم جھوم کر آ رہی تھیں، کھلی فضا میں موسم انجوائے کرنے کی شدید خواہش دل میں دبائی جب وہ کپڑوں کا گھٹڑ سینے سے لگائے سیڑھیوں کی جانب بڑھی، گردن موڑ کر پیچھے دیکھا، کبوتر ایک ایک کر کے پھر سے منڈیر پر بیٹھ رہے تھے۔ وہ ایک ترنگ سے دو دو سیڑھیاں ایک ساتھ پھلانگتی نیچے آ گئی۔

☆☆☆

منیزہ بیگم کی دعائیں رنگ لے آئی تھیں۔

عاقب کے ہمراہ جیسے ہی سائرہ چچی اور فریحہ نے اندر قدم رکھا تڑ تڑ بوندیں گرنا شروع ہو گئیں۔ کچن میں پکوڑے تلتی عنادل نے کھڑکی سے جھانک کر ماں کا مطمئن چہرہ دیکھا اور جلدی سے دوسرے چولہے پر چائے کا پانی چڑھایا۔

"آپ کو بھی کیا ضرورت تھی۔ چچی ایسے موسم میں بازار جانے کی؟ اگر کچھ رہ گیا تھا تو مجھے بتایا ہوتا میں لے آتا۔" صوفے پر آرام دہ انداز میں ٹیک لگائے عاقب بولا۔

"ارے بیٹا! ساری شاپنگ تو منیزہ بھابھی اور میں نے مل کر کر لی تھی۔ بس یہ فریحہ کے جوتے رہ گئے تھے۔ سائز کا مسئلہ تھا اس لیے اس کو ساتھ لے گئی۔ گز جتنے لمبے تو پاؤں ہیں اس کے۔" ماں کی بات پر فریحہ نے گڑبڑا کر اپنے پاؤں پیچھے کیے۔ عاقب زیر لب مسکرا دیا۔

"سر بڑے سرداروں کے پاؤں بڑے گنواروں کے۔" پکوڑوں اور چائے کی ٹرے اٹھائے اندر آتی عنادل گنگنائی۔ فریحہ نے دانت کچکچا کر اسے دیکھا۔

"یونہی ایک مثال دے رہی تھی۔" عنادل نے معصومیت سے آنکھیں پٹپٹائیں۔

"مثالیں دینے کے لیے کیا میرے پاؤں ہی رہ گئے ہیں؟" فریحہ نے پکوڑا یوں دانتوں تلے دبایا جیسے عنادل کی گردن ہو۔

"ایک بار اپنی بھابھی بننے دو۔ پھر دیکھنا ان ہی "قدموں" کی نوک پر رکھوں گی۔"

"یہ منہ اور مسور کی دال۔" عنادل اسے چڑاتی اپنا کپ اٹھا کر عاقب کے ساتھ جا بیٹھی۔ جو چائے کی چسکیاں لیتا ان دونوں کی نوک جھونک سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

☆☆☆

ابھی تو چند لفظوں میں سمیٹا ہے تجھے میں نے



ابھی میری کتابوں میں تیری تفسیر باقی ہے!

دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز پر اس نے ڈائری پر جھکا سر اوپر اٹھایا اور پین منہ میں دبا کر مسکرا دی۔ "کیا ہوا؟ ایسے کیوں مسکرا رہی ہو؟"

شاپنگ بیگز قالین پر ڈھیر کرتے فریحہ نے استفسار کیا۔

"جب دروازہ ایسے ہلکی سی "چرر" کے ساتھ کھلتا اور بند ہوتا ہے تو کتنا رومانٹک لگتا ہے نا؟"

"بے وقوف!" فریحہ نے سر جھٹکا۔ "ایسی معمولی باتوں پر کون دھیان دیتا ہے بھلا؟"

"ایسی معمولی باتوں میں ہی تو زندگی کا اصل حسن چھپا ہوتا ہے بس دیکھنے والی آنکھ اور محسوس کرنے والا دل چاہیے۔"

"جیسا کہ؟" فریحہ نے ابرو اچکا کر پوچھا۔

"جیسا کہ کہر میں لپٹا چاند، جیسے سرخ گلاب کے گرد رقص کرتی سنہری تتلی، جیسے ہتھیلی پر گرتی بارش کی پہلی بوند، جیسے کوئی روتے روتے اچانک ہنس دے، جیسے کوئی اچانک سے پھونک مار کر موم بتی بجھا دے۔ یہ سب کتنا خوب صورت ہے نا؟"

فریحہ نے اس کی کسی مقدس راز کی طرح گہری آنکھوں میں جھانکا جہاں الوہی روشنیوں سے جگمگاتا ایک الگ جہاں سا آباد تھا۔ عنادل نے سر جھٹکا۔

"اچھا دکھاؤ تو سہی کیسے جوتے لائی ہو؟"

عنادل ڈبے اٹھا کر ایک ایک جوتا پہن کر دیکھنے لگی۔

"اف فریحہ کیا واقعی تمہارے پاؤں اتنے لمبے ہیں؟ مجھے تو لگ رہا ہے جیسے کسی کشتی میں اپنا پاؤں ڈال دیا ہو۔ بلکہ یہ والا تو پورا ٹائی ٹینک لگ رہا ہے۔"

پاؤں ادھر ادھر گھماتی وہ مصنوعی تشویش سے بولی۔ فریحہ ہونق سی اسے دیکھے گئی اور جب مطلب سمجھ میں آیا اسی جوتے کا خالی ڈبہ اٹھا کر اس کے سر پر دے مارا۔

☆☆☆

عاقب اور فریحہ کی شادی کے ہنگامے عروج پر تھے۔

عنادل، عاقب کی اکلوتی بہن تھی جبکہ فریحہ سے اس کے بہت سے رشتے جڑے تھے۔ وہ اس کے لیے بہنوں سے بڑھ کر تھی اس کی ہمدم اس کی ہمراز۔

مایوں بیٹھی فریحہ کو نظر بھر کر دیکھتی سائرہ کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ فریحہ صرف دو سال کی تھی جب ایک کار حادثے میں محمود صاحب کا انتقال ہو گیا۔ مسعود صاحب نے بیوہ بھابھی اور یتیم بھتیجی کو اپنی نرم گرم آغوش میں لے کر زمانے کے سرد و گرم سے آزاد کر دیا۔ منیزہ بیگم فطرتاً شفیق خاتون تھیں۔ ان کے سائرہ چچی کے ساتھ کبھی روایتی جیٹھانی دیورانی والے تعلقات نہیں رہے تھے۔ سائرہ انہیں بہت عزت اور قدر کی نگاہ سے دیکھتیں۔ عاقب کے لیے فریحہ کو مانگ کر انہوں نے سائرہ کا مان اور بڑھا دیا تھا۔

عنادل نے اس کے ہاتھ پر مہندی سے ڈیزائن بناتے درمیان میں عاقب کا نام لکھ دیا۔

"جب تک عاقب بھائی اپنا نام نہ ڈھونڈ لیں تب تک گھونگھٹ مت اٹھانے دینا۔" چپکے سے اس کے کان میں ہنسی وہ شرارت سے گویا ہوئی۔ فریحہ نے تابعداری سے سر ہلایا۔

مہندی کا فنکشن اختتام پذیر ہوا تو سب کزنز نے فریحہ کو گھیر لیا۔ روایت تھی کہ دلہن جس کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دے اس کی جلد شادی ہو جاتی ہے۔

"کوئی پھپھو اپنے "اتھرے" لاڈلے کے سر پر ہاتھ پھروا رہی تھی تو کسی ممانی کا اکلوتا آدھے گنجے سر والا بھائی "ابھی تک" اپنے سہرے کے پھول کھلانے پر رضامند نہیں تھا۔ کسی کزن نے شرارتاً فریحہ کا ہاتھ پکڑ کر عنادل کے سر پر رکھ دیا۔

"جلد سہاگن بنو۔"

سب نے باآواز بلند "آمین" کہا تھا۔

"ثم آمین۔" سبز گوٹا کناری والے دوپٹے کہر پر جمائے عنادل نے منہ پر دونوں ہاتھ پھیرے۔ اس کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ بظاہر ہنسی مذاق میں کی جانے والی دعا اتنی جلدی قبولیت کی معراج پا لے گی۔

☆☆☆

خاندان بھر سے دعوتوں کا سلسلہ چل نکلا تھا۔ دعو سارے گھر والوں کیا جاتا لیکن کبھی سائرہ گھر پر رک جاتیں تو کبھی منیزہ اور مسعود صاحب۔

عنادل کو البتہ فریحہ بصد اصرار ہر دعوت پر اپنے ساتھ لے کر جاتی۔

''جلدی کرو لڑکیو! اور کتنی دیر لگاؤ گی؟''

منیزہ بیگم نے ادھ کھلے دروازے سے انہیں آواز لگائی پھر اندر آ گئیں۔

''فریحہ! تم تیار نہیں ہوئیں بیٹا؟''

''تیار تو ہوں تائی امی! سوٹ کے ساتھ میچنگ گولڈن میک اپ کیا ہوا ہے؟''

عنادل نے سیاہ جارجٹ کا سوٹ پہنا تھا۔ گھنگھریالے بال کھلے چھوڑے، کانوں میں سیاہ آویزے اور ہونٹوں پر سرخ لپ اسٹک۔

''اتنا تیار ہونے کی کیا ضرورت تھی دل؟''

انہوں نے بے ساختہ نگاہ چرائی۔

''سوٹ کے ساتھ میچنگ ہے امی! کیا اچھی نہیں لگ رہی؟''

''افوہ ایک تو اس میچنگ کے چکر نے ان لڑکیوں کی اچھی خاصی مت ماردی ہے۔ کنواری شادی شدہ اور شادی شدہ کنواری لگتی ہیں۔'' وہ سر پر ہاتھ مار کر رہ گئیں۔ فریحہ کو ان کے انداز پر ہنسی آ گئی۔

''ویسے آج جانا کہاں ہے؟'' عنادل نے پوچھا۔

''آج ہم کہیں نہیں جا رہے بلکہ کچھ لوگ آ رہے ہیں ہمارے گھر۔'' فریحہ چہکی۔ ''تمہیں دیکھنے۔''

وہ ناسمجھی سے فریحہ کو دیکھنے لگی۔

عاقب اور فریحہ کی شادی کے دوران ہی اس کے لیے بہت اچھا رشتہ آ گیا تھا۔ رشتہ ہر لحاظ سے بہترین تھا۔ عاقب اور مسعود صاحب نے اچھی طرح چھان بین کر لی تھی۔ اسے پہلے اس لیے نہیں بتایا کہ وہ ڈسٹرب ہو کر شادی ٹھیک طرح سے انجوائے نہیں کر سکے گی۔ منیزہ بیگم مختصر الفاظ میں اسے اس ساری تفصیل سے آگاہ کرنے لگیں۔

وہ خالی خالی نگاہوں سے انہیں دیکھنے لگی۔

''یہ سب کچھ بہت غیر متوقع سہی، لیکن تمہیں ہم پر بھروسا رکھنا چاہیے بیٹا!''

اس کے یخ ہاتھوں کو تھامے وہ محبت سے کہہ رہی تھیں۔ تب ہی سائرہ نے مہمانوں کی آمد کی اطلاع دی۔

''کیا یہ کوئی خواب ہے؟''

اس نے پلکیں جھکا کر اپنی ہتھیلی پر رکھے ''شگن'' کے ہزار ہزار کے نوٹ دیکھے۔ ناہید بیگم کا جلد شادی پر اصرار۔ نکاح کی تاریخ طے ہو جانا......

وہ ابھی تک بے یقینی کے پنڈولم میں جھول رہی تھی۔ وہ جو زندگی کے ہر لمحے سے خوشیاں کشید کرنے کی چاہ رکھتی تھی۔ اس کی زندگی کا اتنا اہم موڑ اتنا بے رنگ اور پھیکا ہو گا یہ تو اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔

شجاع کے گھر والوں کی طرف سے رسمیں یوں ادا کی گئیں۔ جیسے فرض میں لپٹا ہوا کوئی قرض ہو۔

اسے عاقب اور فریحہ کی شادی کے دن یاد آ گئے۔ گیندے کے پھولوں سے سجے جھولے پر دونوں کا ایک ساتھ بیٹھنا، وہ چھیڑ چھاڑ، مسکراہٹیں۔

''لو بھئی دل! مبارک ہو! خیر سے تمہارا ''ایمر جنسی دولہا'' پاکستان پہنچ ہی گیا۔ میں تو ڈر رہی تھی خدانخواستہ فلائٹ وغیرہ کا کوئی مسئلہ ہو جاتا تو......''

''نکاح سے ایک روز قبل تارہ باجی کے مذاق کرنے یا شاید اڑانے پر وہ بے ساختہ لب کچل کر رہ گئی۔

اسٹیج پر لگتا تھا کسی نے جیتی جاگتی مورت دولہا کے پہلو میں بٹھا دی ہو۔

''دل! ریلیکس میری جان! سب ٹھیک ہے۔''

اس کے سرد ہاتھ ہولے سے دبا کر فریحہ کا دل چاہا اس سے لپٹ کر خوب روئے۔ تب ہی رخصتی کا شور بلند ہوا۔

☆☆☆

''ناہید بہن! دلہن تو آپ نے لاکھوں میں ایک ڈھونڈی ہے۔ ماشاء اللہ! کتنی من موہنی صورت ہے۔''



لاؤنج میں اس وقت قریبی رشتہ دار خواتین موجود تھیں۔

''واقعی! اپنے شجاع کے ساتھ خوب جچ رہی تھی۔'' نامیہ کی ساس تعریفیں کرتے نہ تھک رہی تھیں۔ ناہید بیگم کو خوب تاؤ آیا۔ مانا کہ بہت خوب صورت ہے لیکن ایسا بھی کیا کہ سب نے ایک ساتھ اس کے حسن کے قصیدے پڑھنا شروع کر دیے۔

''اللہ کرے سیرت کی بھی اتنی پیاری ہو۔ ورنہ خالی خولی صورت کا ہم نے کیا اچار ڈالنا ہے؟'' دل کی بھڑاس نکالے بغیر آرام سے بیٹھنے والوں میں سے وہ نہیں تھیں۔

اور جس کے بارے میں یہ ساری گفتگو ہو رہی تھی۔ وہ اس وقت اپنے عروسی جوڑے میں گھٹنوں کے گرد بازو پھیلائے وال کلاک کی ٹک ٹک سن رہی تھی۔ اسے اس وقت اپنا کمرہ، باہر کھڑکی سے جھانکتا چاند یاد آیا۔ برآمدے کی گرل سے لپٹی بیل، ڈائری میں رکھے زرد پھول یاد آئے۔

رخصتی کے وقت جن آنسوؤں پر بند باندھا تھا، اب وہ ٹوٹ گیا تھا۔

''تم رو رہی ہو؟''

اپنی سوچوں میں وہ اس قدر مستغرق تھی کہ اسے دروازہ کھلنے اور بند ہونے کا بھی احساس نہیں ہوا۔ چونکی تو تب جب وہ اس کے قریب بیٹھا پوچھ رہا تھا۔ عنادل نے بھیگی پلکیں جھکا کر نفی میں سر ہلایا۔ شجاع کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

''اتنا خوب صورت جھوٹ؟''

عنادل نے سر مزید جھکا لیا۔ پلکوں پر اٹکے موتی گالوں پر ڈھلک آئے تھے۔

''میں کوئی بلند و بانگ دعوے نہیں کروں گا دل! لیکن اتنا ضرور کہنا چاہوں گا کہ میری پوری کوشش ہو گی آج کے بعد ان آنکھوں میں میری وجہ سے کبھی آنسو نہ آئیں۔''

اپنی انگلی کی پور سے اس کے آنسو چنتا وہ اپنے مخصوص نرم لہجے میں بول رہا تھا۔ عنادل نے گہری اطمینان بھری سانس خارج کی تھی۔ بھاری سانولے مردانہ ہاتھوں میں اس کا نازک ہاتھ تھامے انگوٹھی پہناتا وہ پوچھ رہا تھا۔ ''کیسی ہے؟''

''بہت پیاری...... لیکن؟'' عنادل نے بات ادھوری چھوڑ کر بے ساختہ زبان دانتوں تلے دبائی تھی۔

''لیکن؟'' شجاع سیدھا ہو بیٹھا۔

''کچھ نہیں۔'' دھیرے سے نفی میں سر ہلاتی وہ ہنس پڑی۔ شجاع مبہوت سا اسے دیکھے گیا۔ اس لمحے اسے لگا ایک دن پہلے وہ جس کے نام تک سے واقف نہیں تھا اس وقت اس کے دل پر بڑے استحقاق اور طمطراق سے براجمان ہو گئی ہے۔

☆☆☆

''ارے کہاں رقیہ آپا! آپ تو اچھی طرح جانتی ہیں میرا شجاع کتنی سنجیدہ اور خاموش طبیعت کا مالک ہے۔ اسی لیے تو شادی پر زیادہ دھوم دھڑکا نہیں کیا۔ بارات والے دن ہی ساری برادری کو کھانا کھلا کر ولیمہ نپٹا دیا تھا۔''

لاؤنج میں ناہید بیگم فون پر محو گفتگو تھیں۔

صبح معمول کے مطابق جلد ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔ اسکی برسوں سے عادت تھی سب سے پہلے اٹھ کر کھڑکی کھولتی سامنے باغیچے کا سرسبز منظر اسے تروتازہ کر دیتا۔

اس نے ایک نظر برابر میں بے خبر سوئے شجاع پر ڈالی اور آہستگی سے اٹھ کر کھڑکی کھول دی۔ کسی اجاڑ، بیابانی کا سا منظر پیش کرتا سامنے یقیناً لان ہی تھا۔ وہ کھڑکی سے ہٹ گئی۔ دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔

''آج کل کے لڑکوں کی طرح یہ چاؤ چونچلے میرے شجاع کو پسند نہیں۔ بلکہ اسے تو یہاں کے رسم و رواج کا بھی کچھ پتا نہیں ہے......'' خاموشی میں صرف ناہید بیگم کی آواز ہی گونج رہی تھی۔ آہستگی سے دروازہ بند کرتی وہ بیڈ پر آ کر بیٹھ گئی۔

مضبوط قد کاٹھ کا اونچا لمبا سانولا سا مرد اس کے لیے دنیا کا سب سے پرکشش مرد تھا۔ کئی ثانیوں تک اسے یونہی تکتے رہنے کے بعد اٹھنے لگی تو شجاع

نے اس کا ہاتھ کھینچ کر اپنے پہلو میں گرا لیا۔

''آپ...... جاگ رہے تھے؟''

''کافی دیر سے...... بس تمہاری محویت توڑنا اچھا نہیں لگا۔'' عنادل نے جھینپ کر سر جھکا لیا۔

''ویسے میں ابھی تک تمہارے اس ''لیکن'' میں اٹکا ہوا ہوں۔ شاید تم مجھ سے اس سے زیادہ قیمتی تحفہ ایکسپیکٹ کر رہی تھیں؟'' وہ انگلی کی طرف اشارہ کرکے پوچھ رہا تھا۔

''یہ رنگ میرے لیے بہت قیمتی ہے شجاع! شاید ہی میں زندگی بھر اسے کبھی اپنی انگلی سے اتار سکوں۔ لیکن شادی کی رات مہکتے ہوئے پھول کے ساتھ شوہر کا اظہار محبت کرنا بہت رومانٹک لگتا ہے نا؟'' فریحہ ہوتی تو اپنا سر پیٹ لیتی۔ وہ سوچ کر ہنس دی۔

''اوہ تو یہ بات ہے۔''

''رات والے ٹراؤزر بنیان میں ملبوس شجاع ایک جھٹکے سے اٹھ کر باہر چلا گیا۔

عنادل ہکا بکا بیٹھی رہ گئی۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں سرخ مہکتا گلاب تھا۔

''پھولوں جیسا حسن رکھنے والی میری پیاری سی بیوی کے حسن کا ایک چھوٹا سا نذرانہ۔''

کہنے کے ساتھ ہی اس نے پھول کان کے اوپر اس کے گھنگھریالے بالوں میں اٹکا دیا۔

عنادل کا روم روم مہک اٹھا تھا۔

''جب ہم اپنی چھوٹی چھوٹی نا آسودہ خواہشات پر صبر کرنا سیکھ لیتے ہیں تو بدلے میں یقیناً کوئی بڑا انعام ہمارا منتظر ہوتا ہے۔'' ماں کی بات اسے اب سمجھ میں آئی تھی۔

☆☆☆

''سب یہاں موجود ہیں تو پھر ناشتا کون بنا رہا ہے؟''

اصغر صاحب نے لاؤنج میں موجود نفوس پر طائرانہ نگاہ دوڑاتے ملین ڈالر کا سوال کیا تھا۔

''آج رسم کے مطابق ناشتا شجاع کی سسرال سے آئے گا۔''

اپنی چھوٹی دونوں جڑواں بیٹیوں کے بالوں کی پونی کستی ناعمہ اطمینان سے بولی تھیں۔ بڑی بیٹی تھوڑے فاصلے پر عائلہ سے بیوٹی ٹپس لے رہی تھی۔

''اچھا تمہاری ماں ویسے تو ان رسموں، رواجوں کے خلاف بڑی علمبرداری بنی پھرتی ہے۔''

''آپ کو آم سے مطلب ہونا چاہیے۔ پیڑ سے نہیں۔''

ناہید بیگم آج کسی بحث کے موڈ میں نہیں تھیں کاشفہ موبائل پر شادی کی پکس عدیل کو واٹس ایپ کر رہی تھی۔ رضا بھی قدرے ریلیکس انداز میں صوفے پر نیم دراز اپنے موبائل پر مصروف تھا۔

''دس تو بج گئے۔ اب کیا ہم بارہ بجے تک ان کے ناشتہ لانے کے انتظار میں بھوکے بیٹھے رہیں گے؟'' کھانے کے معاملے میں وہ وقت کا بخوبی حساب کتاب رکھتے تھے۔ ناہید بیگم کوئی کرارا سا جواب دینا چاہتی تھیں کہ اسی وقت عنادل اور شجاع ایک ساتھ اندر داخل ہوئے۔

''کیا واقعی میں اتنی خوب صورت ہیں؟'' عائلہ نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

کاشفہ کے مقابلے میں اس کا رنگ صاف تھا۔ جبکہ نقوش ناعمہ کے جاذب نظر تھے۔

لیکن بچیوں کی پیدائش اور کھانے پینے کے معاملے میں حد درجہ بے احتیاطی نے ان کی جسامت کا حدود اربعہ خاصا وسیع کر دیا تھا۔ اب تھل تھل کرتے وجود میں نقوش کہیں گم ہو کر رہ گئے۔ ایسے میں ایک عائلہ ہی تھی جو خود کو بیوٹی کوئن سمجھتی۔ بال چھدرے، ناک پھینی تھی تو کیا ہوا رنگ تو گورا تھا۔ اس کی نظر میں اپنے سوا کوئی جچتا نہیں تھا۔ اور اب نا چاہتے ہوئے بھی اس کی نگاہیں بھٹک بھٹک کر عنادل کی طرف اٹھ رہی تھیں۔

جو پرپل کامدار سوٹ پہنے، سلیقے سے کیے میک اپ میں کندن کی مانند دمک رہی تھی۔

''لو بھئی آ گیا وہ شاہی ناشتہ جس کے انتظار میں ہم کب سے اپنی نگاہیں فرش راہ کیے بیٹھے تھے۔''

فریحہ اور عاقب کو ناشتے کے لوازمات کے ساتھ آتا دیکھ کر اصغر صاحب نے نعرہ بلند کیا تھا۔ ناہید بیگم کو ان کے چوڑ پن پر آج سے پہلے کبھی اتنا غصہ نہیں آیا تھا۔

بہت خوش گوار ماحول میں ناشتا کیا گیا۔ لیکن ناہید بیگم کو اپنے حلق میں بار بار نوالے اٹکتے محسوس ہوئے۔ آج انہیں اپنا شجاع بہت بدلا بدلا ہوا سا لگا۔

☆☆☆

شجاع ناشتے کے بعد باہر چلا گیا تھا۔ جاتے جاتے اس نے پلٹ کر جن نگاہوں سے عنادل کو دیکھا تھا۔ ایک شرمیلی مسکراہٹ نے اس کے چہرے کا احاطہ کیا تھا۔

دن بھر رشتہ دار خواتین کا ''منہ دکھائی'' کے لیے آنا جانا لگا رہا۔ ناعمہ آپا سائے کی طرح اس کے ساتھ چپک کر بیٹھی رہیں۔ کاشفہ، عائلہ اور ناہید بیگم بھی لاؤنج میں ہی تھیں۔ مہمانوں کی خاطر تواضع کی ذمہ داری ملازماؤں نے اٹھا رکھی تھی۔

کافی دیر ایک ہی جگہ بیٹھے رہنے سے اس کی کمر دکھنے لگی تھی۔ مہمانوں کے رخصت ہوتے ہی ناعمہ آپا نے کمال بے تکلفی سے اس کا پرس کھول کر نوٹ گننا شروع کر دیے۔

''کیا آپ کے ہاں رواج ہے منہ دکھائی میں ملنے والی ساری رقم بڑی نند کو تحفتاً دے دی جاتی ہے؟''

رضا ابھی بھی آیا تھا اور آتے ہی سنجیدہ چہرہ بنا کر پوچھنے لگا۔ لاؤنج میں خاموشی چھا گئی۔ ناعمہ کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ عنادل نے نفی میں سر ہلایا۔

''خوش قسمتی سے ہمارے ہاں بھی نہیں ہے۔''

وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ اور ناعمہ کے ہاتھ سے سارے نوٹ اچک کر دوبارہ پرس میں ڈالے اور پرس عنادل کی طرف بڑھا دیا۔

''ہاں تو میں بھی گن ہی رہی تھی کون سا اپنے پاس رکھ رہی تھی۔'' ناعمہ آپا کھسیانی ہو کر بولیں۔

''آپ تھک گئی ہوں گی جا کر اپنے کمرے میں آرام کر لیں۔'' اب کی بار وہ بولا تو سنجیدہ لہجہ نرمی لیے ہوئے تھا۔ پل میں لہجہ بدلتا تھا اس کا۔

''کمال ہے یہ خیال گھر کی خواتین کو کیوں نہیں آیا؟'' دل سے متشکرانہ نگاہوں اسے دیکھتی فوراً اٹھی تھی۔

☆☆☆

''لگتا ہے آپ کسی بہت بڑی مجبوری کے تحت یہاں کام کر رہے ہیں؟''

ٹھنڈی میٹھی سہ پہر ڈھل رہی تھی جب وہ لان میں چلی آئی۔ املتاس کے نیچے کرسی ڈالے اونگھتا ادھیڑ عمر مالی ایک دم ہڑبڑا کر اٹھا تھا۔ ''نہیں، نہیں تو......''

''تو پھر اتنی بددلی کیوں چاچا؟''

قدموں تلے آ کر چرچراتے زرد پتوں کا نوحہ اس کی زبان پر شکوہ بن کر پھسلا تھا۔

''خزاں تو ابھی دور ہے۔ پھر یہاں خزاں رت کی زردیاں کیوں کھلی ہوئی ہیں؟''

چلتے چلتے وہ اچانک پیچھے مڑی اور اپنے عقب میں کھڑے شجاع سے بمشکل ٹکراتے بچی۔ ''کیونکہ آج سے پہلے یہاں پیار کی ملکہ نے قدم رنجہ جو نہیں فرمایا تھا۔'' اسے اپنے ہمراہ لیے وہ سفید اور گلابی پھولوں کے بیچ کے پاس رکھے جھولے کی طرف بڑھ گیا۔

''لگتا ہے تمہیں پھول بہت پسند ہیں؟''

''پسند؟ عشق کرتی ہوں میں ان سے۔'' لان کے بیچ و بیچ جھولے کی نامانوس ''چرخ چوں'' گونجی تھی۔

''اوہ! تو کیا میں انہیں اپنا رقیب سمجھوں؟''

''بالکل نہیں۔ یہ پھول، خوشبو، بادل، ہوا، بارش سب آپ کے بغیر بے معنی ہیں۔''

وہ اپنی محبتوں کے اظہار کے معاملے میں ایسی ہی تھی۔ شجاع نے تھوڑا سا آگے جھک کر ٹہنی سمیت ایک پھول توڑا اور اس کی طرف بڑھایا ہوا سے چہرے پر آئے اپنے بالوں کو ہاتھ سے سمیٹتی اس نے پھول تھام لیا۔

''سنا ہے سفید پھول انتظار کی علامت ہوتے ہیں؟''

کانٹا بہت زور سے اس کی انگلی میں چبھا تھا۔

☆☆☆

شجاع کے ہمراہ زندگی اتنی خوب صورت اور

مکمل ہوگی اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ اسے اپنے سامنے دیکھ کر دل کے چہرے پر جو مسکراہٹ آئی تھی دنیا میں اس کا کوئی مول نہیں تھا۔

اس کے سنگ وہ ہوا کے رتھ پر سوار بادلوں کو چھو آئی تھی۔ چاند کے پہلوں میں چمکتے صبح کے ستارے کو اپنی مٹھی میں قید کیا تھا۔ اپنی آنکھ سے گرتے ایک ایک آنسو کو سیپ میں بند موتی کی طرح اسے سنبھالتے دیکھا تھا۔

ایسے ہم سفر کی ہمراہی پر وہ کیونکہ نہ شاداں ہوتی؟

اچانک اس کے رقص کرتے پاؤں تھمے تھے۔

وہ نمک کا مجسمہ بنی کھڑی رہ گئی۔

"شجاع کی چھٹی ختم ہوگئی ہے۔ ایک مہینہ اتنی جلدی گزر گیا تھا پتا ہی نہیں چلا۔" ناعمہ اس کے ساتھ لگی بیٹھی کافی دیر سے اسے مشتاق کو کاروبار میں ہونے والے گھاٹے کے بارے میں بتاتی رہیں۔ پہلے بھی ان کا اکثر وقت میکے میں ہی گزرتا۔ لیکن شجاع کی شادی کے بعد اس نے مستقل ہی ادھر ڈیرہ جما لیا تھا۔

"گھر کون سا کہیں بھاگا جا رہا ہے۔ عرصے بعد بھائی پردیس سے آیا ہے۔ اس کو جی بھر کر دیکھ تو لوں۔" صبح و شام وہ یہ دہرانا نہیں بھولتی تھیں۔

"مشتاق بھائی کو کاروبار میں گھاٹا کب نہیں ہوتا آپا! یہ بتائیں؟"

کیوٹکس لگے ناخنوں پر پھونکیں مارتی عائلہ ازراہ تمسخر بولی۔ آپا فوراً ہراساں ہوگئیں۔

"ہاں تو اپنے دل کا دکھ اپنے ماں جائے سے نہیں کہوں گی تو اور کس سے کہوں گی۔ بڑی بہن ہوں حق بنتا ہے میرا۔ اللہ میرے بھائی کو نوازے ہی نوازے۔ اس کے ہوتے غیروں کے آگے جھولی پھیلاتے اچھی لگوں گی؟"

آنکھوں میں آنسو بھرے رقت بھرے لہجے میں کہا۔

"اللہ نہ کرے آپا! آپ کو کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے پڑیں۔ میں نے آپ سے کہا ہے نا فکر کرنے کی بالکل ضرورت نہیں۔"

شجاع نے وہی کہا جو ہمیشہ سے کہتا آرہا تھا۔

اور واپس جا کر اسے اپنے کیے کا مان رکھنا تھا۔ ناعمہ آپا اس پرواری صدقے جاتیں ابھی تک دوپٹے کے پلو سے آنکھ کے نم گوشے رگڑ رگڑ کر پونچھ رہی تھیں۔

"بھائی! آپ کو اپنا وعدہ یاد ہے نا؟" کاشفہ نے لاڈ سے پوچھا۔

"بھائی کی جان! پہلے تمہیں کس چیز کے لیے نہ کہی ہے؟"

نفی میں سر ہلاتی کاشفہ اس سے لپٹ گئی۔

"اور بھائی میں نے دبئی کی نئی کاسمیٹکس برانڈ کی لسٹ آپ کو واٹس ایپ کر دی ہے۔ یاد رکھیے گا آپ نے جاتے ہی سب سے پہلے میرا یہ کام کرنا ہے۔ بہت زبردست برانڈ ہے۔" عائلہ نے ایک بار پھر یاد دہانی کروائی تھی۔

"باقی سب چھوڑیں شجاع بھائی! بس ابا کے لیے وہ رولنگ پاستا کے پیکٹ لازمی یاد رکھیے گا۔" رضا نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اور بٹر کوکیز بھی۔" بظاہر اخبار پر نگاہیں دوڑاتے اصغر صاحب بے ساختہ بول پڑے۔ شجاع قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

"فلائٹ کب کی ہے؟" ناہید بیگم نے پوچھا۔

"کل سہ پہر چار بجے۔"

تب ہی اس کی نظر دروازے پر دونوں بازو پہلو میں گرائے ساکت کھڑی عنادل پر پڑی تھی۔

☆☆☆

وہ اسی وقت وہاں سے اٹھ کر اس کے پیچھے کمرے میں آگیا تھا۔

"شجاع آپ جا رہے ہیں؟" آنکھوں میں موجزن سمندر پر بمشکل بند باندھے وہ اس کے سامنے امتحان بن کر آ کھڑی ہوئی تھی۔

"واپس آنے کے لیے جانا تو پڑے گا۔" وہ دانستہ اس کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہا تھا۔

"میں...... کیسے رہوں گی آپ کے بغیر؟" سیاہ آنکھوں کے کنارے بھیگنے لگے تھے۔

"جیسے میں رہوں گا۔" ترتیب سے رکھے



کاغذات کو بیڈ پر پھیلا کر وہ ایک بار پھر انہیں ترتیب دینے لگا۔

"میں آپ کی طرح بہادر نہیں ہوں۔"

"تمہیں کس نے کہا، میں بہادر ہوں؟" کاغذات سمیٹ کر ایک طرف رکھتے وہ اس کے عین سامنے آ کر بیٹھ گیا۔ اس کی طرف دیکھنا ناگزیر ہوگیا تھا۔

"جانتی ہو پہلی بار یہاں آ کر مجھے اتنی خوشی ملی ہے اور پہلی بار ہی یہاں سے جانا مجھے اتنا مشکل لگ رہا ہے۔" تصور گھٹائیں چھم چھم برسنے لگیں۔ وہ بے بسی سے دیکھنے لگا۔

"سنو! میرا انتظار تو کرو گی نا؟" وہ رونا بھول کر یک ٹک اسے دیکھے گئی۔ "انتظار؟ آپ کہیں تو آپ کے واپس آنے تک میں پلک تک نہ جھپکوں؟"

شجاع اسے دیکھتا رہ گیا تھا۔

اور پھر وہ چلا گیا۔ اس کی بند مٹھی میں انتظار کے ڈھیر سارے جگنو تھما کر۔

عنادل کو لگا اس کا کمرہ ویران ہوگیا۔ دل اور آنکھیں بھی۔ ہر جگہ اس کے ہونے کا احساس تھا لیکن وہ کہیں نہیں تھا۔

اس نے گہری سانس کھینچ کر "عود عنبر" کی مہک کو اپنے اندر اتار لیا تھا۔

☆☆☆

شجاع کے دبئی چلے جانے کے بعد اس گھر میں نئے سرے سے زندگی شروع کرنے کا کوئی سرا اس کے ہاتھ نہیں آرہا تھا۔ وہ بہت الجھی الجھی اور گم صم سی تھی۔

"نہ بی بی! یہ کون سا طریقہ ہے؟ میرا بیٹا کمانے کے لیے ملک سے باہر گیا ہے خدانخواستہ مر نہیں گیا جو تم یوں کمرہ بند کیے سوگ منا رہی ہو۔" ناہید بیگم اس کے سر پر آ کھڑی ہوئی تھیں۔ وہ بوکھلا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

ناہید بیگم نے مہینہ بھر جو اپنی آنکھوں سے دیکھا بمشکل اس پر صبر کیا تھا۔ لیکن آج وہ سارے اگلے پچھلے حساب بے باق کرنے پر تل گئیں۔

بہت کڑے انداز میں اسے گھر کی بڑی بہو ہونے کی ذمہ داریاں گنوائی گئیں اور یہ کہ اسے ان کے گھر میں ان کے طور طریقوں سے رہنا ہوگا۔ بہوؤں کا منہ متھا سجا کر الگ تھلگ رہنا انہیں سخت ناپسند ہے وغیرہ وغیرہ۔

عنادل سر جھکائے ان کی ڈانٹ پھٹکار سنتی رہی۔ وہ اندازہ نہیں کر پائی ان کا لہجہ زیادہ سخت تھا یا الفاظ آج سے پہلے کبھی کسی نے اس سے اس انداز میں بات نہیں کی تھی۔ اس کے جھکے سر پر ایک گہری نظر ڈالتی وہ باہر نکل گئیں۔

"بہو کو آج اپنے دام میں رکھوں گی تو کل کو میرا بیٹا میرے قابو میں رہے گا۔" یہ سب کرنا ضروری تھا۔ انہوں نے خود کو تسلی دی۔ اور اندر عنادل سوچ رہی تھی ان کا لہجہ سخت سہی لیکن بات غلط نہیں تھی۔

اس کی شروع سے عادت تھی ہر بات کا مثبت رخ دیکھ کر اگلے کو مارجن دینے کی۔

☆☆☆

شام کو وہ فریش ہو کر باہر آ گئی۔

لابی سے گزرتے اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اس نے بے دھیانی میں ریسیور اٹھا لیا۔

"ہیلو؟" اس کا دل لمحہ بھر کے لیے جیسے تھم سا گیا۔

"شجاع!" اس کے لب پھڑپھڑائے۔

"کیسی ہو دل؟" اس کی نظر سامنے اٹھی۔ تھوڑے سے فاصلے پر ناہید بیگم کاؤچ پر بیٹھی بظاہر کاشفہ کی بات سن رہی تھیں — لیکن ان کی نگاہیں عنادل پر ہی جم گئیں۔

"کیسی ہو تم؟ ٹھیک تو ہو نا؟"

"آپ کیسے ہیں؟"

"کیسا ہو سکتا ہوں؟ تمہارے بغیر؟" وہ آزردگی سے ہنس دیا۔

"آپ نے خیریت سے وہاں پہنچ جانے کی اطلاع بھی نہیں دی۔ میں موبائل سرہانے رکھے انتظار کرتی رہی۔"

"کال تو میں نے کی تھی۔ گھر کے نمبر پر پتا چلا تم اس وقت سوئی ہوئی ہو۔"

وہ شجاع سے بہت کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن حلق میں بار بار کچھ اٹک رہا تھا۔ اوپر سے ناہید بیگم کی نگاہیں۔

"اپنا بہت سارا خیال رکھنا دل! میں پھر کال کروں گا۔ خدا حافظ۔ اس کی آواز نے اندر کی تشنگی اور بڑھا دی تھی۔ اسے وہاں سے اٹھنے میں دقت ہوئی۔

☆☆☆

تین ماہ کے مستقل قیام کے بعد نائمہ آپا کو سسرال جانے کے لیے پرتولتا دیکھ کر کاشفہ نے باقاعدہ شکر ادا کیا تھا۔

عدیل کے گھر والے رشتے کے سلسلے میں آنا چاہ رہے تھے۔ نائمہ آپا کی موجودگی کی وجہ سے اس نے انہیں آنے سے روک دیا تھا۔ آپا کو عدیل اور اس کے گھر والے پہلی ملاقات میں ہی پسند نہیں آئے تھے۔ اوپر سے ان کی نکتہ چینی کی عادت۔ کاشفہ نے بہت صبر سے آپا کے واپس جانے کا انتظار کیا تھا۔

عدیل اور اس کی پہلی ملاقات کالج میں ہوئی تھی۔ مردانہ وجاہت کا شاہکار اوپر سے بے نیازی...... کئی طرح دار لڑکیاں اس کی طرف بڑھی تھیں۔ لیکن اس نے صرف کاشفہ کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا۔

"کچھ تو ایسا خاص ہے مجھ میں۔"

کاشفہ اترائی پھرتی۔ بہت جلد دونوں کی دوستی، پسند اور پھر محبت میں ڈھل گئی۔ کاشفہ کو احساس ہو گیا تھا عدیل اس کی امارت سے حد درجہ متاثر ہو چکا ہے۔ اس پر مزید رعب ڈالنے کے لیے وہ اسے وقتاً فوقتاً بے حد قیمتی تحائف دیتی رہتی۔ کالج کا لاسٹ ڈے تھا جب کاشفہ نے اسے سیدھے سیدھے پروپوزل بھیجنے کا کہا۔

تین غیر شادی شدہ بہنوں کی وجہ سے عدیل کے گھر والے فی الحال اس کی شادی کے چکر میں نہیں پڑنا چاہتے تھے۔ لیکن عدیل نے انہیں منا لیا۔

پہلی بار کاشفہ کا عالی شان محل جیسا گھر دیکھنے کے بعد وہ پلکیں جھپکانا بھول گئے تھے۔ چیزوں کی بہتات اور بے ترتیبی ایک طرف البتہ امارت خوب جھلک رہی تھی۔ معمولی شکل و صورت کی کاشفہ پر واری صدقے جاتے انہیں لمحہ لگا تھا۔

نائمہ آپا کے لاکھ ناک بھوں چڑھانے کے باوجود انہوں نے خوش اخلاقی کے ایسے ڈونگرے برسائے کہ ناہید بیگم اور اصغر صاحب کو نیم رضامند کر ہی لیا۔

اب وہ باقاعدہ مٹھائی لے کر آ رہے تھے۔ منگنی کی رسم کی تاریخ مانگنے کاشفہ نے خانساماں کو لنچ کا زبردست اہتمام کرنے کا کہا۔

"شجاع کی موجودگی میں یہ لوگ آتے تو اچھا تھا اس کی بھی ملاقات ہو جاتی ہے۔" ناہید بیگم کو رہ رہ کر یہی خیال ستانے لگا۔

"ہونہہ! اگر جو شجاع بھائی کو یہ لوگ پسند ہی نہ آتے تو...... اسی لیے میں نے جان بوجھ کر......"

عنادل کو آتا دیکھ کر کاشفہ نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"ہاں تو......" اس کا اشارہ پا کر ناہید بیگم بھی کچھ کہتے کہتے چپ ہو گئیں۔

عنادل کو تشنگی سی محسوس ہوئی۔ وہ خاموشی سے واپس پلٹ گئی۔

"بہت بری لگتی ہے مجھے اس کی کن سوئیاں لینے کی عادت۔"

"نجانے کب سے چپ چاپ کھڑی ہماری باتیں سن رہی تھی۔"

"تو اور کیا شکل سے معصوم دکھتی ہے اندر سے پوری گھنی ہے۔" جاتے جاتے ماں بیٹی کے خیالات اس کے کانوں تک پہنچے تھے۔ اسے دکھ ہوا۔ مہمانوں کی آمد کے بارے میں کسی نے بطور خاص اسے بتانا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ اب اگر وہ خود سے اس سب میں شامل ہونے کے لیے پہل کر رہی تھی تو بھی انہیں گوارا نہیں تھا۔

خانساماں کے کھانوں کی مہک شاید اتنی دور تک گئی تھی کہ صبح کو ساز و سامان کے ساتھ جانے والی آپا دوپہر کو پھر آ دھمکیں۔ (شوہر اور بچیوں سمیت)

کاشفہ جتنا بدمزہ ہوتی کم تھا۔ مہمان آ چکے تھے۔ وہ مردتاً خاموش رہی۔ البتہ آپا کی زبان کون پکڑ



سکتا تھا۔

عدیل کی ماں، باپ، تین بہنیں اور تو اور پوپلے منہ والی دادی بھی ساتھ تھیں۔

"کر دی نا چھوٹے لوگوں والی حرکت۔ جیسے کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں پہلی بار کھانا کھانے کا موقع ملا ہو۔"

مہمان شکم سیر ہو کر رخصت ہوئے تو آپا نے اس موقع پر خود کو نظر انداز کیے جانے کا بدلہ یوں تاک تاک کر وار کر کے اتارا تھا۔ عائلہ کو ان کی ڈریسنگ پسند نہیں آئی تھی۔

"نجانے کس دور میں جی رہے ہیں یہ لوگ۔ بھلا آج کل کون کون پہنتا ہے اتنے کھلے بلاؤز۔" ناک چڑھا کر وہ تبصرہ کر رہی تھی۔

"سو باتوں کی ایک بات بلیک ٹو پیس سوٹ میں عدیل بہت شاندار لگ رہا تھا۔"

اور اس کے سامنے موٹی توند والے مشتاق بھائی بالکل زیرو......" کاشفہ نے ان کے تبصروں کو ان کی "جیلسی" پر محمول کیا اور بے نیازی سے اٹھ کر چل دی۔

☆☆☆

یوں جو تکتا ہے آسمان کو تو
کوئی رہتا ہے آسمان میں کیا؟
یہ مجھے چین کیوں نہیں پڑتا
ایک ہی شخص تھا جہاں میں کیا؟؟

چودھویں کے چاند نے اپنی ساری چاندنی اس پر لٹا دی تھی۔

"کیا کھوجتی رہتی ہیں آپ چاند میں؟" اس نے مڑ کر دیکھا رضا اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ "کیا نظر آتا ہے آپ کو اس چاند میں؟" انگلی سے آسمان کی طرف اشارہ کرتا وہ پوچھ رہا تھا۔

عنادل نے نفی میں سر ہلایا "کچھ نہیں" اور لان کی سیڑھیاں چڑھ گئی۔ ہوا سے اڑتے گھنگھریالے بال، گہری سیاہ اداس آنکھیں...... رضا کو اس پہر وہ کوئی پراسرار افسانوں کا کردار لگی۔ اس کے جانے کے بعد وہ کافی دیر تک کھڑا لاشعوری طور پر اسے ہی سوچتا گیا۔

شجاع کی کال آئی۔ وہ بھاگتی ہوئی لابی تک گئی۔ لیکن ناہید بیگم ریسیور اٹھا کر بات کر رہی تھیں۔

"لڑکا باپ کے ساتھ اسٹور چلا رہا ہے۔ اچھے قدر دان لوگ ہیں، ہماری کاشفہ کو خوش رکھیں گے۔ اس جمعہ کو منگنی کا فنکشن کرنا چاہ رہے تھے۔" ناہید بیگم اسے تفصیل سے کاشفہ کے رشتے کے بارے میں بتانے لگیں۔ ماں کے گھورنے کے باوجود بے صبری سے ادھر ادھر چکر کاٹتی عائلہ نے ان کے ہاتھ سے ریسیور لے لیا۔

"بھائی! سامان تو مل گیا ہے۔ بس ایک دو چیزیں کم تھیں۔ ہو سکے تو اگلی بار وہ بھی بھیج دیجیے گا پلیز پلیز......"

ناہید بیگم نے اس کے ہاتھ سے ریسیور لے لیا تھا۔

☆☆☆

کیا ستم ہے کہ ہجر کے دن بھی
زندگی میں شمار ہوتے ہیں!

اگلی صبح وہ امی کے ہاں چلی آئی۔

"سنا تھا بیٹیاں شادی کے بعد پرائی ہو جاتی ہیں۔ تم نے تو ثابت کر دیا۔" اسے گلے سے لگائے منیزہ بیگم شکوہ کر گئیں۔

"سوری امی!" اس کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔

"ارے پاگل! مذاق کر رہی ہوں۔" اس کا رخسار تھپتھپا کر وہ مسکرائی تھیں۔

"جانتی ہو تم پھپھو بننے والی ہوں۔" سائرہ چچی نے اسے خوش خبری سنائی۔

"کیا واقعی؟" اسے خوشگوار حیرت ہوئی۔ اسی وقت عاقب اور فریحہ کسی بات پر بحث کرتے باہر نکلے تھے۔

"دل!" فریحہ بھاگتے ہوئے اسے لپٹ گئی۔

"بہت مبارک ہو فریحہ!" فریحہ کا چہرہ گلنار ہونے لگا۔ عاقب فریج سے مٹھائی کا ڈبا نکال لایا۔

''اکلوتی پھپھو کا منہ میٹھا کرواتے ہیں۔'' پوری گلاب جامن اس کے منہ میں دی۔

''جیسے ہی گڈ نیوز کا پتا چلا عاقب نے مٹھائی کا ڈبا لا کر فریج میں رکھ دیا تھا کہ سب سے پہلے اس خبر پر عنادل کا منہ میٹھا کرواؤں گا۔'' سائرہ بھی بتا رہی تھیں۔ وہ مسکرادی۔

سب کچھ پہلے جیسے ہی تھا۔ منیزہ بیگم اور سائرہ باتوں باتوں میں ایک ساتھ سارے کام نپٹاتیں۔ ان کی گفتگو عموماً پڑوس سے شروع ہوکر خاندان برادری سے ہوتی ملکی سیاسی حالات پر جاکر ختم ہوتی۔

''یہ ہماری مائیں بھی نا۔'' اس نے برآمدے کی گرل کے ساتھ لپٹی بیل پر اگے ننھے منے کاسنی پھول گنے، اس کے باغیچے کے پھول، پودوں نے جیسی گردنیں اٹھا اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔ وہ ایک ایک چیز کو چھولی گئی۔

''شجاع کیسا ہے بیٹا؟''

''ٹھیک ہیں امی۔'' وہ ان کے قریب تخت پر آکر بیٹھ گئی۔ منیزہ بیگم ننھے مہمان کے لیے سوئٹر بن رہی تھیں۔

''بچہ ہو جاتا تو تمہارا بھی دل لگا رہتا۔'' انہوں نے گہری سانس کھینچی۔

''اللہ نے لکھے ہوں، دیر سویر ہو جاتی ہے۔'' وہ خاموشی سے انگلی پر اون لپیٹتی اور کھولتی رہی۔ پھر سب کے لاکھ روکنے پر بھی وہ شام سے پہلے وہاں سے نکل آئی تھی۔

☆☆☆

کاشفہ چاہتی تھی منگنی کا فنکشن خوب دھوم دھام سے ہو۔ مہینوں خاندان میں اس کی منگنی کا چرچا ہوتا رہے اور اس سلسلے میں وہ کوئی کمپرومائز کرنے پر تیار نہیں تھی۔

اپنا سوٹ خود ڈیزائنر سے تیار کروایا تھا۔ میچنگ جیولری، سینڈل، شہر کے مہنگے ترین بیوٹی پارلر سے ٹائم لیا۔ شجاع نے فنکشن کے ارینجمنٹ کے لیے الگ سے رقم بھجوائی تھی۔ عدیل اور اس کے گھر والوں کے لیے قیمتی تحائف۔

ہر ماہ گھر کے اخراجات کے علاوہ عنادل کے لیے الگ سے پیسے بھجوائے تو ناہید بیگم سخت بدگمان ہوگئیں۔

''میں نے تو اپنی بچیوں اور بہو میں کبھی کوئی فرق نہیں رکھا۔ پھر بھی تمہیں اگر اپنی ماں پر اعتبار نہیں ہے کہ میں تمہاری بیوی کو اچھا کھانے اور پہننے اوڑھنے کو نہیں دیتی تو بھلے شوق سے اس کے لیے الگ سے خرچا بھیجا کرو۔''

''ایسی کوئی بات نہیں امی! میں تو بس...... خیر چھوڑیں جیسا آپ کو مناسب لگے۔'' سب شام کو ہونے والے فنکشن کی تیاریوں میں مصروف تھے عنادل کو بھی دو گھڑی شجاع سے اکیلے بات کرنے کا موقع مل گیا۔

''شجاع! آپ موبائل یوز نہیں کرتے کیا؟''

''یار! سارا دن آفس میں اتنا بزی رہتا ہوں کہ موبائل اٹھانے کا ٹائم ہی نہیں ملتا۔ آف ہوتے ہی اپارٹمنٹ پہنچ کر فریش ہوکر کھانا کھاتے ہی لمبی تان کر سونے کو جی چاہتا ہے بس۔

''بہت تھکا دینے والی روٹین ہے یہاں۔ موبائل کی طرف دھیان ہی نہیں جاتا۔ گھر والوں سے ہمیشہ لینڈ لائن پر ہی بات ہو جاتی ہے۔'' اس کے لہجے کی تھکاوٹ کو اس نے دل سے محسوس کیا تھا۔

''کیا ضرورت ہے خود کو اتنا تھکانے کی؟''

''میں اپنے فرائض سے نظریں نہیں چرا سکتا دل!''

''اور میں...... میں کبھی یاد نہیں آئی آپ کو؟''

''تم......!'' اس نے گہری سانس اپنے اندر اتاری تھی۔ ''تمہیں تو اپنے دل میں لیے پھرتا ہوں۔'' بنجر ہوتی زمین پر جیسے چند زور کے چھینٹے پڑے تھے۔ سوندھی مہک چہار اطراف بکھر گئی۔

☆☆☆

فنکشن اتنے اعلیٰ پیمانے پر ہوگا اس کے گمان میں بھی نہیں تھا۔



سارا انتظام لان میں ہی کیا گیا تھا۔ اسٹیج، موسیقی نغمے، میوزک، خاطر تواضع کے لیے انواع و اقسام کے لوازمات اس نے سرخ جارجٹ کا کڑھائی والا سوٹ پہنا، کلائیوں میں ہم رنگ کانچ کی چوڑیاں کٹاؤ دار ہونٹوں پر سرخ لپ اسٹک نے اس کے حسن کو دو آتشہ کردیا۔ وہ فنکشن میں موجود تمام لوگوں کی نظروں کے حصار میں آئی تھی۔ لیکن جس ستائش بھری نظر کی اسے چاہ تھی۔ وہ کہیں نہیں تھی۔ اس نے گہری سانس اپنے اندر اتارتے گویا خود پر قابو پانے کی سعی کی تھی۔ شجاع نے کہا میری لاڈلی بہن کی منگنی کا فنکشن ہے۔ سب کچھ دھوم دھام سے ہونا چاہیے۔ کہیں کوئی کمی نہ رہے۔'' ناہید بیگم با آواز بلند نجانے کس سے کہہ رہی تھیں۔

''حیرت ہے شجاع بھائی نے ایسے نیک خیالات کا اظہار اپنی شادی کے موقع پر کیوں نہیں کیا؟'' فریحہ کی زبان پھسلی۔ سائرہ نے گھور کر اسے دیکھا مبادا عنادل کی دل آزاری ہو۔ لیکن وہ ان کی طرف متوجہ نہیں تھی۔

''آپ لوگ اتنی دور کیوں کھڑی ہیں؟ اسٹیج پر چلیے نا فوٹو شوٹ کرواتے ہیں۔'' دونوں چٹکیوں میں کامدار میکسی تھوڑا سا اوپر اٹھائے عائلہ نے آداب میزبانی نبھائے۔

''جی جی آرہے ہیں۔'' منیزہ بیگم بولیں۔ وہ ماتھے پر گرے بال جھٹکتی آگے بڑھ گئی۔

''توبہ ہے لوگ کیسے اتنا بن بن کر بولتے ہیں؟'' فریحہ کو اس کے مصنوعی انداز پر ہنسی آگئی۔

تب ہی اسٹیج پر مبارک سلامت کا شور بلند ہوا۔ رسم منگنی ادا کی جا چکی تھی۔ اب ایک دوسرے کا منہ میٹھا کروایا جا رہا تھا۔

''ویسے حد ہے امی! منگنی کا فنکشن تھا کیا ضرورت تھی اتنا خرچا کرنے کی؟ سب کچھ سادگی سے بھی تو ہوسکتا تھا۔'' فنکشن کے اختتام پر سب گھر والے لاؤنج میں آگئے۔ عنادل چائے کی ٹرے لیے اندر آئی۔ رضا بے حد بشاشت سے بھرپور تھا۔

''وہ کیوں بھئی؟ کاشفہ کی منگنی روز روز ہونی ہے؟'' کاشفہ نے قدرے ناگواری سے کہا۔

''شجاع بھائی دو چار پیسے کیا کمانے لگے ہیں کہ بھیجتے۔ پیسے کی بھی قدر نہیں ہے تم لوگوں کو۔ ان فضول کے شوق کے چکر میں ان کے... ہو گئے۔''

کاشفہ کے ساتھ ساتھ ناہید بیگم کو بھی حو صلہ کے سامنے رضا کی یہ تقریر ایک آنکھ نہ بھائی۔

''تمہاری جیب سے کون سا ایک روپیہ گیا ہے جو تم یوں تڑپ رہے ہو۔ یہ شجاع بھائی ہی ہیں جنہیں ہماری خوشی کا اتنا خیال رہتا ہے۔ ورنہ تم سے تو ہمیں ایک دھیلے کی بھی امید نہیں۔''

''میں شجاع بھائی کی طرح بے وقوف نہیں ہوں نا؟'' عنادل پر ایک گہری نگاہ ڈالتا وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

☆☆☆

دل اسی وقت سنبھل جائے گا
دل کا حال وہ پوچھے تو سہی
اس کے قدموں میں بچھا دوں آنکھیں
میری بستی سے وہ گزرے تو سہی!

مسلسل کئی دنوں سے اس اجنبی نمبر سے اسے ایسے میسجز مل رہے تھے۔ وہ پڑھ کر ڈیلیٹ کردیتی۔ اس کے ذوق کو سراہتی۔ جس کے بھیجے اشعار اسے اپنے حسب حال ہی لگتے۔

کاشفہ اور رضا کی تلخ بحث نے اس کے دماغ پر جیسے ہتھوڑے سے ضربیں لگائی تھیں۔

''میں اپنے فرائض سے نظریں نہیں چرا سکتا دل!'' شجاع کو تھکان بھرا لہجہ اسے بے چین کر گیا تھا۔

''کاش شجاع! میرے اختیار میں ہوتا تو آپ کا بوجھ بانٹ کر آپ کی ساری تھکان اتار دیتی۔'' نیند کی آغوش میں جانے سے پہلے اس نے سوچا۔

☆☆☆

آنکھ کھلتے ہی میرے ہاتھ سے چھن جاتا ہے
حالت نیند میں ایک خواب سے مانگا ہوا تو!

گھر میں کاشفہ کی شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ شجاع کو گئے سال گزر چکا تھا۔ اسے امید تھی کاشفہ کی شادی پر وہ آجائے۔ یہی سوچ کر وہ گھر والوں کا سرد رویہ نظر انداز کیے زبردستی ان کے ساتھ تیاریوں لگی رہی۔

کاشفہ اپنے جہیز کے معاملے میں کوئی سمجھوتا کرنے پر رضا مند نہیں تھی۔ ایک سے بڑھ کر ایک قیمتی چیز خریدی۔ فرنیچر، کراکری، گولڈ کی جیولری، قیمتی ملبوسات......

یہ شجاع کی حد درجہ سعادت مندی ہی تھی اسے جتنا پیسہ کہا گیا وہ بنا کوئی سوال جواب کیے بھیجتا رہا۔ لیکن جب دولہا کو سلامی میں گاڑی دینے کی بات ہوئی تو رضا چپ نہ رہا۔

"لالچی، ٹٹ پونجیے لوگ۔ اپنی ایک موٹر سائیکل تک خریدنے کی اوقات نہیں اور لگے ہیں گاڑی کی فرمائش کرنے......"

"انہوں نے کچھ نہیں مانگا۔ میں نے خود شجاع بھائی سے فرمائش کی ہے۔ آج کل تو ٹکے ٹکے کے لوگ اپنی بیٹیوں کو موٹر بائیک دے رہے ہیں میں نے گاڑی کی فرمائش کی تو کون سا گناہ کر دیا۔" اونچا بولنے سے اس کی گردن کی رگیں تک ابھر آئی تھیں۔

"ایک ہی بار تو بیٹیاں لے کر جاتی ہیں ماں باپ کے گھر سے۔"

"وہ اور بیٹیاں ہوتی ہوں گی۔" رضا کے طنز پر ناعمہ آپا نے بے ساختہ پہلو بدلا تھا۔

ان کی اور بچیوں کی ساری تیاری بھی تو ناہید بیگم ہی کر رہی تھیں۔

شجاع کی کال آئی تو کاشفہ نے رو رو کر اپنا برا حال کر لیا۔

"اب کیا اتنا بھی حق نہیں ہے میرا اپنے بھائی پر؟"

"میں نے کب انکار کیا ہے گڑیا؟ کہا تو ہے شادی تک بندوبست ہو جائے گا۔" کاشفہ فاتحانہ سا مسکرا اٹھی تھی۔

☆☆☆

شادی کی تاریخ طے ہو جانے پر کاشفہ کے سسرال سے آئی مٹھائی کے نام پر لڈو کی "پھولی ہوئی ٹوکری" دیکھ کر اصغر صاحب کی شوگر ڈاؤن ہونے لگی۔ ریپر ہٹا کر اندر جھانکا۔ گنتی کے چند لڈو ادھر ادھر لڑھک رہے تھے۔ وہ سخت بدمزہ ہوئے۔

شادی میں گنتی کے دو چار دن رہ گئے۔ ناعمہ آپا نے "تیاریوں" میں ہاتھ بٹانے کی غرض سے ایک ماہ قبل ہی ادھر ڈیرہ جما لیا تھا۔ مشتاق بھائی بھی خیر خبر لینے کی غرض سے عین کھانے کے ٹائم پر پہنچ جاتے۔ انتہا کے چرب زبان واقع ہوئے تھے۔

"لگتا ہے شجاع شادی کر کے بھول گیا ہے۔" عنادل صغریٰ کو کھانا لگانے کا کہہ کر لاؤنج میں آئی تو اسے دیکھ کر انہوں نے با آواز بلند خیال آرائی کی۔

"ایسی کوئی بات نہیں۔ بہت خیال رکھتا ہے شجاع اپنی بیوی کا۔ اس کی کوئی فرمائش نہیں ٹالتا۔" عنادل ناعمہ آپا کو دیکھ کر رہ گئی۔ ٹالنے کی نوبت تو تب آتی جب وہ اس سے کوئی فرمائش کرتی۔

"ایسی خاموش طبع بیوی جان بھی مانگے تو کون کافر انکار کرے گا؟"

ناعمہ کی مسلسل چلتی زبان پر انہوں نے جل کر کہا۔ عنادل کو اب ان کے الفاظ و انداز پر حیرت نہیں ہوتی تھی۔ وہ جس ماحول سے آئی تھی وہاں رشتوں کے تقدس کا خیال رکھا جاتا تھا۔ جبکہ یہاں جس کا دل چاہتا کسی کے سامنے کچھ بھی بول دیتا۔

صغریٰ نے کھانا لگنے کی اطلاع دی تو سب اٹھ کر ڈائننگ روم کی طرف چل پڑے۔

تب ہی موبائل کی رنگ بج اٹھی۔

"کیا کر رہی تھیں؟"

"انتظار۔" بے ساختہ اس کے لبوں سے نکلا تھا۔ "پردیسی اپنے پیچھے انتظار کے علاوہ بھی کچھ چھوڑ جاتے ہیں کیا؟"

جذبات سے بوجھل ہوتی آواز میں نمی سے گھلی تھی۔

"اداس ہو؟" اس کا سوال نظر انداز کر کے اس نے پوچھا۔ "شجاع! آپ شادی پر تو آرہے ہیں نا؟"

"مشکل ہے یار!"

"کیوں؟" اس کی آواز بلند ہو گئی تھی۔ "آپ نے خود ہی تو کہا تھا سال بعد کمپنی کی طرف سے دو ماہ کی چھٹی ملتی ہے۔ اب تو سال سے بھی اوپر ہو گیا ہے۔"

"چھٹی کا مسئلہ نہیں ہے دل! کاشفہ کی شادی کے اخراجات کے لیے کافی سارا ایڈوانس لیا ہے۔ وہ بھی تو واپس کرنا ہے۔" وہ نرمی سے کہہ رہا تھا۔ اس کے اندر جیسے کچھ جل کر بجھا تھا۔

"تو آپ نہیں آرہے؟"

"یار! میری مجبوری سمجھو...... پلیز......"

شجاع نے رونے سے منع کیا تھا ورنہ اس وقت وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیتی۔ بنا کوئی جواب دیے اس نے خاموشی سے فون آف کر دیا۔

☆☆☆

وہ تنگ دل نہیں تھی لیکن کاشفہ کی شادی پر جس بے دردی سے پیسہ لٹایا گیا وہ دل ہی دل میں خوب کڑھی۔ اگر یہ سب کچھ اعتدال میں رہ کر کیا جاتا تو شاید شجاع کو قرض نہ لینا پڑتا اور وہ آج ان سب کے ساتھ موجود ہوتا۔

جب خود غرضی حد سے بڑھ جائے تو سب سے پہلے احساس کو نگلتی ہے اور جب احساس ہی باقی نہ رہے تو کہنا، سننا، رونا، کڑھنا سب بے کار ہے۔

شجاع کے آنے کا سوچ کر اس نے دل سے شاپنگ کی تھی لیکن اب اس کے بغیر اس کا سجنے، سنورنے کو جی ہی نہیں چاہا۔

"عنادل! گھر کی شادی ہے بیٹا! اچھے سے تیار کیوں نہیں ہوئیں؟"

بارات والے دن اس نے ہلکے زرد رنگ کا چوڑی دار پاجامہ، لانگ شرٹ کے اوپر زرد شیفون کا دوپٹا لیا ہوا تھا۔ کھلے بال، کانوں میں آویزے، تیاری بھرپور، نہ کی اداسی نے اپنا رنگ اوڑھا کر باقی سارے رنگ پھیکے کر دیے۔

فریحہ کا اپنا آخری مہینہ چل رہا تھا۔ اس کی طبیعت کے پیش نظر سائرہ چچی بھی گھر پر ہی رک گئی تھیں۔

"کیا اچھی نہیں لگ رہی؟" وہ خواہ مخواہ مسکرا دی۔ گہرے کاجل نے آنکھوں کے رتجگے کا راز رکھ لیا تھا۔

"لاکھوں میں ایک لگ رہی ہو۔ لیکن بیٹا خیر سے شادی شدہ ہو۔ لگنی بھی تو چاہیے نا؟ ورنہ لوگ پر کا کوا بنا کر اڑانے میں ذرا دیر نہیں لگاتے۔"

(ہر وقت دل پر زور زبردستی بھی تو نہیں کی جا سکتی ناماں)

"ولیمے پر ساری کسر نکالوں گی۔" ماں کو تسلی دے کر وہ اسٹیج کی طرف بڑھ گئی۔

دودھ پلائی کی رسم کے لیے ناعمہ اور عائلہ بیس ہزار سے ایک روپیہ کم لینے پر تیار نہیں تھیں۔

دولہا کی ماں بہنوں کو غش آنے لگے۔ "بیس ہزار؟"

نوک جھونک تو تکرار میں بدلنے کو تھی کہ ناہید بیگم کی نند صفورا آپا نے مداخلت کر کے دس ہزار پر کمپ مکا کرایا۔

ناعمہ آپا اور عائلہ پانچ پانچ ہزار کے نوٹ پکڑے آف موڈ کے ساتھ اسٹیج سے نیچے اتری تھیں۔

کاشفہ دھوم دھام سے رخصت ہو گئی۔ مہمانوں کے جانے کے بعد گھر واپس آتے ہی ناہید بیگم نے عنادل کو خوب آڑے ہاتھوں لیا۔

"نہ میں پوچھتی ہوں ایسا کون سے ظلم کے پہاڑ ہم نے تم پر توڑے ہیں جو تم میری بیٹی کی خوشی کے موقع پر بدروح بن کر بھٹکتی پھر رہی تھیں؟ اتنے مہنگے جوڑے دلائے۔ وہ پسند نہیں تھے تو بری کے کپڑوں میں سے کوئی کام والا سوٹ پہن لیتیں۔ پر نہ جی بہو بیگم نے تو ساری برادری کے سامنے ہماری ناک کٹوانے کی قسم کھا رکھی تھی۔" عنادل سر جھکائے ان کی گھن گرج سنتی رہی۔

"گز بھر لمبی زبانیں ہیں خاندان والوں کی میں وضاحتیں دے دے کر تھک گئی۔"

"اوہو امی! لگتا ہے بھابھی کو اپنے "حسن" پر اعتماد بہت ہے۔ تب ہی انہوں نے باقی لوازمات پورے کرنے غیر ضروری سمجھے۔"

تازہ تازہ اسٹیپ کٹنگ بال لہراتی عائلہ نے تمسخرانہ لہجے میں کہا۔ ناعمہ آپا بھی کچھ ایسا ہی کہہ رہی تھیں۔ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں باہم پھنسائے پریشان عنادل سمجھ نہیں پائی کہ کاشفہ کی شادی پر شجاع کے اس قدر کھلا خرچ کرنے اور اس کی بیوی کی اعلا ظرفی کو خاندان بھر میں بہت قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا تھا۔

غصہ اتارنا تو بنتا تھا سو خوب اتارا۔ اور اٹھ کر چل دیں۔

کوئی تو جسموں کے پار جھانکے
کوئی تو روحوں کے تل دیکھے!

نجانے کون تھا جس کا بھیجا ہر شعر اسے اپنے جذبات کی ترجمانی کرتا محسوس ہوتا تھا۔

☆☆☆

ماں کا سمجھانا، ساس کا غصہ کرنا اسے خائف کر گیا تھا۔ اس لیے ولیمے پر وہ خوب تیار ہوئی۔ سرخ اناری شلوار قمیص پر ہم رنگ بڑا سا دوپٹا کاندھے کے ایک طرف ڈالے۔ ہلکی نمی لیے بالوں کو سلجھا کر پشت پر ڈالا اور عائلہ کے کمرے میں چلی آئی۔ وہ پہلی بار اس کے کمرے میں آئی تھی اور پہلی نظر میں وہ کمرہ اسے بیوٹی پارلر ہی لگا۔ آئینے میں ابھرتے اس کے عکس کو دیکھ کر عائلہ نے گردن موڑ کر عقب میں دیکھا تھا۔ عنادل اندر آ گئی۔

"میرا بھی میک اپ کر دو عائلہ!"

اور عائلہ نے سوچا جو بنا میک اپ کیے غضب ڈھا رہی ہے وہ تیار ہو کر کیا کیا نہ قیامت ڈھائے گی؟

"اوہ بھابھی! رئیلی سوری...... میں نے تیار ہونے میں ویسے ہی اتنی دیر لگا دی ہے امی چار بار بلا چکی ہیں۔ اب بھی باہر نہ نکلی تو میری شامت پکی۔" جلدی جلدی سینڈل کے اسٹریپ بند کرتی وہ بولی تھی۔

"آپ ایسا کریں یہ سامنے میک اپ کا سارا سامان رکھا ہے۔ خود تیار ہو جائیں اور پلیز ذرا دھیان سے یوز کیجیے گا۔ میں اپنی پرسنل کلیکشن کسی کے ساتھ شیئر نہیں کرتی پہلی بار آپ کو آفر کر رہی ہوں۔"

اسٹیپ کٹنگ بالوں کو جھٹکے دے کر آفر شاکر لگاتی یہ جا وہ جا۔ عنادل نے ڈریسنگ ٹیبل پر بکھرے کاسمیٹکس کو دیکھا۔ اسے کچھ سمجھ ہی نہیں آیا۔ اپنے سوٹ کے ساتھ میچنگ سرخ لپ اسٹک لگا کر آئینے میں خود کو دیکھا تو لگا مزید کسی سنگھار کی ضرورت نہیں رہی۔ بنا کسی اور چیز کو ہاتھ لگائے وہ جلدی سے پورچ کی طرف بڑھی۔ ناہید بیگم اور عائلہ گاڑی میں بیٹھ گئی تھیں۔ اصغر صاحب کو رضا پہلے ہی ولیمہ ہال چھوڑ آیا تھا۔

"میں فیصلہ نہیں کر پا رہا آپ کل اچھی لگ رہی تھیں یا آج؟" ڈرائیونگ سیٹ سنبھالے رضا نے ستائشی انداز میں کہا۔ ناہید بیگم نے کڑے تیوروں سے عنادل کو گھورا تو وہ جلدی سے عائلہ کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ جو اسے دیکھ کر ویسے ہی جل بھن گئی۔ اسے اپنی مسلسل تین گھنٹوں میں کی جانے والی ساری تیاری اکارت جاتی محسوس ہوئی۔ عنادل نے ایک دو بار اس سے کوئی بات کرنی چاہی تو اس نے روکھا سا جواب دیا۔ عنادل چپ ہو کر باہر بھاگتے دوڑتے مناظر دیکھنے لگی۔

اسٹیج پر آف وائٹ کرتا شلوار پر واسکٹ پہنے عدیل بہت ہینڈسم لگ رہا تھا۔ اس کے پہلو میں سجی سنوری کاشفہ خوب چہک رہی تھی۔

عنادل کو اپنے میکے والوں کا انتظار تھا۔ لیکن ادھر سے صرف مسعود صاحب ہی آئے تھے۔ فریحہ کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ عاقب اور سائرہ چچی اس کے ساتھ ہسپتال گئے تھے۔ منیزہ گھر پر ہی تھیں۔ عنادل کے استفسار پر انہوں نے تفصیل سے بتایا۔ اور اصغر صاحب کے ساتھ ٹیبل پر بیٹھ گئے۔ کھانا کھایا اور جلدی سے جانے کی اجازت چاہی۔



"اتنی جلدی؟ کھانا تو کھالیں سمدھی جی!" دونوں آستینیں اوپر چڑھائے بوٹیوں سے نبرد آزما اصغر صاحب بولے۔

"بہت شکریہ! میں کھا چکا ہوں۔"

"واہ بھئی ہم نے ابھی ٹھیک طرح سے شروع بھی نہیں کیا اور آپ نے ختم بھی کر لیا۔" انہوں نے ایک خوشگوار سا قہقہہ لگایا۔

"جی جی میں اندازہ کر سکتا ہوں۔" جواباً مسعود صاحب نے بھی شگفتگی سے کہا اور دونوں ہمل کر ہنس پڑے۔ عنادل کے سر پر ہاتھ رکھتے وہ جانے کے لیے تیار کھڑے تھے۔ عنادل کا خود مارے بے چینی کے برا حال تھا۔ ولیمے سے واپس آتے ہی منیزہ بیگم کی کال آ گئی۔ "مبارک ہو عنادل! عاقب کا بیٹا ہوا ہے۔" بھتیجے کا سن کر اس کا روم روم خوشی سے بھر گیا۔ جلدی سے کپڑے بدلے، بیگ تیار کیا، ناہید بیگم سے چند دن رہنے کی اجازت لے کر فوراً گاڑی کی جانب بھاگی۔ جہاں ڈرائیور پہلے ہی اس کا انتظار کر رہا تھا۔

☆☆☆

گل گوتھے سے بھتیجے کو گود میں لے کر اس نے خوب پیار کیا تھا۔ سب بہت خوش تھے۔ پورے محلے اور رشتہ داروں میں مٹھائی بانٹی گئی۔ منیزہ بیگم بہت رکھ رکھاؤ والی خاتون تھیں۔ عاقب کے ہاتھ عنادل کے سسرال، ناعمہ اور کاشفہ کے گھر بطور خاص مٹھائی بھجوائی۔ مبارک باد کے لیے آنے والوں کی عنادل مٹھائی، کیک، کولڈ ڈرنک سے تواضع کرتی رہی۔

"شکر ہے عنادل یہاں رکنے کے لیے آ گئی۔ ورنہ ہم سے کہاں ہو پاتا یہ سب۔" سائرہ نے ننھا علی احمد فریحہ کی گود میں دیتے ہوئے کہا۔

"اور اب میں اسے اپنا "چھلہ" نہا کر ہی واپس جانے دوں گی۔" فریحہ محبت بھری دھونس سے بولی۔ عنادل ہنس دی۔

"میڈم! چھلہ آپ نے نہانا ہے میں نے نہیں۔" منٹوں میں اس نے بچے کا سارا پھیلاوا سمیٹ دیا تھا۔ ماں اور بچی کو آرام دینے کی غرض سے کچن کا بھی اکثر کام سنبھال لیا۔ مسعود صاحب کو ان کی اسٹڈی میں چائے کا کپ دے کر باقی سب کی فریحہ کے کمرے میں لے آئی۔

"خوش رہو میری بہن! سچ میں اس وقت اسٹرونگ سی چائے کی شدید طلب ہو رہی تھی۔" عاقب نے سب سے پہلے اٹھایا تھا۔ خوش گپیوں کے دوران چائے ختم کر کے سب اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ وہ اٹھ کر باہر آ گئی۔ اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ موتیا کے پھولوں سے بوجھل ہواؤں میں ہلکی سی خنکی رچی ہوئی تھی۔

املتاس کے پتوں سے جھانکتے ادھورے چاند کو دیکھے گئی۔ شادی کے بعد وہ پہلی بار میکے رہنے آئی تھی۔ وہ شجاع کی اجازت لے کر اس سے پوچھ کر آنا چاہتی تھی۔

گو کہ ان گزرے ڈیڑھ سالوں میں شجاع نے اسے ان تمام "تکلفات" سے آزاد ہی رکھا تھا۔ "جہاں دل چاہے چلی جاؤ جو مرضی کرو۔" جیسے جملے سننے میں کتنے ہی اچھے کیوں نہ لگیں لیکن ان میں چھپی اجنبیت اور بے گانگی رشتوں کا حسن گہنا دیتی ہے۔ جبکہ اپنا حق جتاتے ہوئے پیار بھری دھونس رشتوں کو مضبوط بناتی ہے۔ شجاع اور اس کے درمیان ایسا کچھ نہیں تھا۔ بن ہی نہیں سکا۔

لیکن وہ اس کی محبت کے حصار میں مقید اس کی ماننا چاہتی تھی۔ اسی سے اپنی منوانا چاہتی تھی۔ "آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل" والی صورت حال اس کے لیے تکلیف دہ تھی۔ ہوا کی خنکی بڑھ گئی تو وہ اپنے کمرے میں آ گئی۔

کیا شادی کے موقع پر اپنی سجی سنوری بیوی کی ایک جھلک دیکھنے کی خواہش نے اس کے اندر انگڑائی نہیں لی ہو گی؟ آئینے میں ابھرتے اپنے عکس کو دیکھ کر اس نے سوچا۔

"جہاں چاہ" ہوتی ہے وہ وہاں انسان کی راہیں نکال لیتا ہے۔ پھر سارے فاصلے، ساری مجبوریاں

دھڑکی کی دھڑکن بن جاتی ہیں۔" وہ جو سوچنا نہیں چاہتی تھی وہی سوچتی چلی جا رہی تھی۔ "یا وہ صرف وقتی کشش تھی؟ قربت کے چند لمحوں کا ثمر؟ قربتیں، فرقت میں ڈھلیں تو وہ سب جذبات سے بوجھل ہوئی ان آنکھوں کو بھول گیا؟ اس کی پیشانی پر رکتے انگارے چھوڑ کر کیسے اپنے لبوں پر مہر لگا لی؟ کیسے؟ آخر کیسے؟؟" اس کے اندر کی عورت سسک رہی تھی۔ ڈیڑھ سال کا عرصہ اتنا زیادہ نہیں تھا لیکن تعلق میں ہوتے ہوئے بھی "لاتعلق" رہنا بہت اذیت دیتا ہے۔

اگر وہ دور ہو کر بھی اسے اپنے "ساتھ" کا احساس دلاتا تو شاید وہ اتنی رنجور نہ ہوتی۔ گھر والوں کا رویہ اتنا بھی دکھ نہ دیتا۔ دنیا والوں کی نارمل باتوں کو وہ نارمل ہی لیتی۔

بالو قدسیہ کہتی ہیں "حال پوچھ لینے سے حال ٹھیک نہیں ہو جاتا لیکن ایک تسلی سی ہو جاتی ہے کہ اس دنیا کی بھیڑ میں کوئی اپنا بھی ہے۔"

نیم اندھیرے کمرے میں بیٹھی وہ موبائل پر چمکتے الفاظ کو گھورتی رہی۔

☆☆☆

"شجاع کب تک آ رہا ہے بیٹا؟" صبح ناشتا کرتے وقت مسعود صاحب کے پوچھنے پر وہ لمحہ بھر کے لیے چپ سی ہو گئی۔ پھر قدرے توقف سے بولی۔

"کچھ کہہ نہیں سکتی ابو؟"

"یہ کیا بات ہوئی بھلا؟ نئی نئی شادی تھی جب وہ چلا گیا تھا۔ اب تک تو اسے ایک آدھ چکر لگا لینا چاہیے تھا۔" سائرہ نے گرم گرم پراٹھا اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک کہہ رہی ہیں تمہاری چچی! اگر وہ خود جلدی جلدی چکر نہیں لگا سکتا تو اسے کہو تمہیں اپنے پاس بلا لے۔" منیزہ بیگم نے فلاسک سے چائے نکالتے ہوئے کہا۔

"ایسے بھی تو زندگی نہیں گزاری جا سکتی نا؟ ناہید بیگم کو خود اس بات کا خیال رکھنا چاہیے۔ خود بھی تو بیٹیوں والی ہیں۔"

وہ غلط نہیں کہہ رہی تھیں۔ اسے واقعی شجاع سے اس سلسلے میں بات کرنی چاہیے۔ خاموشی سے چائے کی چسکیاں لیتے اس نے سوچا۔

یہ گھر جہاں اس نے زندگی کا بڑا حصہ گزارا تھا اب اسے اجنبی سا لگنے لگا تھا۔ بدلا کچھ بھی نہیں تھا شاید اس کے دیکھنے اور سوچنے کا انداز بدل گیا تھا۔

ثاقب کی فریحہ سے نسبت ڈھکی چھپی نہیں تھی لیکن باپ بننے کے بعد تو وہ اس کے گرد پروانے کی طرح چکر کاٹنے لگا تھا۔ وہ علی احمد کو فیڈ کروانے کے لیے گود میں لے کر بیٹھتی تو جلدی سے اس کی کمر کے پیچھے تکیہ لا کر رکھ دیتا۔

کھانے پینے پر غفلت برتنے پر اسے اچھا خاصا ناراض کے رکھ دیتا وہ خفا ہونے لگتی تو اپنے ہاتھوں سے نوالے بنا کر اس کے منہ میں دیتا۔

"میں حاسد تو کبھی بھی نہیں رہی تو پھر یہ سب کچھ دیکھ کر میرے اندر اتنا خالی پن سا کیوں اترنے لگا ہے؟ مجھے اس منظر سے دور ہو جانا چاہیے۔ کہیں میری آنکھوں میں چھپی حسرتیں بے تاب ہو کر چھلک نہ پڑیں۔ کہیں میری تشنہ نگاہیں اس منظر کی خوش نمائی کو گہنا نہ دیں۔

اگلے دن سب کے لاکھ اصرار کے باوجود وہ اپنے گھر واپس آ گئی۔

"ارے واہ امی! بھابھی تو آ گئیں واپس۔"

بیس دنوں بعد گھر واپسی پر عائلہ کا کھنکتا ہوا جملہ اس کے کانوں میں پہنچا تھا۔

سب نے گردنیں گھما کر اس کی جانب دیکھا۔ کچھ اسپیشل سا آرڈر کرنے کے بعد اب چائے سے لطف اندوز ہو جا رہا تھا۔

"ارے لو! ہم نے تو آج تمہاری امی کی طرف منے کی مبارک باد کے لیے آنا تھا۔"

ناعمہ آپا نے کیک کا بڑا سا ٹکڑا منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔ کاشفہ نے فوراً ہاں میں ہاں ملائی۔

"میں بھی تو یہی سوچ کر آج گھر سے تیار ہو کر



آئی تھی۔"

"اس اوکے کاشفہ! میں اپنے گھر ہی واپس آئی ہوں۔ آپ لوگوں نے جن کو مبارک دینے جانا ہے وہ "اپنے" گھر پر ہی ہیں۔"

پہلی بار اس نے پلٹ کر ایسا جواب دیا تھا سب کا چونکنا لازمی تھا۔ عدیل نے سیٹی کے سے انداز میں ہونٹ سکیڑے۔ وہ رکی نہیں اپنے کمرے میں چلی گئی۔

"کمال ہے سالے صاحب پر جو ایسی بیوی کو چھوڑ کر پردیس میں گھاس کھود رہے ہیں۔" کاشفہ نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں ایک جلتی ہوئی نگاہ لاؤنج سے نکلتی عنادل کی پشت پر ڈالی تھی۔

☆☆☆

بعض اوقات ہمیں کسی سے اتنی شکایت ہوتی ہے کہ شکایت کرنے کو بھی جی نہیں چاہتا۔ شجاع کی کال آئی تو اسے کہنا چاہتی تھی کہ اتنے دن وہ میکے میں رہی وہ اسے خیریت کی ایک کال تک نہ کر سکا۔ زیادہ کچھ نہیں تو امی کو مبارک باد دے کر ہی اس کا مان رکھ لیتا۔ لیکن اس نے کہا بھی تو صرف اتنا۔

"شجاع! آپ مجھے اپنے پاس کیوں نہیں بلوا لیتے؟"

"تم یہاں آنا چاہ رہی ہو؟ میرے پاس؟"

نجانے وہ حیران ہوا تھا یا خوش۔

"آپ بھلے میرے بغیر وہاں خوش ہوں لیکن میں یہاں آپ کے بغیر نہیں رہنا چاہتی۔ آپ کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔"

دل کی خواہشات کو زبان پر لاتے ہوئے بیوی کو اپنے شوہر کے درمیان "انا" کو نہیں لانا چاہیے۔ اس نے اپنے اندر کی خوددار عورت کو ایک نرم سی تھپکی دے کر سلایا تھا۔ "کیا یہ ناممکن ہے شجاع؟"

"نہیں...... نہیں بالکل نہیں...... کمپنی کی طرف سے تو اپارٹمنٹ ملا ہوا ہے۔ میں آسانی سے اپنی فیملی کو رکھ سکتا ہوں لیکن...... خیر چھوڑو۔ میں بہت جلد اس سلسلے میں کوشش کرتا ہوں۔"

عنادل نے ایک گہری اطمینان بھری سانس اپنے اندر اتاری تھی۔

وہ ہلکی پھلکی سی ہو کر باہر نکل آئی۔ سب اس وقت منیزہ بیگم کی طرف گئے تھے۔ رات گئے ان کی واپسی ہوئی تھی۔

اس کی خوشبو سے معطر ہے میری تنہائی
یاد اس کی مجھے تنہا نہیں ہونے دیتی!

میرون شال اپنے کندھوں کے گرد لپیٹ کر وہ مسرور سی یونہی چہل قدمی کرتی رہی۔ اپنی بالکنی میں کھڑے رضا کی نظروں نے دیر تک اسے اپنے حصار میں لیے رکھا تھا۔

☆☆☆

شجاع کے ہمراہ دبئی جانے کا کھلی آنکھوں سے دیکھا جانے والا یہ خواب اتنا خوشنما تھا کہ وہ بار بار دیکھے گئی۔ رات بھر اس کی پلکیں جڑ نہیں سکی تھیں۔ اس کے پاس سوچنے کے لیے خوش ہونے کے لیے آج کی رات بہت کچھ تھا۔

صبح وہ فریش سی شاور لے کر باہر آ گئی۔ ناعمہ آپا کی ساس کی اچانک طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ انہیں ناشتے کے بغیر ہی جانا پڑ گیا۔ البتہ کاشفہ اور عدیل ہنوز موجود تھے۔ اور اس وقت تگڑے سے ناشتے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

"کیا ہی وضع دار، اعلیٰ اخلاق کے لوگ ہیں بہو کے گھر والے۔ خاطر مدارت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اتنے لوازمات اوپر سے بصد اصرار پیش کرنے کا انداز...... واہ بھئی میں تو گرویدہ ہو گیا ان کا" اصغر صاحب خوش دلی سے کہہ رہے تھے۔ ہلکے گلابی رنگ کے لباس میں نکھری نکھری عنادل مسکرا دی۔

کاشفہ نے زور سے جوس کا گلاس میز پر پٹخا تھا۔

"کیا ہوا؟ ناشتا تو کر لو ڈھنگ سے؟" ناہید بیگم کو بیٹی کے اچانک بگڑتے موڈ کی کوئی خاطر خواہ وجہ دکھائی نہیں دی تھی۔

"بس امی! کر لیا۔" ایک کٹیلی سے نگاہ عنادل پر ڈال کر وہ دانت پیستے گویا ہوئی۔ شادی کے شروع

کے دنوں میں تو شوہر کا بے حد پیار کو دیکھنا بھی گراں گزرتا ہے۔ اور یہاں تو ایک جیتی جاگتی قیامت اس کے شوہر کی نظریں بھٹکانے کا سبب بن رہی تھی۔
خود کو غیر آرام دہ محسوس کرتی عنادل بمشکل آدھا ادھورا ناشتہ کیے وہاں سے اٹھ گئی تھی۔ عدیل نے فوراً ناشتے سے ہاتھ کھینچ لیا اور جانے کی اجازت طلب کی۔ اسے "اب" آفس سے دیر ہو رہی تھی۔
"میں شام کو خود آجاؤں گی۔ تم لینے مت آنا۔" جاتے جاتے وہ کاشفہ کی بات پر چونکا ضرور لیکن بظاہر کندھے اچکا کر چلا گیا۔ کاشفہ نے بہت ضبط سے سب کے اٹھنے کا انتظار کیا تھا اور آخر میں ناہید بیگم کے سامنے پھٹ پڑی۔
"یہ کیا تماشا ہو رہا ہے امی؟" ناہید بیگم کو کچھ سمجھ میں نہ آیا اور جیسے جیسے سمجھ میں آتا گیا بیٹی کیوں اور کس پر تپ رہی ہے ان کی ناک کے نتھنے پھولنے لگے۔
"آپ نے اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی ہے لیکن میں اندھی نہیں ہوں۔ بلا میں اس مہارانی کو، کیوں میرا اچھا بھلا گھر خراب کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ آخر میں نے اس کا کیا بگاڑا ہے؟"
کاشفہ نے چیخ چلا کر سارا گھر سر پر اٹھا لیا۔ غنیمت تھی کہ اصغر صاحب بھاری بھرکم ناشتے کے بعد اپنے کمرے میں اونگھتے رہے۔ رضا کا آج جاب انٹرویو تھا وہ بغیر ناشتہ کیے ہی صبح جلدی چلا گیا تھا۔
عنادل ناسمجھی سے ماں بیٹی کو غصے سے لال پیلا ہوتے دیکھنے لگی۔
"بیویاں اپنے شوہر کے لیے ہی سجتی سنورتی ہیں۔ جب تمہارا گھر والا ہی یہاں نہیں ہے تو پھر کاہے کا ہار سنگھار؟ ہاں......"
ہلکے نم بالوں کو کیچر میں جکڑ رکھا تھا۔ نیچرل گلابی لپ اسٹک اور آنکھوں میں کاجل کے سوا اور کون سا ہار سنگھار کر رکھا ہے وہ سمجھ نہیں پائی۔
"ہونہہ! پرائے مردوں کو اپنے پیچھے لگانے کے طریقے ہیں یہ سب ورنہ کیا ہم نہیں جانتے پردیس جانے والے مردوں کی بیویاں ان کے پیچھے ہتھیلیوں سے اپنے ہونٹ رگڑ کر لالی مٹا دیتی ہیں۔ چہرے کے سرخی پاؤڈر ہی ختم ہونے میں نہیں آتے"
کاشفہ کا بس نہیں چل رہا تھا اسے کسی دیوار میں چنوا دے۔
"غضب خدا کا ہے کچھ پتا بھی ہے تمہیں جہاں نندوئی کے سامنے بن ٹھن کر آنے کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟"
"جوان بہو کے ہوتے دامادوں کو اپنے گھر گھسانے والوں کے بارے میں بھی شریعت نے کچھ کہا ہوگا۔" اس کے لب خاموش تھے۔ اس کی تربیت پر افسوس کرتی۔
ناہید بیگم اسے نندوئی جیسے نازک رشتے کی نزاکتوں اور اس کی سنگین کوتاہیوں کو گنوانے بیٹھ گئیں۔ ناخن فائل کرتی عائلہ گاہے بگاہے ایک نظر عنادل کے سرخ چہرے پر بھی ڈال لیتی۔
"میں کچھ نہیں جانتی امی! اس سے کہہ دیں اب اگر یہ عدیل کے سامنے آئی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔ وہ تو مرد ہے۔ مرد کی نگاہ بدلتے کون سا دیر لگتی ہے۔ عورت کو خود اپنی اور اپنے شوہر کی عزت کا خیال رکھنا چاہیے۔" عنادل کا دل چاہا زمین پھٹے اور وہ آج اس میں سما ہی جائے۔

☆☆☆

اچھی طرح رونے دھونے، دھمکانے کے بعد کاشفہ نے خانساماں سے دو چار اچھی سی ڈشز بنوا کر پیک کروائیں اور چلی گئی۔
شجاع کی آج معمول سے قدرے جلدی کال آگئی تھی۔ وہ سلام دعا کے بعد ماں کو عنادل کو اپنے پاس بلانے کے بارے میں بتانے لگا۔ اس کا پاسپورٹ، ویزہ وغیرہ......
ناہید بیگم کا دماغ سائیں سائیں کرنے لگا۔ آج کے دن انہیں گویا دو بار کرنٹ کا زوردار جھٹکا لگا تھا۔ پہلے کے تو انہوں نے فیوز نکال دیے تھے۔ لیکن شجاع جو اب کہہ رہا تھا۔ جو کرنے جا رہا تھا۔
انہوں نے لمحے کے ہزارویں حصے میں اپنے سود و زیاں کا حساب لگا لیا



"کیا ہوا امی! آپ چپ کیوں ہو گئیں کچھ کہیں گی نہیں؟"
"کیا کہوں بیٹا! تم نے مجھے بولنے کے قابل چھوڑا ہی کہاں ہے؟" دل گرفتہ لہجے میں بولیں۔
"بیٹیاں تو پرایا دھن ہوتی ہیں۔ نائمہ، کاشفہ اپنے گھر کی ہو گئیں گھر والے اجازت دیں تو گھڑی دو گھڑی ملنے آجاتی ہیں۔ عائلہ بھی ایک دن رخصت ہو کر چلی جائے گی۔ گھر کی اصل رونق تو بہو کے دم سے ہوتی ہے۔ میرے گھر کی رونق بھی میری بہو ہی ہے۔ یہ چلتی پھرتی، ہنستی بولتی ہے تو مجھے تمہارے اپنے آس پاس ہونے کا احساس ملتا ہے۔ ورنہ تمہاری جدائی جھیلنا کون سا آسان ہے میرے لیے۔ تم اگر اس عمر میں اپنے بوڑھے ماں باپ کو نوکروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دینا چاہتے ہو تو میں کیا کر سکتی ہوں۔"
کہنے کے ساتھ ہی وہ پھپک پھپک کر رو دیں شجاع کو ایک دم ڈھیر ساری پشیمانی نے گھیر لیا۔ ایک فرض شناس بیٹا ہونے کے ناتے اس نے یہ سوچ کیسے لیا؟ وہ اتنا خود غرض کیسے ہو سکتا ہے؟ یہی الفاظ وہ عنادل سے دہرا رہا تھا۔ وہ بنا کوئی لفظ بولے چپ چاپ سنتی رہی۔ اسے جلد از جلد پاکستان آنے کی یقین دہانی کروا کے شجاع نے فون بند کر دیا تھا۔ وہ بے جان قدموں سے چلتی اپنے کمرے میں آئینے کے سامنے آکھڑی ہوئی۔ بے دردی سے دونوں ہاتھ کی ہتھیلیوں سے ہونٹ رگڑ ڈالے۔ اگر جانے سے پہلے شجاع نے اسے رونے سے منع نہ کیا ہوتا تو وہ آج آنسوؤں سے سارا کاجل بہا ڈالتی۔ آنکھیں نم ضرور ہوئی تھیں لیکن اس نے نمی اپنے اندر اتار لی۔ شجاع نے اسے رونے سے منع کیا تھا۔ وہ اس کی بات کیوں کر ٹالتی؟ آج بہت کچھ کرچی کرچی ہوا تھا۔ کھڑکی سے جھانکتے چاند نے اسے ٹوٹتا بکھرتا دیکھ کر بادلوں میں منہ چھپا لیا تھا۔
بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے وہ کئی ثانیوں تک خالی الذہنی کی سی کیفیت میں بیٹھی رہی۔ خاموش فضا میں میسج کی بیپ بجی تھی۔

سمجھتا ہی نہیں وہ شخص الفاظ کی گہرائی
میں نے یہ وہ لفظ کہہ دیا جس میں محبت تھی

اس کے ہونٹوں پر زخمی سی مسکراہٹ ابھر کر معدوم ہوئی۔ بلا ارادہ اس کی انگلیاں ٹچ اسکرین پر حرکت کرنے لگیں۔

ایسے ملنا کیا
جیسے ملے ہی نہیں
جتنے سلگے ہیں
اتنے جلے ہی نہیں
گم ہیں راہوں میں
کانٹوں کی چھاؤں میں
ستم گر یہ قربتیں کیا کریں؟
جو تیرا میرا ساتھ ہے
نہ ہونے جیسا ساتھ ہے!

پہلی بار رسپانس ملنے پر دوسری طرف فوراً جوابی میسج ٹائپ کیا جانے لگا۔ اس حبس زدہ تاریک شب تنہائی میں ایک نئی راہ کھل رہی تھی۔
بات جب ایک نقطے سے شروع ہوتی ہے تو الفاظ سے جملوں تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگتی۔

☆☆☆

تو وہ مستقیم حیدر تھا۔
محبت کا ذائقہ اس نے بھی چکھا تھا۔ محبوب کی کج ادائیاں اس نے بھی سہی تھیں۔
فراق کی اذیت میں وہ بھی مبتلا تھا۔ شادی کے بعد خدا نے جسے بیٹی کی رحمت سے نوازا تھا۔ نیلم مستقیم اس کی بوڑھی ماں اور بیوہ آپا کے ساتھ رہنا نہیں چاہتی تھی۔ جبکہ وہ انہیں بے آسرا چھوڑنے پر رضامند نہیں تھا۔ نیلم مستقیم نے اولاد کارڈ کھیلا اور بچی کو لے کر ماں کے گھر چلی گئی۔ وہی الگ رہنے کا مطالبہ۔
وہ دوہری اذیت کا شکار تھا۔ نیلم سے محبت کرتا تھا۔ دو سالہ جنت مستقیم پر جان چھڑکتا تھا لیکن بوڑھی ماں اور بیوہ آپا......
کمال کا آدمی تھا نہ تو شجاع کے ذکر پر چڑتا نہ اس کے گھر والوں کو برا بھلا کہتا۔ وہ صرف عنادل کو

سنتا۔ بہت دھیان سے، بہت اپنائیت سے۔ عنادل کے لیے وہ ایک محور بن گیا تھا۔ ایک روشن دان یا شاید ایک چھوٹی سی روزن۔ بدلے میں اس نے عنادل سے کوئی اخلاق سے گری ہوئی بات نہیں کی۔ بس چھوٹی چھوٹی ان کہی باتیں۔ پسند، ناپسند، ادھوری خواہشات، ٹوٹے خواب انہیں اب ایک دوسرے سے بات کرنے کا انتظار رہنے لگا تھا۔

عدیل اب بھی اکثر آفس جاتے ہوئے کاشفہ کو یہاں چھوڑ جاتا۔ واپسی پر کھانا کھا کر، گھر والوں کے لیے ڈبوں میں بند کر کے لے جاتے۔ عنادل نے اس دن کے بعد اس کے سامنے آنا چھوڑ دیا تھا۔ بلکہ وہ تو ناعمہ کے شوہر کی آواز سن کر بھی اپنے میں بند ہو جاتی۔

عائلہ نے شہر کے مشہور اور مہنگے ترین بیوٹی پارلر میں داخلہ لے لیا تھا۔ وہ بیوٹیشن کا کورس کر رہی تھی۔ اس کی ساری مصروفیات اسی کے گرد گھومتی تھیں۔

"چچ چچ آپ کی بہو کا دبئی جانے کا سارا پروگرام تو چوپٹ ہو گیا ہوگا۔"

ناعمہ مصنوعی افسوس سے سر ہلاتی کہہ رہی تھیں۔ انداز میں تمسخر تھا۔

"ویسے دیکھیں تو کیسی گھنی ہے۔ کیسے شجاع بھائی کو راضی کر لیا۔" یہ کاشفہ تھی۔

"اور نہیں تو کیا؟ میرا شجاع اتنا سیدھا سادا۔ یقیناً اس نے یہ بات اس کے دماغ میں ڈالی ہوگی۔"

"لیکن آپ نے اچھا کیا اڑنے سے پہلے اس کے پر کاٹ دیے۔" تمسخرانہ قہقہہ......

اس سے زیادہ سننے کا حوصلہ اس میں نہیں تھا۔ وہ پلٹی اور سامنے سے آتے رضا سے بمشکل ٹکراتے بچی۔

"آپ کی طبیعت ٹھیک ہے؟" وہ تشویش سے اس کا سرخ پڑتا چہرہ دیکھنے لگا۔ جب سے اسے جاب ملی تھی وہ گھر پر کم ہی نکتا تھا۔

اب بھی یقیناً باہر جانے کے لیے ہی عجلت میں باہر نکل رہا تھا۔ عنادل نے اثبات میں سر ہلایا اور اسے باہر جانے کا رستہ دیا۔ لیکن وہ رک گیا۔ تھم گیا۔

"ان جھیل کناروں کی نمی کبھی چھپائے نہیں چھپتی اور نہ ہی یہ کبھی خشک ہوتے ہیں؟"

عنادل کی سانس سینے میں ہی اٹک گئی۔ بنا کوئی جواب دیے وہ تیزی سے چلی گئی۔

☆☆☆

شجاع کی جس کال کے لیے وہ بے قرار رہنے لگی تھی۔ دل میں باتیں ترتیب دیتی وہ اب بھی کیا نہیں پوچھتا۔ "تم ٹھیک ہو دل؟ کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟" وہ کہتی میں ٹھیک ہوں اور مجھے کس چیز کی ضرورت نہیں اور بس؟

سادہ لباس، گھنگھریالے بالوں کی چوٹی گوندھے، کاجل سے خالی آنکھیں، لپ اسٹک سے بے نیاز ہونٹ...... آہستہ آہستہ اس کے سارے رنگ پھیکے پڑتے جا رہے تھے۔

قدرت نے عورت کا خمیر محبت کی مٹی سے گوندھا تھا اس کے اندر چاہے جانے، سراہے جانے کی خواہش تھا اول روز سے ہی رکھ دی۔ ایک نرم نگاہ، گرم سانس، تحفظ کا احساس، اپنائیت، مان یہ سارے رنگ مل کر ہی عورت کو مکمل کرتے ہیں۔ اگر ایک ایک کر کے یہ سارے رنگ اترنے لگیں تو عورت اندر سے بہت کھوکھلی ہو جاتی ہے۔ بنجر اور بہت ویران۔

گلہ جفا کا نہیں ہے بے رخی کا
دل ہی تو ہے بھر گیا ہوگا!

"آج اتنی مایوسی کیوں؟" اس نے پوچھا وہ ہلکا سا ہنسا۔

"مایوسی نہیں تھکان ...... یکسانیت بہت جلد انسان کو تھکا دیتی ہے۔ ایک ہی راستے پر چلتے رہو۔ چلتے رہو۔ منزل کا دور دور تک پتا نہیں......"

"منزل نہ سہی۔ نشان منزل تو ہیں؟"

"کیا مطلب؟" وہ ٹھٹکا۔

"اس کا مطالبہ بے وقت سہی، ناجائز نہیں۔ وہ ماں اور آپا کے ساتھ رہنا نہیں چاہتی۔ آپ ان کے بغیر نہیں رہنا چاہتے۔ تو ایک ہی گھر کو دو الگ پورشن



میں بھی تو تقسیم کیا جا سکتا ہے نا؟" نہ اس کو آپا اور ماں کے ساتھ رہنا پڑے گا نہ آپ کو انہیں چھوڑنا پڑے گا۔"

"کمال ہے یہ خیال مجھے کیوں نہیں آیا۔" لحوں میں اس کے لہجے میں بشاشت اتر آئی تھی۔

"مگر بہت شکریہ بات بنتے ہیں مستقیم صاحب! لیکن انہیں ٹوٹنے میں محض لمحہ ہی لگتا ہے۔ تھوڑی سی مصلحت، تھوڑے سے سمجھوتے سے اگر کچھ بچ جاتا ہے تو اسے بچا لینا چاہیے۔" دوسری طرف اس نے یوں سانس اپنے اندر اتاری جیسے کوئی بہت بڑا بوجھ سینے سے سرک گیا ہو۔

"عنادل ایک بات کہوں؟"

"جی!"

"بہت بار میرے دل میں یہ خیال آیا جس کی باتیں اتنی خوب صورت ہیں۔ جس کا دل، جس کی سوچ اتنی اعلا ہے وہ خود کیسی ہوگی؟ بہت بار آپ کو ایک نظر دیکھنے کی خواہش نے شدت سے میرے اندر سر اٹھایا ہے لیکن ہر بار خاموش رہا۔ اب مجھے لگ رہا ہے۔ اپنی اس شدت سے سر اٹھاتی خواہش کو مزید کچلنا میرے اختیار میں نہیں ہے۔ میں اپنے آگے بے بس ہو چکا ہوں۔ کیا میں آپ کو دیکھ سکتا ہوں؟ صرف ایک بار......"

عنادل کو لگا جیسے شفاف سڑک پر چلتے چلتے اچانک کوئی بہت بڑا پتھر اس کے راستے میں آ گیا ہوں۔ اسے ٹھوکر لگتے لگتے بچی۔ "عنادل پلیز......"

عورت اپنے شوہر کی عزت کی امین ہوتی ہے اور جو اس امانت میں خیانت کرے؟ اسے یاد آیا اس نے کہیں پڑھا تھا۔ سو بدکار مرد ایک نیک عورت کو نہیں بھٹکا سکتے۔ لیکن ایک بدکار عورت سو نیک مردوں کو بھٹکا سکتی ہے۔

"بدکار عورت؟" اسے جیسے کسی بچھو نے ڈنک مارا ہو۔

"عنادل! صرف ایک بار آپ کو دیکھنا آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"اور اس کے بعد؟"

اسے اپنے وجود پر چیونٹیاں سی رینگتی محسوس ہوئیں۔

"او میرے خدا! یہ میں کیا کر رہی تھی؟ کیا کرنے جا رہی تھی؟ وہ اس وقت خوف سے وہ بلیوں کھڑی کانپ رہی تھی۔ آج وہ اس لمحے سے گزر رہی تھی جب وہ تباہی کے دہانے پر کھڑی تھی اور اللہ نے اسے بچا لیا۔ موبائل سے سم نکال کر پیروں تلے روندتے وہ سجدے میں گر گئی تھی۔

☆☆☆

ناعمہ کے ساس سسر عمرے کی ادائیگی سے واپس آ گئے تھے انہوں نے گھر میں قریبی عزیزوں کو دعوت پر مدعو کر رکھا تھا۔ دعوت تو رات کو تھی لیکن ناہید بیگم اور اصغر صاحب دوپہر ڈھائی بجے ہی چلے گئے۔ عائلہ نے بھی دعوت پر جانے کے لیے پارلر سے چھٹی کر لی تھی۔ ناہید بیگم نے رسماً عنادل کو اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ پھوڑے کی مانند دکھتے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر اس نے بھاری آنکھیں بمشکل کھول کر انہیں اپنی خرابی طبیعت کا بتایا۔

"چلو جیسے تمہاری مرضی۔" کہہ کر چلی گئیں۔ عنادل نے سر تکیے پر گرا لیا۔ نجانے کتنی دیر گزر گئی اسے ایک ہی زاویے پر لیٹے لیٹے۔ پیاس کے مارے حلق میں کانٹے سے چبھنے لگے تو وہ اپنی تمام تر ہمت مجتمع کر کے اٹھ کھڑی ہوئی۔ کچن سے پانی پی کر لاؤنج میں ہی صوفے پر بے دم سی ہو کر ڈھے گئی۔ اسی وقت اندر آتے رضا کی اس پر نظر پڑی تھی۔ وہ سرعت سے آگے بڑھا۔

"آپ ٹھیک ہیں؟" اس کے اوپر جھکا وہ تشویش سے پوچھ رہا تھا۔ عنادل کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔ رضا نے بلاارادہ اس کا ہاتھ تھاما۔ وہ بخار میں بری طرح جل رہی تھی۔

"ذکیہ!" وہ حلق کے بل چلایا۔ ملازمہ اس کی دھاڑ پر بھاگتی چلی آئی۔

''کہاں چلے گئے ہیں سب؟''

''وہ جی ناعمہ بی بی کے ہاں دعوت....''

ملازمہ اسے تفصیل بتانے لگی۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر مزید بولنے سے روک دیا۔ اور اس کی مدد سے عنادل کو گاڑی میں لٹا کر گاڑی ہسپتال کے راستے پر ڈال دی۔

''بہت تیز بخار ہے۔'' ڈاکٹر نے پیشہ ورانہ انداز میں چیک اپ کرنے کے بعد انجکشن لگایا کچھ دوائیاں تجویز کیں۔ وہ ملازمہ کو اس کا خیال رکھنے کا کہہ کر پرچی پکڑے باہر نکل گیا۔

''اگر اتنی ہی بیگم سے محبت تھی تو پہلے خیال کیوں نہ رکھا؟ بے چاری کو ادھ موا کر کے رکھ دیا بخار نے تب انہیں ہسپتال کا رستہ یاد آیا۔''

نرس کے تبصرے پر ذکیہ جل کر بولی۔

''کاہے کی بیگم! دیور ہیں یہ عنادل باجی کے ان کے شوہر تو دبئی میں ہوتے ہیں۔ حق ہا! سسرال والوں کے دل سے خوف خدا نکل جائے تو پردیسیوں کی بیویوں کی زندگی اس یتیم بچے جیسی ہو جاتی ہے۔ جسے باپ دنیا کی بھیڑ میں اکیلا چھوڑ گیا ہو۔''

''چہ بے چاری....'' نرس نے تاسف سے سر ہلایا۔ رضا دوائیاں لے کر واپس آیا تو واپسی پر احتیاط سے ڈرائیونگ کرتے گاہے بگاہے ایک نظر پچھلی سیٹ پر بے سدھ پڑی عنادل پر بھی ڈال لیتا۔

لاؤنج میں اسے آرام دہ صوفے پر لٹانے کے بعد ملازمہ ٹھنڈے پانی کی پٹیاں لینے چلی گئی۔

''شجاع!'' وہ گھٹنوں کے بل اس کے قریب بیٹھا اٹھنے کو تھا جب عنادل نے بے دھیانی میں اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''پلیز شجاع.....!'' بخار کی حدت سے سرخ چہرے پر لرزتی بند پلکیں۔

اس کا تیز تنفس..... اس کی ٹوٹی سسکیاں.....

رضا نے اس کے ہاتھوں میں دبوچا اپنا ہاتھ دیکھا اسے لگا وہ پتھر کا بن گیا ہے۔ وہ ایک لمحہ صدیوں پر بھاری تھا۔

ناہید بیگم حسب عادت بلند آواز میں باتیں کرتی اندر آئی تھیں۔ ''کیا ہوا ہے؟'' وہ ٹھٹکیں۔ سب اپنے اپنے کمروں میں جانے کے بجائے وہیں آ گئے۔ رضا بپھر گیا۔

''انسانیت نام کی کوئی چیز ہے آپ لوگوں کے اندر یا نہیں؟ انہیں بخار میں جلتا چھوڑ کر مزے سے دعوت پر جاتے ہوئے آپ کو ذرا احساس نہیں ہوا؟''

''کیا اول فول بک رہے ہو؟ اچھی بھلی تو تھی جب ہم گئے۔ معمولی سی طبیعت خراب تھی۔ اب ہمیں خواب تھوڑی آیا تھا کہ ہمارے جاتے ہی اسے بخار آئے گا۔'' ناہید بیگم الٹا اسی پر چڑھ دوڑیں۔

''ڈاکٹر کے ہاں لے گئے؟ کیا کہا ڈاکٹر نے؟'' اصغر صاحب رضا سے استفسار کرنے لگے۔ عائلہ بے زاری سے سر جھٹکتی ٹھک ٹھک کرتی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

''اب خدا کے لیے ان کے سر پر کھڑے ہو کر ان کی نازک مزاجی پر لیکچر دینا بند کریں۔''

رضا نے حد بدتمیزی سے ناہید بیگم کو ہاتھ اٹھا کر روکتا ملازمہ کو عنادل کو اندر کمرے میں لے جانے اور رات اس کے ہمراہ گزارنے کا کہا۔ ملازمہ نے فوراً تابعداری سے سر ہلایا تھا۔ ناہید بیگم کا اچھا بھلا موڈ غارت ہو کر رہ گیا۔

☆☆☆

''دل! بارش ہو رہی ہے۔''

کھڑکیوں کے پردے کھینچتی فریحہ نے خوش گوار انداز میں اسے اطلاع دی۔

''اچھا!'' وہ کراؤن سے ٹیک لگائے تکیے پر کاڑھے پھولوں پر انگلی پھیرتی رہی۔

''اچھا؟'' فریحہ کو اس کے اچھا پر حیرت ہوئی تھی۔ پردے سمیٹ کر وہ اس کے عین سامنے آ بیٹھی۔ ''تم بہت بدل گئی ہو دل!''

''تم بھی تو پہلے جیسی نہیں رہیں۔'' اس کا اشارہ فریحہ کی بھری بھری جسامت کی طرف تھا۔ فریحہ جھینپ گئی۔ وہ دوسری بار امید سے تھی۔



[illegible]

''دنیا داری کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ [illegible]

[illegible]

گود میں سو گیا تھا۔ [illegible]

[illegible]

موڑ کر ان کی طرف دیکھا۔

''ایسے کیوں دیکھ رہی ہیں؟'' چہرہ چھوڑ کر وہ ان کے پاس آ بیٹھی۔

[illegible]

ناہید بیگم کے لیے گولڈ کی چوڑیاں، عائلہ، ناعمہ اور کاشفہ کے لیے ایئر رنگز تھیں۔

''اور یہ آپ کے لیے؟'' مخملیں کیس سے جگر جگر چمکتا گولڈ کا نفیس بریسلیٹ جھانک رہا تھا۔

عنادل متذبذب تھی۔ ''میں...... جیولری نہیں پہنتی؟''

''ڈاکٹر نے منع کیا ہے؟'' وہ مصنوعی تشویش سے بولا۔

''نہیں تو......'' بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

''تو پہنا کریں نا؟ کمال تو میری بہنوں کا ہے جو اتنی بھاری بھرکم جیولری ہر وقت مزے سے چڑھائے رکھتی ہیں۔''

ہلکے پھلکے لہجے میں بولتا کیس اس کے ہاتھ میں تھما کر باہر چلا گیا۔ عنادل نے دانستہ سب کی طرف دیکھنے سے گریز کیا اور اپنے کمرے میں آ گئی۔ بریسلٹ واقعی بہت خوب صورت تھا۔ لیکن اس نے پہننے کے بجائے دراز میں ڈال دیا۔

☆☆☆

''کیا بتاؤں بیٹا! مہنگائی کا طوفان تھمنے میں نہیں آ رہا۔ ہر چیز کو جیسے آگ لگی ہوئی ہے۔ اب تو رضا بھی گھر کے اخراجات کی مد میں کچھ نہ کچھ رقم ہاتھ پر رکھ دیتا ہے لیکن لگتا ہے پیسوں سے برکت ہی اٹھ گئی ہے۔''

ناہید بیگم شجاع کے سامنے کال پر مہنگائی کا رونا رہی تھیں۔

''مہنگائی تو ہر جگہ ایک سی ہے امی! میں اب اپنے اخراجات محدود کر کے ہی کچھ اس پر قابو پایا جا سکتا ہے۔''

ناہید بیگم فوراً ہراساں لگیں۔ ''ہاں بیٹا! اگر تمہیں لگتا ہے ماں اپنے اللوں تللوں میں پیسے اڑا رہی ہے تو بے شک اپنی بیوی کے ہاتھ پر خرچا رکھ دو۔''

''ایسی بات نہیں ہے امی!''

''تو اور کیسی بات ہے؟ ایک ایک روپیہ دانتوں سے پکڑ کر خرچ کرتی ہوں۔ عائلہ کی شادی کے اخراجات کا سوچ کر میری راتوں کی نیند اڑ جاتی ہے۔ اور تم کہہ رہے ہو۔''

''میں آپ کی دل آزاری کا سوچ بھی نہیں سکتا امی! اور عائلہ کی شادی کی کیوں فکر کرتی ہیں۔ میں کر لوں گا سب کچھ۔''

انہوں نے ایک مطمئن سا ہنکارا بھرا تھا۔

''اچھا سنیں، میری چھٹی منظور ہو گئی ہے۔ ایک آدھ ماہ میں آ جاؤں گا۔ آپ عنادل کو اس بارے میں کچھ نہیں بتایے گا۔ میں اسے سرپرائز دوں گا۔''

''اچھا...... اچھا...... ٹھیک ہے۔'' انہوں نے خدا حافظ کہہ کر ریسیور کریڈل پر رکھا۔

''کیا کہہ رہا تھا شجاع؟'' صوفے پر دھنسی ناعمہ نے پوچھا۔

''کہہ رہا تھا چھٹی منظور ہو گئی ہے۔ ایک آدھ ماہ میں آ جاؤں گا۔ عنادل کو نہیں بتانا میں اسے خود سرپرائز دوں گا۔''

عنادل کے قدم جیسے دہلیز پر ہی جم گئے۔ ہوا کا ایک خوش گوار جھونکا اسے چھو کر گزرا تھا۔

''میں عنادل کو خود سرپرائز دوں گا۔'' وہ بھاگتے قدموں اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔

ناہید بیگم کے لہجے اور انداز پر اس نے دھیان نہیں دیا تھا۔ ان کے منہ سے نکلنے والے الفاظ اس کے لیے امرت بن گئے تھے۔

صبح پوری طرح بیدار ہوتی تو دروازے کی ہلکی سی درز سے روشنی کی پتلی سی لکیر اندر چلی آئی۔ وہ یونہی اسے دیکھے گئی۔ اچانک دماغ میں کوئی گرہ سی کھلی تھی۔ وہ گہری سانس کھینچتی مسکرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اگر زندگی اس کے ساتھ امتحان بن کر آ کھڑی ہوئی تھی تو اس نے میدان چھوڑنے یا ایک کونے میں چھپ چھپ کر آنسو بہانے کے بجائے حالات کا سامنا کرنے کے لیے خود کو تیار کر لیا۔

☆☆☆

''اوئے کبیر کے بچے! کان کھول کر سن لو اگر



آج تم نے میرے بتائے مینیو میں اپنی مرضی سے کوئی ردوبدل کیا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔ دیسی میں مٹن قورمہ میٹھے میں فروٹ ٹرائفل، فش فرائی، سلاد، رائتہ...... خبردار! جو ایک آئٹم بھی کم ہوا ہو تو۔''

اصغر صاحب نے مووب کھڑے خانساماں کے آگے پانچوں انگلیوں کا پنجہ دکھا کر گویا ایک ایک آئٹم گن کر بتایا تھا۔ خانساماں ادب سے سر ہلا کر کچن کی طرف بڑھا تو اصغر صاحب ایک غیر مطمئن سا ہنکارا بھرتے واپس اپنے کمرے میں چلے گئے۔

''ہونہہ! ایک ہزار ایک کھانا لا کر رکھ دو ان کے سامنے مگر مجال ہے جو کبھی ان کی لالچی طبیعت پُر ہو جائے۔'' دانت کچکچاتی ملازمہ کو دیکھ کر خانساماں نے جلے دل کے پھپھولے پھوڑے۔ اچانک عنادل کو دیکھ کر اس کی سٹی گم ہو گئی۔ ذکیہ نے بھی فوراً بتیسی اندر کر لی۔

''آج کھانا میں بناؤں گی؟'' خفت اور حیرت کے ملے جلے تاثرات چہرے پر سجائے خانساماں اور ذکیہ کو دیکھ کر اس نے کہا۔

''آپ پلیز مجھے گائیڈ کر دیں کون سی چیز کہاں رکھی ہے۔ باقی کام میں خود کر لوں گی۔''

''وہ جی بڑے صاحب نے سختی سے آرڈر دیا ہے کہ آج......''

''میں نے ''سب'' سن لیا تھا۔ آپ فکر مت کریں۔ سب کچھ ان کی پسند کے مطابق ہی بنے گا۔''

خانساماں ایک دم شرمندہ ہو گیا۔ ذکیہ بھی بغلیں جھانکنے لگی۔ میں مدد کر دوں آپ کی؟''

''آپ پلیز باہر کوئی اور کام دیکھ لیں۔'' مصروف انداز میں آستینیں اوپر چڑھا کر وہ کام میں لگ گئی۔ سائرہ چچی ہر قسم کے کھانے بنانے میں ایکسپرٹ تھیں۔ فریحہ کو اوپری جھاڑ پونچھ سے دلچسپی تھی۔ برتن بھی خوشی خوشی دھو لیتی لیکن کھانا بنانے سے اس کی جان جاتی تھی۔ اپنی دختر نیک اختر سے مایوس ہو کر انہوں نے اپنا سارا ہنر اور سگھڑاپا اس میں منتقل کر دیا۔ جو اب اس کے خوب کام آیا۔

☆☆☆

قورمے کا پہلا نوالہ منہ میں لیتے ہی اصغر صاحب کے منہ سے بے ساختہ ''واہ'' نکلا تھا۔

''میں تو پچھلے کئی سالوں سے تمہیں ڈانٹ پلا رہا ہوں۔ لیکن لگتا ہے ساری ڈانٹ کا اثر آج ہی ہوا ہے تم پر......''

''وہ جی ...... کھانا آج دلہن بی بی نے بنایا ہے۔'' خانساماں کی بات پر ناہید بیگم کو زوردار جھٹکا لگا۔

''جب ہی میں کہوں آج کھانے کی خوشبو ہی الگ ہے۔ واہ! بیٹا کمال کر دیا تم نے ''

عنادل کو اندازہ نہیں تھا اصغر صاحب اچھے کھانوں کے اس قدر ''قدردان'' ہوں گے۔ ایک ایک نوالے پر سر دھنتے رہے۔

اتفاقاً آج رضا بھی کھانے کے ٹائم گھر پر تھا۔ اور پہلی بار ہی اتنی رغبت سے کھا رہا تھا۔ کھانا واقعی لذیذ تھا۔ ناہید بیگم اور عائلہ نے منہ سے کچھ نہیں کہا البتہ دل میں قائل ضرور ہوئیں۔ انہیں ڈھونڈے سے بھی اعتراض کرنے کا کوئی نکتہ نہ مل سکا۔ پھر بھی کہے بغیر نہ رہ سکیں۔

''آج زبان کا ذائقہ بدلا ہے کل پھر خانساماں کے ہاتھ کے پکے کھانے انہیں زہر لگیں گے۔''

''میں کھانا بنا لیا کروں گی آنٹی! مجھے اچھا لگتا ہے۔''

''اچھا؟ کب تک؟'' عائلہ نے طنزیہ اپنے تیر کمان اچکائے۔

''روز۔'' عنادل نے سادگی سے جواب دیا۔

''کچھ سیکھو ان سے تم بھی۔ آگے زندگی میں صرف بال سیدھے کرنے والا چمٹا ہی کام نہیں آئے گا تمہارے۔''

''یہ رضا کا بچہ کچھ زیادہ ہی چمچہ گیری کرنے لگ گیا ہے ان کی۔'' عائلہ دانت کچکچاتی وہاں سے اٹھ گئی۔

اصغر صاحب نے ہزار ہزار کے نوٹ عنادل کی

طرف بڑھائے۔
''فائیو اسٹار ہوٹل جیسا کھانا گھر پر کھلانے پر انعام تو بنتا ہے۔''
''اس کی ضرورت نہیں ہے ابا!''
''انعام ہے تمہارا رکھ لو۔'' اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر وہ اپنے کمرے میں چلے گئے۔ اس نے اپنی نگرانی میں ملازمہ سے برتن اٹھوائے، اسٹرانگ سی چائے بنا کر سب کے کمروں میں بھجوائی اور اپنا کپ لے کر بالکنی میں آ گئی۔
کوئی ایک آدھ دن بھی یہاں رہتا تو جان جاتا کہ اصغر صاحب کی آڑ میں روزانہ بے حساب کھانا بنتا۔ رضا اکثر و بیشتر کھانا باہر سے ہی کھا کر آتا۔ نائلہ کا موڈ ہوتا تو کھائی ورنہ کچھ آرڈر کر کے منگوا لیتی۔ ایسے میں صرف دو افراد کے کھانے کے بعد بچ جانے والا ڈھیر سارا کھانا یا تو ملازمائیں اپنے گھر لے جاتیں یا پھر باسی ہونے پر پھینک دیا جاتا۔
مہینہ ختم ہونے سے پہلے کچن کا راشن ختم ہو جاتا۔ گھر والوں کے بے جا بھروسے اور لاپروائی نے ملازماؤں کو من مانی کرنے کی کھلی چھٹی دے رکھی تھی۔ لیکن آج عنادل کے تیور انہیں باور کروانے کے لیے کافی تھے کہ اب پہلے والے مزے خواب و خیال ہوئے۔
اپنے محبوب شوہر کا بوجھ بانٹنے کے لیے وہ اتنا تو کر ہی سکتی تھی۔ ٹمٹماتے ستاروں کے جھرمٹ میں گھرا چاند اسے دیکھ کر مسکرایا تھا۔

☆☆☆

عجیب سا پہر تھا۔ دوپہر ابھی پوری طرح ڈھلی نہیں تھی لیکن سہ پہر کا سرمئی پن ہر سو پھیلتا محسوس ہوا۔ ملگجا آسمان گرد آلود تھا۔
جب کاشفہ چلی آئی۔ ستا چہرہ، روئی روئی آنکھیں، کاشفہ کی عدیل کے بغیر آمد پر عنادل نے سکھ کا سانس لیا تھا لیکن اس کے رونے کی آواز سن کر وہ کشمکش و پیچ میں پڑ گئی آیا اسے اندر جانا چاہیے یا نہیں؟ اس کے سابقہ رویے کو سوچ کے عنادل نے لاؤنج میں جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ اور دن کے کھانے کی تیاری کی غرض سے کچن میں آ گئی۔
کاشفہ کا عدیل اور اس کے گھر والوں سے زوردار جھگڑا ہوا تھا۔ وہ سب پر لعنت بھیجتی بیگ اٹھا کر چلی آئی۔
''تو تمہیں کیا ضرورت ہے انہیں منہ لگانے کی؟ جب عدیل تمہارے ساتھ ہے تو دفع کرو ان سب کو۔''
''اسی بات کا تو دکھ ہے امی! تھالی کا بینگن ہے وہ۔ اندر کمرے میں میرا لیکن جب ماں بہنوں کے بیچ بیٹھتا ہے تو مجھے پہچانتا تک نہیں۔'' کاشفہ کی آنکھیں پھر سے برسنے لگیں۔ ناہید بیگم کو خوب تاؤ آیا۔ ''کم ظرف، کمینے لوگ، اتنا کچھ ٹھونسنے کے بعد بھی آنکھیں ماتھے پر رکھی ہوئی ہیں۔ ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو نظریں اٹھا کر بات کرنے سے پہلے سو بار سوچتا۔''
''کھایا پیا سب ہضم، اب تو سب مجھے ہی آنکھیں دکھانے پر تلے ہیں۔''
کاشفہ اپنے اوپر ڈھائے جانے والے مظالم کی داستان سناتے سناتے ادھ موئی ہوئی جا رہی تھی، جب عنادل مینگو اسکواش لیے اندر آئی۔ اور بنا کچھ کہے گلاس بھر کر پہلے ناہید بیگم کو دیا پھر کاشفہ کو۔ جیسے وہ ایک ہی سانس میں غٹاغٹ چڑھا گئی۔
''کھانے میں تو ابھی ٹائم ہے۔ کچھ اور بھجواؤں تمہارے لیے؟'' جانے سے پہلے اس نے پوچھا۔
کاشفہ تڑخ کر بولی۔ ''میرے باپ کا گھر ہے جو دل چاہے گا کھا لوں گی۔ آپ کو زیادہ فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔''
عنادل خاموشی سے باہر آ گئی۔ تب ہی جھنجلایا سا رضا اپنے کمرے سے باہر نکلا۔ وہ ٹھہر کر استفہامیہ نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔ ''کیا ہوا رضا؟''
''دو دن ہو گئے لانڈری سے کپڑے دھل کر آئے ہوئے۔ ابھی تک جوں کے توں پڑے ہوئے ہیں۔ گھنٹہ ہو گیا ہے اس ڈھیر سے بلو شرٹ ڈھونڈتے



ل کے ہی نہیں دی۔'' وہ سخت جھلایا ہوا تھا۔
''میں دیکھتی ہوں۔'' اس نے کندھے اچکا کر گہری سانس کھینچتے عنادل کو اندر جانے کا اشارہ کیا۔ اور خود باہر کاؤچ پر نیم دراز ہو کر پاؤں جھلانے لگا۔ کمرے کی حالت واقعی ابتر تھی۔ اتنی بے ترتیبی... اسے افسوس ہوا۔ صوفے پر پڑے ڈھیر میں سے بلو شرٹ ڈھونڈ استری کی اور رضا کے ہاتھ میں جا تھمائی۔ وہ تشکرانہ نگاہوں سے اسے دیکھتا شرٹ لے کر فوراً اپنے کمرے میں جا گھسا تھا۔

☆☆☆

''یاد نہیں پڑتا زندگی میں کون سی ایسی نیکی ہے جس کے بدلے میں خدا نے تمہاری جیسی بہو سے نواز دیا۔'' لنچ میں یخنی پلاؤ سے انصاف کرتے اصغر صاحب ایک بار پھر رطب اللسان تھے۔
اسی ذائقے کی خاطر وہ خانساماں سے آٹھ آٹھ کھانے بنوا لیتے تھے لیکن سواد پھر بھی نہیں آتا تھا۔ عنادل خاص مقدار میں چند ایک کھانے بنا کر اس سلیقے سے میز پر لگاتی کہ وہ انگلیاں چاٹ کر رہ جاتے۔
خانساماں کی تو اس نے چھٹی کروا دی تھی۔ لیکن ابھی بہت کچھ ایسا تھا جو ٹھیک کرنا باقی تھا۔ رضا کے کمرے کی حالات دیکھ کر تو اسے ابکائی آ گئی تھی۔
صغریٰ اور اس کی بیٹی ذکیہ برسوں سے اس گھر کی صفائی پر مامور تھیں۔ لیکن گھر والوں کی عدم دلچسپی دیکھ کر محض اوپری جھاڑ پونچھ کر کے چلی جاتیں۔ لیکن اب کی بار عنادل نے انہیں آڑے ہاتھوں لیا۔ شروعات رضا کے کمرے سے کی۔ کھڑکیاں کھولیں تو باسی ہوا کو باہر نکلنے کا رستہ مل گیا۔ اپنی موجودگی میں اس نے کمرے کا کونا کونا رگڑ کر صاف کروایا۔ بیڈ شیٹ بدلوائی۔ پردے، کشن کور، دو گھنٹوں میں کمرہ جگمگا اٹھا تھا۔
صغریٰ اور اس کی بیٹی گرد مٹی سے بھوتنیاں بنی کھڑی تھیں جب اس نے انہیں جانے کا عندیہ دیا۔ اور خود ایک طرف رکھی کتابوں کی ترتیب درست کرنے لگی۔

میں نے ہر بار نئی آنکھ سے دیکھا تجھ کو
مجھ کو ہر بار نیا عشق ہوا ہے تجھ سے!

''لگتا ہے میں کہیں غلط جگہ پر آ گیا ہوں۔'' پہلا قدم اندر رکھتے ہی رضا کو خوشگوار حیرت کا جھٹکا لگا۔
''سچ بتائیں ایسی کون سی جادو کی چھڑی گھمائی ہے؟'' تازگی کے احساس نے موڈ پر خوشگوار تاثر چھوڑا تھا۔
''جادو کی نہیں بلکہ یہاں جو سالوں سے ''چھڑی چھانٹ'' ایک ہی جگہ پڑی ہوئی تھیں انہیں ذرا سا گھمایا ہے۔''
اس کا اشارہ سمجھ کر رضا ہنس پڑا۔ وہ باہر آئی تو نائمہ آپا اور ان کی بچیوں کی آمد کا شور بلند ہوا۔ انہیں یقیناً کاشفہ پر ڈھائے مظالم کی خبر مل چکی تھی۔

☆☆☆

ماں بیٹیوں نے غائبانہ عدیل اور اس کے گھر والوں کے خوب لتے لیے تھے کاشفہ سوں سوں کرتی ناک رگڑتی رہی۔
''کوئی ضرورت نہیں واپس جانے کی۔ جب تک ماں بیٹا ناک رگڑتے تم سے معافی مانگنے نہ آئیں۔''
لگے ہاتھوں مشورہ بھی دے ڈالا۔ کاشفہ خود بھی ابھی واپس جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ وہ اپنی بے عزتی بھول جانے والوں میں سے نہیں تھی۔ ملازمہ کے ہاتھ چائے کے ساتھ بسکٹ، کباب، بھجوانے کے بعد عنادل اپنے کمرے میں آ گئی۔
''تم ہی عدیل کی ظاہری شخصیت پر مرمٹی تھیں ورنہ میں نے تو پہلے دن ہی کہہ دیا تھا خبیث اور...''
کباب منہ میں رکھتے ہی باقی کی آدھی بات منہ میں رہ گئی۔ بہت الگ اور منفرد سا ذائقہ تھا کاشفہ کی روداد سنتے سنتے ایک چکر کچن کا بھی لگا آئیں۔
''خانساماں کدھر ہے؟'' صاف ستھرے کچن میں ذکیہ کو چکن دھوتا دیکھ کر انہوں نے پوچھا۔
''وہ تو جی کب سے کام چھوڑ کر جا چکے ہیں۔''

"ہیں؟ تو پھر کھانا کون بنائے گا؟"
"عنادل بی بی بناتی ہیں۔" ناعمہ کو بات کچھ ہضم نہیں ہوئی۔ "اور یہ جو ابھی چائے وغیرہ......"
"جی وہ بھی عنادل بی بی نے ہی بنائے تھے۔"
ناعمہ حیران حیران سی باہر آ گئی۔ کاشفہ کا سسرال نامہ اختتام پذیر ہوا تو گھر میں ہوئی تبدیلی پر اب ان کی نظر گئی تھی۔
دو دن پہلے ہی تو عنادل نے ناہید بیگم سے کہا۔ "آنٹی اگر آپ اجازت دیں تو میں گھر کی سیٹنگ کچھ چینج کر دوں؟" وہ کاشفہ والے معاملے میں الجھی ہوئی تھیں اس کی بات پر زیادہ توجہ دیے بنا اثبات میں سر ہلا دیا۔
اجازت ملنے کی دیر تھی کہ عنادل نے ملازماؤں کی مدد سے اسٹور کی مانند بھرے ہوئے گھر کی سیٹنگ کیا تبدیل کی سارا نقشہ ہی بدل گیا۔ سب کچھ ایک دم روشن اور کھلا کھلا سا لگنے لگا تھا۔ رضا اور اصغر صاحب نے اس تبدیلی کو خوب سراہا تھا۔
"لگتا ہے آپ نے اپنی بہو کو کچھ زیادہ ہی چھوٹ دے دی ہے۔" ناعمہ کو اچانک یہ سب کچھ ہضم کرنا مشکل لگ رہا تھا۔
"اپنی مرضی سے کرتی ہے یہ سب کچھ۔"
"دیکھ لیں امی! اس مرضی کے چکر میں وہ کہیں آپ کو ہی دیوار سے نہ لگا دے۔"
"بابا آ گئے۔" مشتاق کو آتا دیکھ کر چھوٹی زرقا نے نعرہ لگایا تھا۔ اسی وقت ملازمہ نے کھانا لگنے کی اطلاع دی۔
"ٹائم" کے بہت پابند ہیں مشتاق بھائی۔"
عائلہ کو ہنسی آ گئی۔ ناعمہ نے اسے بری طرح گھورا۔
"واہ بھئی! شیف بدل لیا ہے کیا؟" وائٹ کڑاہی کا پہلا لقمہ منہ میں لیتے ہی مشتاق نے پوچھا۔
"ارے مشتاق میاں، شیف تو ہم نے کب کا نکال دیا۔ میری بہو کے ہاتھ کا کمال ہے یہ۔"
اصغر صاحب سینہ ٹھونک کر یوں فخریہ بولے جیسے وہ ان ہی کی پیشکش ہو۔
"تم نے کبھی ذکر نہیں کیا اچھا خاصا کھانا بھی بنا لیتی ہو؟" ناعمہ نے ابرو چڑھا کر کہا۔
"کنفیوژ مت ہوں۔ اسے اپنی تعریف ہی سمجھیں۔" رضا کے انداز پر وہ زیر لب مسکرا دی۔
کھانے کے بعد ناعمہ نے کچن میں جا کر ملازمہ کو کھانا پیک کرنے کا کہا۔
"کھانا تو ختم ہو گیا ناعمہ باجی! بس یہ تھوڑے سے کوفتے اور چکن ہانڈی بچی ہے۔"
"ختم ہو گیا؟" ناعمہ کو صدمہ ہوا۔
"عنادل باجی! ناپ تول کر ہی ہر چیز پکاتی ہیں۔ کہتی ہیں اس طرح رزق کا ضیاع نہیں ہوتا۔"
"چپ کرو تم۔" ذکیہ کو ڈانٹ پلا کر وہ غصے سے بھری ماں کے سامنے جا کھڑی ہوئیں۔
"یہ کیا طریقہ ہے امی! آپ کے گھر میں کب سے بھوکے ننگے لوگوں کی طرح ایک ایک چیز کا حساب کتاب رکھا جانے لگا؟"
"سوری آپا! مجھے پتا نہیں تھا آپ کے گھر والوں کا بھی ساتھ کھانا بنانا ہے ورنہ میں زیادہ بنا لیتی۔" اس کی معذرت پر وہ مزید بھڑک اٹھیں۔
"دیکھ رہی ہیں امی آپ! کس طرح جتا رہی ہے یہ مجھے؟"
"ہاں بھئی، ان کے میاں کا جو کھاتے ہیں۔ باتیں تو سننی پڑیں۔"
ناعمہ غصے سے بڑبڑاتی چادر اوڑھنے لگیں۔ بچیوں کو بازو سے پکڑ کر گھسیٹا۔
"ارے کھانا تو اٹھانے دو، وہ لوگ انتظار میں بیٹھی ہوں گی......"
مشتاق پیک شدہ کھانے کی تلاش میں ادھر ادھر نگاہیں دوڑا رہے تھے۔
"چلیں آپ......" ناعمہ نے غصے سے بیگ کندھے پر ڈالا اور باہر نکل گئیں۔ ان کے پیچھے حیران پریشان سے مشتاق بھائی بھی۔
☆☆☆
بیٹھے بٹھائے یوں بھی آیا تیرا خیال



ہم لاکھ غم زدہ تھے، مگر مسکرا دیے!
شجاع کے انتظار میں وہ انگلیوں پر دن گننا شروع ہوئی تھی۔ جب ایک صبح وہ اٹھے گی تو اچانک شجاع اس کے سامنے آ جائے گا۔ یہی سوچتی، مسکراتی وہ لان میں آ گئی۔
مالی اس کی توجہ اور دلچسپی بھانپ کر از خود اب لان کا خیال رکھنے لگا تھا۔ ابھی بھی وہ نرسری سے لے کر آئے نئے پودے اسے دکھا رہا تھا۔
"لگتا ہے بہار آنے کو ہے۔" قریب ہی کہیں کوئل اس کے دل کے تار ہلا گئی تھی۔ سرخ روش پر چلتا رضا اسی کی طرف چلا آیا تھا۔ ڈھیلے ڈھالے ٹراؤزر اور شرٹ میں ملبوس۔ آج اس نے آفس سے شاید چھٹی کر لی تھی۔
"لگتا ہے مالی بابا اب رات کو ہی اپنی نیند پوری کرتے ہوں گے۔"
کیاری کی گوڈی کرتا مالی ہنس پڑا۔ "غفلت میں پڑ گیا تھا صاحب! عنادل بی بی کا شکر گزار ہوں، حق حلال کی کمائی کھانا بھی تو کسی سعادت سے کم نہیں۔"
جب سے لان کی حالت بہتر ہوئی تھی اصغر صاحب بھی ہوا خوری کے لیے یہاں آ جاتے۔
"آپ لوگوں کے لیے چائے بھجواؤں؟" انہیں لان چیئرز کی طرف بڑھتا دیکھ کر عنادل نے پوچھا۔
"نیکی اور پوچھ پوچھ؟" انہوں نے خوش دلی سے قہقہہ لگایا تھا۔
اندر آئی تو ناہید بیگم شاور لینے گئی ہوئی تھیں۔ جبکہ ڈرائنگ روم میں ان کی خالہ زاد بہن ندرت آئی بیٹھی تھیں۔ ملازمہ کو چائے کا کہہ وہ ڈرائنگ روم میں آ گئی۔
"اے بہو! یہ کاشفہ ابھی تک یہیں ہے؟ گھر والوں کے ساتھ کوئی جھگڑا وگڑا ہو گیا ہے کیا؟" رسمی باتوں کے بعد انہوں نے خاصے رازدارانہ انداز میں پوچھا۔ ڈرائنگ روم کے ادھ کھلے دروازے پر ناہید اور کاشفہ کے قدم ایک ساتھ تھمے تھے۔ ندرت خالہ خاندان بھر میں بی بی سی مشہور تھیں۔ ناہید بیگم کو اپنا سر گھومتا محسوس ہوا۔ لیکن وہ چونک گئیں۔ عنادل کہہ رہی تھی۔
"نہیں، نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ طبیعت خراب تھی، میاں نے کہا ماں کے گھر چند دن رہ لو۔ دل بہل جائے گا۔ بہت لاڈلی ہے نا سب کی۔"
ناہید بیگم نے بے ساختہ گہری سانس خارج کرتے لب بھینچے کھڑی کاشفہ کو دیکھا تھا جو بنا کچھ کہے واپس مڑ گئی تھی۔
"اوہ اچھا؟" انہوں نے مایوسی سے سر ہلایا۔ "میں سمجھی شاید روٹھ کر میکے آ بیٹھی ہے۔"
"شادی کے بعد بیٹیوں کا ماں باپ کے گھر سے حق ختم تو نہیں ہو جاتا کہ وہ صرف روٹھ کر ہی ان کے گھر آئیں۔"
عنادل نے رسانیت سے جواب دیا، ناہید بیگم کے دل میں عجیب سے احساس نے سر اٹھایا تھا۔ اندر داخل ہوتے ہوئے انہوں نے بہت مختلف نظر سے عنادل کو دیکھا تھا۔ جو انہیں آتا دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔
"میں کھانے کے لیے کچھ بھجواتی ہوں۔"
☆☆☆
"دماغ خراب مت کرو عائلہ! میں ویسے ہی بہت پریشان ہوں۔"
عدیل اور اس کے گھر والوں کی مسلسل خاموشی انہیں اب ہولانے لگی تھی۔ نہ تو ان لوگوں نے کال کی نہ ہی عدیل نے کاشفہ سے کسی قسم کا کوئی رابطہ کیا۔ انہوں نے پریشانی سے اپنی پیشانی کو چھوا۔ کاشفہ الگ جلے پیر کی بلی کی مانند پورے گھر میں چکراتی پھرتی۔
"ہاں تو جن کی پریشانیاں ہیں ان سے کہیں اپنے گھر جا کر سولو کریں۔" وہ ڈھٹائی سے بولی۔
اس کا بیوٹیشن کا کورس مکمل ہو گیا تھا اور اب وہ گھر کے عقبی حصے میں خالی پڑے پورشن میں کچھ

ردوبدل کر کے اپنا پارلر سیٹ کرنا چاہتی تھی۔ ناہید بیگم کئی دنوں سے اسے ٹالے جا رہی تھیں۔ لیکن آج وہ ٹلنے کے موڈ میں ہرگز نہیں تھی۔

"یہ سب اتنا آسان نہیں ہے جتنا تمہیں لگ رہا ہے۔"

"اتنا مشکل بھی نہیں ہے جتنا آپ بتا رہی ہیں۔ میری پورے دو سال کی محنت کا صلہ ملنے کا وقت اب ہی تو آیا ہے۔"

"اچھا...... اچھا بات کروں گی رضا سے۔"

"ہونہہ! وہ کہیں دے ہی نہ دے۔" عائلہ نے نخوت سے ناک چڑھائی۔

"میں ہزاروں کی بات نہیں کر رہی امی! مجھے اس کام کے لیے جتنے پیسے چاہئیں وہ صرف شجاع بھائی ہی دے سکتے ہیں۔"

"ہاں تو شجاع کی کون سی فیکٹریاں چل رہی ہیں۔ ویسے ہی اس کے تیور ٹھیک نہیں لگ رہے تھے۔"

"میں کچھ نہیں جانتی امی! یہ میرا برسوں پرانا خواب ہے۔ اور میں اپنے خواب سے کسی صورت دستبردار نہیں ہوں گی۔" ہوا کے تند جھونکے کی طرح وہ عنادل کے سامنے سے گزری تھی۔ عنادل کا دل یکبارگی بہت زور سے دھڑکا۔

وہ نہیں جانتی تھی ناہید بیگم نے شجاع سے کیسے اور کیا کہا لیکن اس نے پیسوں کا بندوبست کرنے کا وعدہ کر لیا تھا۔

اس رات شجاع کے لہجے میں اتری تھکان نے اسے سونے نہیں دیا تھا۔

صبح اٹھے، گھنگریالے بالوں کو سمیٹ کر آئینے پر نگاہ ڈالی تو ناک کی چمکتی لونگ شکوہ کناں ہوئی۔

وہ نگاہ چرائی آئینے کے سامنے سے ہٹ گئی۔ ٹیرس پر جا کر کھلی ہوا میں گہرے سانس لیے۔ کندھے کے ایک طرف دوپٹا ہوا سے پھڑپھڑانے لگا تھا۔ دوسری طرف ریلنگ سے ٹیک لگا کر کافی مگ تھامے رضا نے اسے مارننگ وش کیا تھا۔ وہ بنا کوئی تاثر دیے وہاں سے ہٹ گئی۔

نیچے کاشفہ کی ساس اور شوہر کی دھماکے دار انٹری ہوئی تھی۔ ناہید بیگم تو کئی دنوں سے سوچ رہی تھیں کیسے ان کے لتے لیں گی۔ الٹا وہ آ کر گرجنے لگیں۔

"کمال تو آپ کی ہے ناہید بہن! بیٹی اتنے دنوں سے میکے آ بیٹھی ہے اور آپ کے کان پہ جوں تک نہ رینگی۔"

"زبان سنبھال کر بات کرو افشاں! میں نے اپنی ہیرے جیسی بیٹی کروڑوں کے جہیز کے ساتھ رخصت کی تھی اور تم ناقدرے لوگوں نے میری بچی کا کیا حال کر دیا۔"

"ہونہہ! کروڑوں کے جہیز کے ساتھ دو چار ملازم بھی تو ساتھ کر دیتے تھے کیونکہ آپ کی اس ہیرے جیسی بیٹی کو ہل کر پانی پینا تک گوارا نہیں تھا۔ ارے میں دیکھتی آپ کی بہو کے ایسے کرتوت ہوتے تو آپ کتنے دن اسے اپنے گھر میں رکھتیں۔ یہ تو ہماری شرافت ہے کہ ہم نے اس بدتمیز کو اتنے عرصے جھیلا جسے نہ شوہر کی عزت کی پرواہ ہے نہ ہی رشتوں کا لحاظ۔"

عدیل خاموش تماشائی بنا ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے بیٹھا رہا۔ کاشفہ نے سخت شکاتی نگاہوں سے اسے دیکھا تھا بیٹے کی شادی کرتے وقت ہزاروں ارمان تھے دل میں لیکن دل کے ارمان دل ہی میں رہ گئے۔"

"تو کیا آپ نے یہی لیکچر دینے کے لیے یہاں آنے کی زحمت کی؟" اپنے اندر اٹھتے غصے پر بمشکل ضبط کیے رضا بولا۔

"بتانے آئی ہوں اپنی بیٹی کو سمجھا دیں ہمارے گھر میں رہنا ہے تو ہمارے طور طریقوں کے مطابق رہنا ہوگا ورنہ......"

"ورنہ؟"

"ورنہ پھر آپ شوق سے اسے زندگی بھر اپنے گھر بٹھائے رکھیں۔ ویسے بھی ابھی تک ہمیں اولاد کی خوشی نہیں دے سکی۔ ہمارے اکلوتے بیٹے کی نسل کا سوال ہے۔ اسے بے نام ونشان رہنے کے لیے یونہی تو نہیں چھوڑ دیں گے۔"

"چلو عدیل......" اچھی طرح گرج برس کر وہ چلی گئیں پیچھے سب کو سانپ سونگھ گیا۔ "مجھے بے اولادی کا طعنہ مار گئی ہیں۔" کاشفہ صوفے پر ڈھے گئی۔

☆☆☆

ناہید بیگم کو تو لگتا تھا جیسے ان کا گھر کسی بددعا کے حصار میں آ گیا ہو۔ ایک سے بڑھ کر ایک بری خبر سننے کو مل رہی تھی۔ مشتاق کی الیکٹرک کی دکان میں شارٹ سرکٹ کی وجہ سے آگ لگ گئی۔ سارا سامان جل کر خاک ہو گیا۔ ناعمہ کا رو رو کر گلا خشک ہو گیا۔ مشتاق منہ سر لپیٹے کمرہ بند تھا۔ بچیاں الگ بولائی بولائی سی پھر رہیں ساس آئے دن کچوکے لگاتیں۔

"میاں کی پریشانی کا ذرا خیال نہیں، بس اپنی ناک اونچی رہے بھائی لاکھوں کما رہا ہے۔ منجھلی کو کروڑوں کا جہیز دیا۔ چھٹکی کے لیے لاکھوں لٹائے یہاں بھوک کے مارے پیٹ میں بل پڑ گئے مگر بہو بیگم کی اینٹھن ہی ختم نہیں ہو رہی۔ ہائے میرا بدنصیب بچہ! ایک بیٹا ہی ہو جاتا تو مستقبل کا کچھ تو سہارا ہوتا۔"

ان کی مسلسل ایسی باتوں سے تنگ آ کر ایک دن ناعمہ ماں کے سامنے آ کر رو پڑیں۔ ناہید بیگم کو پہلی بار اپنے اعصاب ٹوٹتے محسوس ہوئے۔ پہلی بار ہی ایسا ہوا کہ شجاع سے مزید پیسوں کا تقاضا کرتے ان کی آواز بہت کمزور ہوئی تھی۔ ناعمہ کی پریشانیوں کا ذکر کرتے ٹوٹے ہوئے، بے ربط جملے ان کے منہ سے نکلے تھے۔

اور عنادل سوچتی لوگ یہ کیوں کہتے ہیں وقت سب سے بڑا مرہم ہوتا ہے؟ اسے تو وقت سے بڑا ظالم اور کوئی نہیں لگتا۔ نہ تو کسی کے لیے رکتا ہے نہ پلٹتا ہے۔ چاہے لمحوں کے اسیر اس کی گرفت میں برسوں پر پھڑپھڑاتے رہیں۔ گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹے وہ خاموشی سے شاخ سے زرد پتے ٹوٹ ٹوٹ کر گرتا دیکھتی رہی۔

بہار آ کر گزر بھی گئی تھی۔

عائلہ کا بیوٹی پارلر سیٹ ہو گیا تھا۔ ناعمہ آپا کے شوہر کی دکان پھر سے سامان سے بھر گئی تھی۔ سب کے لیے سب کچھ ایک بار پھر ٹھیک ہو گیا۔ لیکن جھیل میں کنکر اس وقت پڑا جب گھر میں رضا کی شادی کا ذکر چھڑا۔

"میں عنادل سے ہی شادی کروں گا۔" بہت آرام سے اس نے سب کے سروں پر بم پھوڑا تھا۔

"ہوش میں تو ہو کیا کہہ رہے ہو؟" ناہید بیگم چلا اٹھی تھیں۔

"کچھ پتا بھی ہے کیا بکواس کر رہے ہو تم؟" ان کا جسم کانپنا شروع ہو گیا تھا۔

ششدر سی عنادل کو لگا وہ اگلا سانس تک نہیں لے سکے گی۔

"بیوی ہے تمہارے بھائی کی......"

"ہونہہ بیوی؟ کاغذ کے ٹکڑے پر سائن کرنے سے رشتے نہیں بن جاتے۔ کون سے حقوق پورے کیے ہیں شجاع بھائی نے ان کے؟ بلکہ انہیں تو یاد بھی نہیں ہوگا اپنے پیچھے ایک جیتی جاگتی انسان کو دو لفظوں کا پابند کر گئے ہیں۔"

"رضا! میں کہتی ہوں خاموش ہو جاؤ۔"

"خاموش ہو جاؤں گا امی! لیکن دست بردار نہیں ہوں گا۔ ان کے نام نہاد شوہر کو شاید پتا نہیں ہے عورت ملکیت کے نہیں محبت کے حصار میں رہنا پسند کرتی ہے۔"

عنادل کو لگا جیسے کوئی بیچ چوراہے اسے سنگسار کر رہا ہو۔ اس کی عزت، اس کی نسوانیت، اس کے وقار کے پرخچے اڑا رہا ہوں۔ وہ بمشکل اپنے قدموں پر جمی کھڑی تھی جب اس کی نگاہ سامنے ساکت کھڑے شجاع پر پڑی تھی۔ آنکھوں میں ڈھیر ساری وحشت لیے جیسے تنفگی سے کسی اور دنیا میں آ گیا ہو۔ رضا غصے سے کرسی کو ٹھوکر مارتا باہر نکل گیا تھا۔ عنادل

کے قدموں میں جنبش ہوئی۔ وہ بھاگتے ہوئے اپنے کمرے میں بند ہوگئی۔

''آہ! شجاع کا سرپرائز۔''

☆☆☆

اپنی حد درجہ حاکمانہ طبیعت کی وجہ سے وہ اصغر صاحب جیسے لاابالی اور چٹورے انسان کے ساتھ ایک دن بھی نہ رہتیں اگر چھوٹے بچوں کا ساتھ نہ ہوتا۔

جب اصغر صاحب کو لگا ان کے زبان کے چسکے پورے کرنا ناہید بیگم کے بس کی بات نہیں تو وہ ہر ماہ ایک محدود رقم ان کے ہاتھ پر رکھ کر باقی باہر ہوٹلنگ میں اڑا دیتے۔

بچوں میں کپڑے، جوتوں اور کھانے پینے کی چیزوں پر چھینا جھپٹی ہوتی، ناہید بیگم چیختی چلاتیں، اصغر صاحب مزے سے بیٹھے چرند اڑا رہے ہوتے۔

شجاع شروع سے ہی سنجیدہ اور حساس طبیعت کا مالک تھا۔ گھر کے ماحول سے راہ فرار اختیار کرتے اس نے کتابوں میں پناہ ڈھونڈ لی۔ ٹیوشن اور ایوننگ اکیڈمی میں پڑھا کر وہ اپنی تعلیم کا خرچا اٹھاتا رہا۔ اسے جلد از جلد اپنے پیروں پر کھڑا ہونا تھا۔

اس کا خلوص، لگن، اور محنت رنگ لے آئی تھی۔ تعلیم مکمل کرنے کے دوران وہ مختلف جگہوں پر جاب کے لیے اپلائی کرتا رہا کہ ایک دن اچانک اسے خواجہ انڈسٹریز کی دبئی برانچ میں ملازمت ملنے کا اپائنٹمنٹ لیٹر موصول ہوا۔

گھر میں اس وقت نائمہ کی شادی کی بات چل رہی تھی جب وہ بہت سارے خواب، ڈھیر ساری امیدیں لے کر دبئی روانہ ہوا۔

اس کے دبئی جانے سے گھر کے حالات کیا بدلے، گھر کا نقشہ، گھر والوں کے اطوار، رنگ ڈھنگ سب بدل گئے۔ اصغر صاحب کو لگا ان کے زبان کے چسکے اب باآسانی گھر پر بھی پورے ہوسکتے ہیں۔ اس لیے انہوں نے اپنے جنرل اسٹور کو خیر باد کہہ دیا۔

ناہید بیگم نے گھر کے ماحول، اولاد کی تربیت، خاندانی معاملات ہر چیز پر اتنا تسلط جمایا ہوا تھا۔ ان تمام معاملات میں اصغر صاحب سے مشورہ کرنا تو دور انہیں بتانا بھی گوارا نہیں کرتی تھیں۔ انہوں نے ہر چیز کو اپنی مرضی سے چلانا چاہا۔ لیکن وہ یہ بھول گئیں کہ اگر بنیاد کمزور ہو تو عمارت کبھی بھی اپنے قدموں پر کھڑی نہیں ہوسکتی۔ جلد یا بدیر منہدم ہو ہی جاتی ہے۔ انہیں بھی آج اپنی یہ عالیشان عمارت زمین بوس ہوتی دکھائی دی تھی۔ جس پر انہیں بہت ناز تھا۔

''غلطی کہاں پر ہوئی تھی؟''

انہوں نے اپنا سینہ مسلا۔ ان کے بچوں کے اندر پروان چڑھتی یہ خود غرضی اور بے حسی ان ہی کی تو ودیعت کردہ ہے۔ شجاع کی بدولت انہیں پرتعیش زندگی دیتے۔ ان کی ہر جائز ناجائز خواہش پوری کرتے وہ انہیں انسانیت کا درس دینا، تو بھول گئیں۔

انہیں یاد آیا اکثر شجاع کی کال کی گھنٹی بجتی رہتی اور سب جان بوجھ کر ادھر ادھر ہوجاتے لیکن جب اس سے کوئی تگڑی سی فرمائش کرنی ہوتی تو ایک دوسرے کے ہاتھ سے ریسیور تک اچک لیتے۔ انہوں نے اپنے ہاتھوں سے ان کے اندر حرص کا ایسا بیج بو دیا جس نے انہیں کبھی اپنے ''حال'' پر قانع نہیں ہونے دیا۔ مزید سے مزید تر کی خواہش نے انہیں اپنی ذات سے آگے نکل کر کسی اور کے بارے میں سوچنے ہی نہیں دیا۔ کاش کہ وہ انہیں تھوڑا لیکن باہمی سلوک اور عزت سے کھانے، پینے اوڑھنے کی ترغیب دیتیں تو آج حالات مختلف ہوتے وہ رشتوں کا تقدس یوں پامال نہ کرتے۔

رضا کے مطالبے نے تو انہیں زندہ درگور کردیا تھا۔

انہوں نے بہت حیرت سے سر اٹھا کر اپنے گھر واپس جانے کے لیے تیار کھڑی کاشفہ کو دیکھا تھا۔

''کاش امی میں رشتوں کا احترام، خلوص اور نیک نیتی اپنے دامن میں لے کر اس گھر سے رخصت ہوئی ہوتی تو آج ''اس'' گھر میں واپس



جانے کے لیے میرے قدم یوں شرمندہ نہ ہوتے جہاں سے میں لاکھوں، کروڑوں کے جہیز کے ساتھ ذلیل کرکے نکالی گئی تھی۔

آج اس کی آنکھوں میں چمکنے والی نمی کا رنگ اور تھا۔

''ایک بات بہت دیر سے سمجھ میں آتی ہے دوسروں کی خوشیاں، ان کا حق چھین کر ہم کبھی خوش نہیں رہ سکتے۔'' آج ایک نئی کاشفہ اس گھر سے رخصت ہوئی تھی۔

در و دیوار نے جیسے خاموشی کی بکل اوڑھ لی۔ انہوں نے صوفے پر بیٹھے شجاع کو دیکھا۔ جو سر جھکائے پیر کے انگوٹھے سے کارپٹ کھرچ رہا تھا۔

''شجاع! میں بہت شرمندہ ہوں بیٹے...... میں...... نے بہت غلط کیا...... بہت...... مجھے معاف کردو۔''

شجاع نے جھکا سر اوپر اٹھایا تھا۔ ''میں نے آپ سے کوئی گلہ تو نہیں کیا امی!''

''کاش کیا ہوتا۔ کاش کہ تم اتنے فرماں بردار نہ ہوتے۔ کاش کہ میں......''

وہ ٹوٹ کر بکھر رہی تھیں شجاع نے انہیں بانہوں میں تھام لیا۔ ٹوٹے ہوئے الفاظ، ہچکیوں کے درمیان اپنی غلطیاں، اپنے گناہ، اپنی ناانصافیاں گنوائی گئیں۔

''کیا تم مجھے معاف کرسکو گے؟''

''آپ مجھے گناہ گار مت کریں امی پلیز......''

ان کے ہاتھوں پر بوسے دیتا۔ وہ ان ہی کا شجاع تھا۔

☆☆☆

برسے گا ٹوٹ ٹوٹ کر ابر مجبیاں<br>
ہم چیختے رہیں گے حاجت نہیں رہی<br>
اک روز کوئی آئے گا لے کر کے فرحتیں<br>
اک روز ہم کہیں گے ضرورت نہیں رہی

نیم روشن کمرے میں وہ سائیڈ ٹیبل سے ٹیک لگائے کارپٹ پر گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹے بیٹھی تھی۔

شجاع قدم قدم چلتا اس کے قریب گھٹنوں کے بل آبیٹھا۔

''دل!''

اس نے جھکا سر ضرور اٹھایا لیکن نگاہ پھیر لی۔

شجاع نے گہری سانس اپنے اندر اتاری، اس کے بے حد قریب گھٹنے سے گھٹنے ملا کر بیٹھ گیا۔

''میری طرف دیکھو گی بھی نہیں؟''

''دنیا میں شوہروں کے لیے کئی قانون ہیں لیکن بیوی کو انتظار کی سولی پر چڑھا کر ہجر کی بھٹی میں جلانے والوں کے بارے میں بھی تو دنیا کی کسی قانون کی کتاب میں کچھ لکھا ہوگا؟'' اس کی طرف دیکھے بغیر وہ بولی تھی۔

''دنیا کا مجھے نہیں پتا، لیکن تمہارے دل کے قانون کی کتاب میں میرے جرم کی جو سزا لکھی ہے وہ میں تا عمر بھگتنے کو تیار ہوں۔'' اس کے دونوں ہاتھ تھامے وہ کہہ رہا تھا۔

''تمہارا لاکھ مجرم سہی لیکن خدا کی قسم دل! تم سے دور ہو کر بھی صرف تمہارا ہی رہا۔''

عنادل نے نگاہ اٹھائی۔ وہ اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''میرے ساتھ چلو گی دل! یہاں سے بہت دور......؟''

''شجاع!''

''جی جان شجاع!''

''مجھے رونا آرہا ہے۔ میں رو لوں؟ آج ہی سارے آنسو بہانے ہیں۔''

نم آنکھیں جھپکتی وہ پوچھ رہی تھی۔ اور شجاع کا دل چاہا اسے اپنے سینے میں چھپا لے۔

''صرف آج اس کے بعد کبھی نہیں۔'' انگلی اٹھا کر وارننگ دی۔

وہ روتے روتے ہنس پڑی۔ خود کو اس کے سپرد کرتے، اس کے سینے پر سر ٹکائے اس نے طمانیت سے آنکھیں بند کرلی تھیں۔

تنزیلہ ریاض

نورالقلوب ایک ایسا ادارہ جہاں صندل بی لوگوں کے لیے دعا کرتی تھیں، لوگ اپنے مسائل لے کر ان کے پاس آتے تھے۔ وہ انتہائی خوب صورت خاتون تھیں۔

بٹ گرام میں بنی ہری حویلی میں وہ اپنے باپ اور گلے جو اس کی سوتیلی ماں تھی سے ملنے چھٹیوں میں آتا ہے۔ گلے اس کی خالہ بھی جو اس کی ماں کے مرنے کے بعد انتہائی کم عمری میں اس کے باپ سے بیاہی گئی تھی۔

خوشل اپنے باپ کی نسبت گلے سے زیادہ قریب تھا۔

داؤد بروکن فیملی کا بچہ تھا جو انتہائی موٹا تھا اس کے وزن کی وجہ سے سب اسے تنقید کا نشانہ بناتے تھے۔ وہ پڑھائی میں بھی اچھا تھا۔ نانی کے مرنے کے بعد اس کی ماں نے اپنا ٹرانسفر دبئی کروالیا تھا وہ بینک میں ملازمت کرتی تھیں۔

گلے کی اداسی دیکھ کر اسے لگا اس کا باپ شادی کر رہا ہے۔ وہ ان سے سخت ناراض تھا۔

اس کا دوست اسے بتاتا ہے کہ لاریب نے خودکشی کر لی ہے۔ وہ حیران ہو جاتا ہے۔

آدھی رات کو ہری حویلی میں کھٹر پٹر سن کر وہ باہر نکلتا ہے تو اپنے باپ کے ساتھ لاریب کو دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے۔

خوشل لاریب کو اپنے گھر میں دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے۔ وہ ارباب کو فون کرتا ہے لیکن وہ ریسیو نہیں کرتا۔

رفیق کے صاحب اس سے کہتے ہیں کہ لاریب کی تمام تصاویر ان کے گھر سے ہٹا دی جائیں ان کے گھر میں لاریب کا چیپٹر بند ہو جاتا ہے۔

مہر افروز ان کے گروپ میں شامل ہو جاتی ہے داؤد کو لگتا ہے کہ وہ ان کے گروپ کی لڑکیوں میں سب سے خوب صورت ہے۔ فرمان کی اس سے نہیں بنتی۔

خوشل گلے سے کہتا ہے کہ لاریب کو فوراً واپس بھیجو، اسے لگتا ہے کہ وہ اسی چوٹی پر بیٹھا ہے جہاں سے لاریب نے اسے دھکا دیا تھا۔

خان بابا خوشل خان کو بتاتے ہیں کہ اس کا نکاح لاریب سے ہو رہا ہے۔

خوشل کو یاد آتا ہے کہ لاریب ڈرگز لیتی ہے، وہ غصے میں جب لاریب کے پاس آتا ہے تو منہ دکھائی میں سگریٹ دیتا ہے جسے دیکھ کر لاریب کی آنکھوں میں چمک آجاتی ہے۔

خوشل ہاسپٹل پہنچا تو ارباب اس کا رویہ دیکھ کر اسے تنگ کرتا ہے۔ آخر میں کہتا ہے کہ جب تک خوشل اسے بتائے گا نہیں اسے کیسے پتا چلے گا۔ خوشل رونے لگتا ہے اور پھر لاریب سے نکاح کا بتاتا ہے۔

مہر افروز، داؤد پر حاوی ہو جاتی ہے۔ داؤد کی ممی اس سے چڑنے لگتی ہے۔ وہ اس کے کہنے پر لندن چلا جاتا ہے۔ ممی اسے جرمنی بھیجنا چاہتی ہیں۔

مہر اس سلسلے میں داؤد کو مطمئن کر دیتی ہے اور اس کی ممی کو بھی قائل کر لیتی ہے۔

مہر داؤد کے پاس لندن پہنچ جاتی ہے۔ داؤد اپنی ممی کو فون کرتا ہے اور مہر سے بات کرواتا ہے، وہ اسے ڈانٹ دیتی ہیں اور داؤد سے کہتی ہیں کہ وہ واپس آجائے۔ مہر سے بچے اور مہر کے اس کے پاس ہونے پر داؤد سے بھی ناراض ہو جاتی ہیں۔ داؤد فون بند کر دیتا ہے۔ وہ اسے پکارتی رہ جاتی ہیں۔

وہ مہر کو منانے آتا ہے اور ممی کو منانے کا کہتا ہے۔

داؤد اپنی فیملی کو فون کرتا ہے۔ وہ اسے اپنی قربانیاں بتاتی ہیں۔ مہر کہتی ہے کہ وہ دونوں مل کر انہیں منا لیں گے۔

داؤد روتا ہے، اسے اپنی ممی کی قربانیاں خود پر ظلم لگتی ہیں۔ وہ مہر سے کہتا ہے کہ وہ اس سے شادی کر لے، کچھ ہچکچاہٹ کے بعد وہ مان جاتی ہے۔

کورٹ میں فارم فل کرتے ہوئے داؤد کو پتا چلتا کہ مہر افروز کا اصل نام شیریں خلیق ہے۔

داؤد مہر کی شادی ہو جاتی ہے۔ داؤد مہر کے والدین کو منا لیتا ہے۔ اس دوران وہ اپنی ممی کو نظر انداز کر دیتا ہے۔

مہر داؤد سے اس شادی کو سب سے چھپانے کا کہتی ہے اور ماڈلنگ کے لیے دبئی چلی جاتی ہے۔ داؤد اسے روک نہیں پاتا۔

مہر اپنے ٹارگٹ کے بارے میں داؤد کو بتاتی ہے کہ وہ تیس سال کی عمر سے پہلے بہت کامیاب عورت بننا چاہتی ہے، سب کچھ حاصل کرنا چاہتی ہے۔

مہر کے والدین داؤد کی ممی سے مل کر تعلقات بحال کراتے ہیں۔

مہر پریگننٹ ہو جاتی ہے۔ داؤد کی ممی بہت خوش ہوتی ہیں۔ مہر کو لگتا ہے یہ داؤد کی ممی کے تعویذ کی وجہ سے ہوا ہے۔

خان گلے کو مہر کی کہانی سناتے ہیں۔ ارباب، خوشل سے کہتا ہے کہ وہ کتنا سوگ منائے گا۔ خوشل سوچتا ہے کہ صندل بی اس کی مدد کر سکتی ہیں۔

لاریب کمرے میں نہیں۔ گلے پریشان ہوتی ہے۔ لاریب خان کے پالتو کتوں کے پاس ہوتی ہے۔ گلے سوچتی ہے یہ حویلی کی بہو نہیں بن سکتی۔

خان گلے کو صندل بی سے ملوانے لاتے ہیں لیکن گلے انتہائی بے زار ہوتی ہے۔ اسے خان کی آنکھوں سے چھلکتی عقیدت میں چھپا عشق تکلیف دیتا ہے۔ لاریب کو ڈیول کی حرکت اچھی نہیں لگتی کہ وہ خوشل کے قدموں میں لوٹتا ہے۔ خوشل بھی لاریب کو چڑانے کے لیے ڈیول سے کھیلتا ہے۔

واپسی میں گلے حبیب اللہ خان سے کہتی ہے کہ انہوں نے صندل بی سے لاریب کے متعلق بات کیوں نہیں کی، خان اس کی بات انتہائی سختی اور سرد مہری سے رد کر دیتے ہیں۔

تائی شاہدہ، زہرہ اور طیبہ کو ڈانٹتی ہیں۔

شیریں کی ایک خاتون سے ملاقات ہوتی ہے، وہ ایک دینی ادارہ چلا رہی تھیں۔ شیریں ان سے بہت متاثر ہوتی ہے اور داؤد سے کہتی ہے کہ وہ روزانہ چند گھنٹے کے لیے اس ادارے میں جائے گی۔

داؤد شیریں سے کہتا ہے کہ آفس میں ڈنر ہے نو بجے، تم تیار رہنا۔ داؤد شیریں کی تیاری دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے۔ اس نے حجاب کے ساتھ اپنا پورا چہرہ چھپایا ہوا ہے۔ اس کے ہاتھ بھی دستانوں میں قید ہیں۔ داؤد کو شیریں کی کسی بات پر اعتراض نہیں ہوتا۔ داؤد کی ممی کو پتا چلتا ہے تو وہ سخت ناراض ہوتی ہیں۔ شیریں کی فیملی بھی اس سب پر برا مانتی ہے۔

شیریں کے والد بھی اس سب سے خوش نہیں ہوتے، وہ داؤد کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن داؤد شیریں کی خوشی میں خوش تھا۔ گلے، خوشل سے کہتی ہے کہ ہم تمہارے ماموں کے پاس اسلام آباد چلے جاتے ہیں۔ خوشل کہتا ہے وہ مجھے تو رکھ لیں گے لیکن آپ کو نہیں۔

رات کے اندھیرے میں لاریب، ڈیول کی بے وفائی پر اسے پٹرول چھڑک کر آگ لگانا چاہتی ہے۔

## بیسویں قسط

"میں اکثر سوچتی ہوں خوشل! اگر لاریب لڑکا ہوتی تو شاید ان حالات سے نہ گزر رہی ہوتی۔ اس کا باپ اسے کبھی اس طرح پرانی ٹوٹی ہوئی چپل کی طرح گھر سے باہر نہ پھینکتا۔ اور فرض کرو اگر پھینک بھی دیتا تو اسے اس بات کے لیے پابند نہ کرتا کہ کسی ایسے مرد سے نکاح کرو جو تمہیں مسکرا کر دیکھنے تک کا روادار نہ ہو۔ لاریب لڑکی ہے تو یہ سب بھگتنے کے لیے مجبور ہے اور تم کہتے ہو اب زمانہ بدل گیا ہے۔ اچھا مذاق کیا تم نے۔"

وہ ابھی بھی اسی انداز میں بات کر رہی تھی جیسے اس کا کچھ کھو گیا ہو۔ خوش الحان کو اس کے چہرے کے تاثرات میں تاسف اور ملامت کے رنگ گھلے ملے محسوس ہونے لگے۔ وہ چند لمحے بے تاثر نگاہوں سے اس کی جانب دیکھتا رہا۔ اس کے پاس کہنے کے لیے الفاظ تھے لیکن وہ اس قدر بودے تھے کہ اسے پتا تھا وہ کہنے کے بعد بھی شرمندہ ہی ہوگا۔

"تم سمجھتے ہو تمہارے ساتھ بہت زیادتی ہوئی ہے۔ تمہاری شادی زبردستی ایک ایسی لڑکی سے کر دی گئی جس کی شکل سے ہی نہیں۔ نام سے بھی نفرت کرتے ہو تم۔ لیکن کبھی سوچا کہ زیادتی تو اس کے ساتھ بھی ہوئی ہے۔ بچپن سے لے کر اب تک وہ ان چاہی رہی اور پھر اس کو جیون ساتھی بھی ایسا ملا جسے اس سے محبت ہی نہیں ہے۔ تم اپنے ماں باپ کے سامنے اس سے نفرت کا اظہار کر سکتے ہو۔ اپنے دوستوں کو اپنے ساتھ ہونے والی اس ناانصافی کے بارے میں بتا سکتے ہو جبکہ اس نے تو آج تک کسی کے سامنے یہ تک نہیں کہا کہ تم اسے بھی اچھے نہیں لگتے۔"



مسلسل اسے شرمندہ کیے جا رہی تھی۔ خوش الحان نے گہری سانس بھری۔

"گلے یار! اتنا گلٹ مت دو مجھے کہ میں جو سوچ رہا ہوں، وہ کرنے کا ارادہ ترک کر دوں۔ مجھے احساس ہے کہ اس کے ساتھ بھی کچھ اچھا نہیں ہوا۔ لیکن اس میں میرا کیا قصور ہے۔ میں نے تو کبھی اس کے ساتھ کچھ برا نہیں کیا حالانکہ وہ مجھے نقصان پہنچاتی رہی ہے۔ اس کے باوجود میں اس کا بھلا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ چیزیں نارمل ہو جائیں۔ اس کے لیے بھی اور ہم سب کے لیے بھی۔ اس سے زیادہ اور کیا کروں میں۔ میں بھی فرشتہ تو نہیں ہوں۔"

وہ الجھے ہوئے انداز میں بولا تھا۔ گلے کے چہرے پر چھائے ملامتی رنگ بدلے نہیں تھے

"میں کب کہہ رہی ہوں کہ فرشتہ بنو۔ لیکن بحیثیت مردم اس کے لیے کچھ تو کر ہی سکتے ہو۔ تمہارے پاس اختیار ہے۔ تم مضبوط ہو۔" وہ ناراض سی لگنے لگی تھی۔

"میں کوشش کر رہا ہوں گلے۔" خوش الحان نے ناپسندیدگی سے کہا تھا۔ اس کو یہ پند و نصائح والا موضوع اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

"کوشش نہیں کر رہے۔ صرف سوچ رہے ہو کہ کوشش کرو گے۔"

جملہ ابھی اس کے منہ میں ہی تھا کہ ایک چیختی ہوئی آواز نے ان دونوں کو چونکا دیا۔ گلے تو یک دم اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ آواز مسلسل آ رہی تھی۔

"یہ۔ یہ کیا ہو رہا ہے۔؟" وہ گھبرا گئی تھی۔ خوش الحان نے جست لگا کر دروازے تک کا فاصلہ طے کیا تھا۔

"تم بیٹھو۔ میں دیکھتا ہوں۔ لاریب کی آواز ہے۔" وہ ترنت باہر نکل گیا تھا۔

"اللہ خیر۔" گلے نے دل پر ہاتھ رکھتے ہوئے تیزی سے اس کی پیروی کی تھی۔ آوازیں لاریب کے کمرے سے ہی آتی لگ رہی تھیں۔ وہ اور خوش الحان آگے پیچھے ہی وہاں تک پہنچے تھے۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ کمرے کا دروازہ بند نہیں تھا مگر روشنیاں گل تھیں۔ خوش الحان اندر داخل ہونا ہی چاہتا تھا کہ گلے نے اسے روکا

"ایک منٹ۔ مجھے دیکھنے دو۔" خوش الحان اس کا اشارہ سمجھ کر باہر ہی رک گیا تھا۔ گلے عجلت بھرے انداز میں اندر داخل ہوئی اور اگلے ہی لمحے کمرے کی کھڑکی سے روشنی باہر تک آنے لگی تھی۔ گلے نے آگے بڑھ کر اس کے بستر کی جانب دیکھا تھا۔ وہ اب زور زور سے رو رہی تھی مگر اس کی حالت ٹھیک کی۔ گلے نے آگے بڑھ کر اسے گلے لگانا چاہا۔ اس نے ذرا بھی مزاحمت نہ کی تھی۔ وہ کچھ کہنے کی کوشش بھی کر رہی تھی لیکن اس کے الفاظ مبہم تھے۔

"خوش الحان! اندر آ جاؤ۔" گلے کے لیے اسے سنبھالنا مشکل نہیں تھا لیکن وہ گھبرا گئی تھی اسی لیے اسے مدد درکار تھی۔

خوش الحان اگلے ہی لمحے کمرے کے اندر تھا۔ لاریب نے گلے کو کافی زور سے پکڑ رکھا تھا لیکن اب اس کے واویلا کرنے میں پہلی سی شدت نہیں رہی تھی خوش الحان نے سوالیہ انداز میں گلے کی جانب دیکھا۔

"خواب میں ڈر گئی ہے شاید۔ کچھ بول رہی ہے مگر سمجھ میں نہیں آ رہا" وہ اتنا ہی کہہ سکی۔

لاریب کی ہلکی ہلکی سسکیاں ابھی واضح سنائی دے رہی تھیں لیکن وہ حواسوں میں نہیں تھی۔ اس سے پہلے کہ خوش الحان کچھ کہتا یا کرتا۔ دروازہ ایک دم کھلا تھا اور حبیب اللہ خان اندر داخل ہوئے تھے۔ ان کی آنکھوں میں نیند کے آثار نہیں تھے لیکن چہرے پر ناگواری کے تاثرات تھے۔ انہوں نے کوئی سوال نہیں کیا تھا بلکہ وہ سیدھے لاریب کے بستر کی جانب بڑھے تھے۔

"گل لالہ! آپ پیچھے ہٹ جائیں۔" انہوں نے تحکمانہ انداز میں کہا تھا۔ تب ہی خوش الحان کو اندازہ ہوا کہ ان کے ہاتھ میں سرنج تھی۔ انہوں نے گلے کو بستر سے اٹھنے تک کا وقت نہیں تھا۔ وہ آگے بڑھے تو سرنج میں موجود دوا لاریب کے بازو میں منتقل کر دی تھی۔ اگلے چند لمحے خاموشی میں گزر گئے تھے۔ کسی نے کسی سے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ سب لاریب کی جانب دیکھ رہے تھے۔ اس کی سسکیاں مدھم ہوتی جا رہی تھیں۔

"اسے بستر پر لٹا دیں۔" حبیب اللہ خان نے گلے کو دوسرا حکم دیا۔

اس نے فوراً تعمیل کی تھی۔ لاریب کا چہرہ یک دم اس کی آغوش سے نمایاں ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر اذیت کے آثار تھے لیکن وہ غنودگی میں اترتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

"یہ ٹھیک ہے اب۔ آپ لوگ اپنے اپنے کمروں میں جا سکتے ہیں" انہوں نے تیسرا حکم جاری کیا تھا۔ گلے فوراً اپنی جگہ سے نہیں اٹھی تھی۔

"آپ لوگ جائیں۔ میں آتی ہوں۔" وہ کچھ دیر وہیں بیٹھنا چاہتی تھی۔

"آپ کی اپنی طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے۔ خود کو بیکار میں مت تھکائیں۔ اس بچی کے ڈرامے ختم نہیں ہو سکتے۔ بہتر ہو گا اسے سونے دیں اور خود بھی آرام کریں۔"

حبیب اللہ خان کی آواز میں بیزاری سی بیزاری تھی۔ خوش الحان اور گلے نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا

"میں نے کہا نا، میں آ جاتی ہوں۔" "آپ لوگ جائیں۔ وہ بضد تھی۔ حبیب اللہ خان نے گہری سانس بھری اور باہر نکل گئے تھے پھر انہوں نے مڑ کر خوش الحان کی جانب دیکھا جو وہیں اپنی جگہ پر جما کھڑا تھا۔

"یہ اب اگلے چوبیس گھنٹے کسی کو پریشان نہیں کرے گی۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔"

انہوں نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ ان کی آواز نے اس کے قدموں میں جان ڈال دی تھی۔ وہ بھی باہر آ گیا تھا پھر اس نے آہستگی سے دروازہ مکمل بند کر دیا تھا۔ اسے پریشانی کیا ہوتی تھی۔ اسے صرف ترس آتا تھا اس لڑکی پر، بے حد ترس۔ وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا خان بابا کے پیچھے چل دیا تھا پھر اسے جانے کیا خیال آیا۔

"بابا! آپ نے اسے کیا انجیکٹ کیا۔؟" خان بابا کے قدم لمحے بھر کو رکے پھر وہ دوبارہ سے پہلے کی طرح آگے بڑھتے ہوئے بولے تھے۔

"اس کی دوا ہے۔ پاگل پن کے دورے میں ڈاکٹر یہی دوا دیتے ہیں۔" کوئی اور وقت ہوتا تو خوش الحان لفظ "پاگل پن" پر ضرور خوش ہوتا مگر اب اسے تاسف ہوا تھا۔

"یہی تو پوچھا ہے میں نے۔ کون سی دوا دی ہے اسے۔؟" خان بابا کے قدم تھم گئے تھے۔ خوش الحان نے کبھی ایسی جرح نہیں کی تھی ان سے۔ وہ بدل رہا تھا۔ اور یہ تبدیلی انہیں پسند نہیں آ رہی تھی۔

"یہ پنچایت صبح بھی لگائی جا سکتی ہے لیکن اگر تمہیں تسلی نہیں ہو رہی تو ابھی اس کے کمرے میں جاؤ۔ سب نسخے وہیں پڑے ہیں اس کے۔ تم چیک کر سکتے ہو کہ ڈاکٹر نے کیا تجویز کر رکھا ہے۔ میں رات کے وقت درد کرتے سر کے ساتھ ان سوالوں کے جواب دینے سے قاصر ہوں۔ معذرت۔" وہ دو ٹوک انداز میں بولے اور اندر کی جانب بڑھ گئے۔ خوش الحان انہیں جاتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ گفتگو کا یہ انداز بہت تکلیف دہ تھا۔

☆☆☆

درس گاہ نور القلوب میں ایسی صبح بہت مختلف تھی۔ سب ایک دوسرے کے سامنے کچھ بھی کہنے سے کترا رہے تھے لیکن اندر ہی اندر جیسے سب کو خبر ہو گئی تھی کہ زہرہ کا حویلی والے کسی مرد سے کوئی رنگین قسم کا معاملہ تھا



جس کی وجہ سے ماحول بگڑا بگڑا سا تھا۔ یہ بات بھی سب کو ہی پتا تھی کہ حویلی والوں پر صندل بی بے حد مہربان ہیں۔ اب اصول پرست انتہائی دین دار صندل بی اس سارے معاملے کو کیسے سلجھائیں گی اس سوال کا جواب سب ہی جاننا چاہتے تھے۔ شاہدہ تائی تو اپنا سامان سمیت کر چلی گئی تھیں لیکن جاتے جاتے وہ نورالقلوب کے در و دیوار بھی ہلا گئی تھیں۔ بہت سی باتیں جو صندل بی کے احترام میں وہ کبھی کسی سے نہ کہتی تھیں، وہ سب باتیں انہوں نے چند ایک لڑکیوں کے گوش گزار کر دی تھیں۔

انہیں پتا تھا کہ یہ نیٹ ورک کافی اچھے طریقے سے کام کرے گا اور صندل بی کی ساکھ کو ٹھیس نہ بھی لگ سکی تو ہلکی ضرب تو ضرور ہی لگ جائے گی۔ صندل بی کو کسی نے کبھی ایسے چیلنج نہ کیا تھا۔ ایک تو وہ اس صورت حال سے کافی برہم تھیں دوسرا تائی شاہدہ نے جو کام اپنے ذمے لے رکھے تھے۔ وہ بھی سب چوپٹ ہو گئے تھے۔

یہ بات تو وہ مانتی تھیں کہ شاہدہ تائی ایک بہت ہی محنتی اور چاق و چوبند خاتون تھیں جو بہت سے کام بنا کہے ہی نبٹا دیتی تھیں۔

صندل بی کے ساتھ سب طالبات لڑکیوں کا تعلق سرسری سا تھا۔ وہ ان کی فرمانبردار تھیں، ان کے احکامات کو دھیان سے سنتی تھیں اور مانتی بھی تھیں لیکن وہ سب ان سے ڈرتی بھی تھیں جبکہ تائی شاہدہ کے ساتھ ان سب کو محبت بھی تھی۔ ان سے ڈانٹ کھانے کے باوجود وہ سب اپنی باتیں بھی ان سے شیئر کرتی آئی تھیں۔ صندل بی سے کوئی بات منوانی ہوتی تھی تو پہلے تائی شاہدہ تک بات پہنچائی جاتی تھی۔ اسی لیے حالات یکدم بگڑ سے گئے تھے۔

صندل بی نے حویلی کے نظم و نسق کو تو دوسری قاریہ خواتین کی مدد سے سنبھال لیا تھا مگر اب مرحلہ تھا ساری درس گاہ کے سامنے اپنے وقار کو بحال کرنے کا۔ وہ کبھی یہ برداشت نہیں کر سکتی تھیں کہ ان کو کمزور سمجھا جائے یا ان کی خودساختہ سپر پاور قسم کی روحانی شخصیت کے متعلق کوئی سوال کھڑا کیا جائے۔ ایسی ہر قسم کی صورت حال میں ہمیشہ حبیب صاحب نے ہی ان کی مدد کی تھی اور اب تو معاملے میں ہری حویلی براہ راست ملوث تھی اگرچہ صندل بی کو اس بات پر بے حد رنج تھا مگر انہوں نے کال بھی حبیب اللہ خان کو ہی کی تھی۔

☆☆☆

حبیب اللہ خان ناشتہ کرنے کے بعد سے ہی اپنے آفس نما کمرے میں آ بیٹھے تھے۔ رات لاریب کی وجہ سے ان کی نیند نہیں پوری ہو سکی تھی۔ اس وجہ سے سر میں بھی درد تھا جو چائے پینے کے باوجود کم نہ ہوا تھا۔ وہ اب اس لڑکی کی حرکتوں سے عاجز آنے لگے تھے۔ اس سے پہلے جب وہ ان کے یہاں حویلی میں نہیں رہتی تھی تو بھی وہ ان ہی کی ذمہ داری تھی لیکن وہ ذمہ داری اس ذمہ داری سے کافی مختلف تھی جو وہ اب نبھا رہے تھے۔

مہینے میں ایک دو بار اس "دماغی مریضہ" سے مل کر اسے اپنے ہی باپ کے خلاف اکسانے اور الٹی سیدھی حرکتیں کرتے رہنے پر مائل کرنے اور پھر اس کی حمایت کرنے میں جبکہ اپنے گھر میں اپنی سپرویژن میں اس کے ساتھ رہنے میں اس کی من مانیاں برداشت کرنے میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ اس کے علاوہ وہ اب ان کے لیے "سودمند" بھی نہ رہی تھی جب صندل بی کو ہی اپنی بیٹی میں دلچسپی نہیں تھی تو وہ کیوں یہ تعلق نبھاتے چلے جاتے۔

وہ سوچ چکے تھے کہ وہ بہت جلد اسے واپس شہر اس کے باپ کے پاس بھجوا دیں گے۔

انہیں یقین تھا کہ خوش الحان ان کے اس فیصلے میں کبھی رکاوٹ نہیں بنے گا کیونکہ اسے تو اس لڑکی میں ذرا بھی دلچسپی نہ تھی لیکن اس سب کے باوجود اس نے اچانک پہلی مرتبہ ان سے لاریب کو دیے جانے والے "انجکشن" کے متعلق سوال کر کے انہیں چونکا دیا تھا۔ وہ اس کے لہجے میں چھپے تجسس اور طنز کو محسوس کر کے بہت

عجیب سی الجھن کا شکار تھے۔ وہ ان کا بیٹا تھا اور اس نے پہلے کبھی ایسے ان کو روک کر کبھی کچھ نہیں پوچھا تھا۔ ان کے یہاں یہ بدتمیزی شمار ہوتی تھی اور ان کا بیٹا بدتمیز تو نہیں تھا۔ صوفہ کم بیڈ پر ڈھیلے سے انداز میں بیٹھے وہ کب سے اس نکتے پر سوچ رہے تھے۔

"وہ کیا ہے جو اسے بدتمیز بنا رہا ہے۔ اسے بدل رہا ہے۔ کہیں پیار محبت کا قصہ تو نہیں چھڑ گیا۔ جوان مرد ہے۔ لڑکی بھی خوبرو ہے۔ ایک ہی گھر میں رہتے ہیں اور پھر باہمی رشتہ انہیں یہ حق بھی دیتا ہے۔ مگر۔" اس "مگر" کے آگے وہ مزید نہیں سوچنا چاہتے تھے۔

"نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ ہونا ہی نہیں چاہیے۔ میں نے چیزوں کو ایسے ترتیب دیا ہی نہیں تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ اس کی جانب مائل ہو مگر یہ سب میں اس لیے کر رہا تھا کہ صندل بی میری ان کوششوں کو سراہیں۔ میری معترف ہوں مگر اب تو یہ سب بے کار ہے۔ وہ لڑکی میرے بیٹے کے نکاح میں تو رہ سکتی ہے لیکن میری اگلی نسل ایک پاگل لڑکی کی گود میں پلے یہ تو نہیں ہونے دوں گا میں۔"

وہ گہری سانس بھر کر خود ہی اپنی سوچ کی نفی کرنے میں مگن تھے۔ اسی دوران دروازے پر دستک ہوئی۔ انہوں نے چونک کر سامنے دیکھا۔

"خان! آپ نے مجھے بلایا تھا؟" وراثت نے کمرے کے دروازے کے باہر کھڑے کھڑے مؤدبانہ انداز میں پوچھا تھا۔ اس کے اور خان کے درمیان جب سے لاریب کے متعلق گفتگو ہوئی تھی۔ تب سے ہی ایک عجیب سا فاصلہ ان کے بیچ حائل ہو چکا تھا۔ وراثت کو لگتا تھا کہ خان نے اس کی توہین کی ہے جبکہ حبیب اللہ خان کو اس کی جسارت پر غصہ تھا۔

"ہاں۔ وراثت۔ اندر آؤ۔" ان کا انداز معمول کے مطابق تھا اور اس میں خفگی نہیں تھی۔ وراثت اندر داخل ہو گیا تھا۔

"تم کل درس گاہ گئے تھے۔؟" انہوں نے پوچھا۔ وراثت نے ناسمجھی کے عالم میں ان کا چہرہ دیکھا پھر نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

"میں تو ہمیشہ تب ہی جاتا ہوں جب آپ لے جاتے ہیں یا پھر کسی کام کے سلسلے میں جانے کو کہتے ہیں۔؟"

"خوش الحان کو نہیں لے گئے تھے تم۔؟" انہوں نے جان بوجھ کر لاریب کا نام نہیں لیا تھا۔ انہیں اندازہ تھا کہ شاید خوش الحان درس گاہ نہیں گیا تھا لیکن وہ وراثت سے تصدیق کروانا چاہ رہے تھے۔ انہیں تجسس تو لاحق تھا کہ پتا چلے خوش الحان اور صندل بی کے درمیان کیا گفتگو ہوئی مگر وہ براہِ راست اپنے بیٹے سے نہیں پوچھنا چاہتے تھے۔ وراثت کندھے اُچکا کر بولا۔

"نہیں خان! میں نہیں لے گیا تھا چھوٹے خان کو۔؟" اس نے دو مزید قدم آگے کی جانب بڑھانے چاہے۔

"ٹھیک ہے، تم جا سکتے ہو۔" خان کا لہجہ یکدم بدل گیا تھا۔ وہ واپسی کے لیے مڑا تھا۔ حبیب اللہ خان اس کی پشت کی جانب دیکھتے رہے تھے پھر انہوں نے اسے دوبارہ پکارا تھا۔

"وراثت۔" وہ ٹھٹک کر رکا۔ خان کو عقب سے آواز دینا بھی پسند نہیں رہا تھا۔ وہ پلٹ کر آیا تھا۔

"بیٹھ جاؤ۔" دوسرا حکم جاری کیا گیا۔

"کیسے ہو۔ خاندان میں کیا چل رہا ہے؟" یہ بھی بہت نایاب تھا کہ خان اس قسم کے سوال پوچھیں۔ وراثت مزید الرٹ ہو گیا پھر سر ہلا کر بولا۔



"سب اچھا ہے خان۔ راضی بازی ہیں سب ایک دوسرے سے۔" اس کا مطلب تھا کہ آج کل خاندانی دشمنیاں ٹھنڈی پڑی ہوئی ہیں۔

"اچھی بات ہے۔ یہاں بھی راضی بازی رہنے دو سب کو۔ خوامخواہ کی الجھنوں سے بچ کر چلو۔ یہ عورت ذات کے جھنجھٹ دماغ پلپلا کر دیتے ہیں مرد کا۔" وہ اشاروں میں اسے سمجھا رہے تھے کہ فون پر دوستیاں لگانا بند کر دو۔

"جی خان۔" اس نے سر ہلایا تھا۔ ملازموں والے سارے میز ز آتے تھے اسے۔ مالک کی کسی بھی بات سے انکار کرنا اس نے سیکھا ہی نہیں تھا۔

"یہ کاغذ پکڑو۔ اور وہ اپنا مشغلے والا نمبر لکھو" حبیب اللہ خان نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ وراثت نے کاغذ ان کے ہاتھ سے لے کر قلم میز پر سے اٹھایا تھا اور وہ نمبر بنا موبائل جیب سے نکالے لکھ دیا تھا۔ حبیب اللہ خان نے تیزی سے چلتے اس کے ہاتھوں کو بغور دیکھا تھا پھر استہزائیہ انداز میں ہنسے تھے۔

"زبانی یاد کر رکھا ہے۔" وراثت شرمندہ ہوا مگر پھر بھی کچھ نہیں بولا۔

حبیب اللہ خان نے چٹ اس کے ہاتھ سے پکڑ کر بغور دیکھی۔ وہ لاریب کا نمبر نہیں تھا لیکن انہیں حیرت نہیں ہوئی کیونکہ یہ بات تو وہ جانتے ہی تھے۔ لاریب کا موبائل تو ویسے بھی ان کے کمرے میں بیڈ کی سائیڈ ٹیبل میں پڑا رہتا تھا۔ وہ چند لمحے اسی طرح اس چٹ کی جانب دیکھتے رہے۔ ان کا ذہن کچھ سوچنے میں مگن تھا لیکن میز پر پڑے ان کے اپنے فون کی تھرتھراہٹ نے انہیں سوچ سے باہر نکال پھینکا تھا۔

صندل بی کا نام دیکھ کر وہ نا چاہتے ہوئے بھی الرٹ ہو گئے تھے کیونکہ یہ ان کی سرشت میں شامل ہو چکا تھا۔ وراثت نے بھی وہ نمبر دیکھا تھا اور وہ پڑھنا لکھنا نہیں جانتا تھا لیکن نمبر زا سے ازبر رہتے تھے۔ وہ جانتا تھا یہ کال کس کی ہے۔

"تم جاؤ۔" حبیب اللہ خان نے کہا تھا۔ وراثت اٹھ کر باہر کی جانب چل دیا تھا۔

"ہمارے مشغلے۔ اور آپ کی عبادت۔ واہ خان واہ۔" وہ دروازے کے باہر بنے آخری چبوترے سے اترتے ہوئے بڑبڑایا تھا۔

☆☆☆

گاڑیوں کی لمبی قطار میں ان کی جیپ جیسے پھنس سی گئی تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر حبیب اللہ خان تھے اور ایسا لگتا تھا یہ صورتحال انہیں جھنجھلاہٹ میں مبتلا کر رہی ہے۔ وہ منہ سے کچھ نہیں کہہ رہے تھے لیکن اسٹیئرنگ پر رکھا ان کا ہاتھ جس اضطرابی انداز میں حرکت کر رہا تھا اس سے خوش الحان کو اندازہ ہو رہا تھا کہ کوئی مسئلہ ہے۔

وہ ان کے ساتھ پہلی بار گاڑی میں نہیں بیٹھا تھا اور نہ ہی وہ پہلی بار اس طرح ٹریفک جام میں پھنسے تھے لیکن خان بابا کا رویہ عجیب ہی تھا۔ یہ تو وہ اسے بتا چکے تھے کہ وہ درس گاہ صندل بی سے ملنے جا رہے ہیں لیکن اس میں پریشانی والی کیا بات تھی۔ یہ معمہ خوش الحان سے سلجھایا نہیں جا رہا تھا۔

"مجھ سے کیوں ملنا چاہتی ہیں صندل بی۔ کیا آپ نے انہیں لاریب کے بارے میں بتا دیا؟۔" اس نے بالآخر پوچھ لیا تھا۔ وہ چونکے پھر اس کا چہرہ دیکھا اور دوبارہ سڑک کی جانب متوجہ ہو کر بولے۔

"نہیں۔" انہوں نے گردن ہلائی تھی۔

"انہیں خود ہی پتا چل گیا۔؟ تب ہی وہ مجھ سے ملنا چاہتی ہیں۔ ورنہ پہلے کبھی اس طرح ایمرجنسی میں ملاقات تو نہیں کرتیں وہ۔ ایک طرح سے اچھا ہی ہوا۔ کم از کم لاریب کی زندگی میں کچھ توازن تو آئے گا۔ ان کی سپرویژن میں رہے گی تو اس کی طبیعت بھی ٹھیک ہونے لگے گی۔"

وہ سادہ سے انداز میں کہہ رہا تھا تاکہ وہ پُرسکون ہو جائیں لیکن حبیب اللہ خان اس کے انداز پر خوش نہیں تھے۔ وہ فوراً کچھ نہیں بولے پھر انہیں احساس ہوا کہ خوش الحان مسلسل ان کی جانب دیکھ رہا ہے تو بولے۔

"تمہیں پرواہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے میرے بیٹے۔ میں ہوں نا۔ میں سنبھال لوں گا سب کچھ۔" انہوں نے تسلی دی تھی۔ خوش الحان نے ان کی جانب دیکھا۔ دونوں باپ بیٹے نے سن گلاسز لگا رکھے تھے اور دونوں ہی نہیں دیکھ سکتے تھے کہ ان کی آنکھوں کے رنگ میں ایک دوسرے کے لیے بے یقینی تھی جو پہلے کبھی اتنے سالوں میں نہ پیدا ہوئی تھی۔

"کیسے۔؟ کیسے ہوگا سب۔ آپ کچھ بتائیں تو سہی۔ آپ اپنے منہ سے بتائیں گے تو اچھا لگے گا مجھے۔"

خوش الحان نے گہری سانس بھر کر کہا تھا۔ اس کا لہجہ کتنا مشکوک تھا۔ حبیب اللہ خان کے دل کو چوٹ لگی انہوں نے الجھ کر اس کی جانب دیکھا۔ سن گلاسز نے اب بھی ان کا بھرم قائم رکھنے میں مدد کی۔ وہ خوش الحان کے رویے سے پریشان ہونے لگے تھے۔ وہ اتنے سوال کیوں کرنے لگا تھا۔ وہ پہلے ہی صندل بی کے الجھے ہوئے رویے سے پریشان تھے۔ خوش الحان کی باتیں انہیں مزید اکتاہٹ میں مبتلا کر رہی تھیں۔ وہ چند لمحے کچھ نہیں بولے پھر جیسے انہیں خیال یا تھا کہ جواب نہ دینے میں بھی ان کی بڑائی کو ٹھیس پہنچتی ہے تو تسلی دینے والا انداز اپنا کر بولے۔

"میں نے کہا نا۔ میں سنبھال لوں گا۔ تم پریشان مت ہو۔" خوش الحان بھی چند لمحے سامنے ونڈ اسکرین سے نظر آنے والی سڑک کو دیکھتا رہا پھر اس نے مزید کچھ کہنا چاہا لیکن خان بابا کے چہرے کے سپاٹ نظر آنے والے تاثرات نے اسے خاموش رہنے کا عندیہ دیا تھا۔ باقی کا سفر خاموشی سے کٹا۔

☆☆☆

"سب خیریت ہے۔؟" ان دونوں کو صندل بی کے کمرے میں بیٹھے چند لمحے ہی گزرے تھے کہ وہ اپنے مخصوص دودھیا سفید گاؤن اور نقاب کے ساتھ اندر داخل ہوئی تھیں۔

خوش الحان نے چونک کر باپ کا چہرہ دیکھا۔ صندل بی نے ایک لفظ بھی منہ سے نہیں نکالا تھا لیکن خان بابا شاید ان کی چال سے ہی اندازہ لگا چکے تھے جب ہی اس قدر دردمندی سے ان کی خیریت پوچھ رہے تھے لیکن جو بھی تھا خوش الحان کو حیرانی ضرور ہوئی۔ اس نے کبھی ان کو کسی کی جانب اتنا مائل نہیں دیکھا تھا کہ وہ اس کے دل کا حال جان لیتے۔

"اللہ والوں کی جانب ہمیشہ خیریت ہی ہوا کرتی ہے۔ پریشانیاں انہیں پریشان کرنے میں ناکام ہوجایا کرتی ہیں۔ اللہ والے مصائب سے نہیں گھبرایا کرتے حبیب صاحب!" وہ اپنی نشست پر بیٹھتے ہوئے اطمینان سے بولی تھیں۔

"آپ کی فون کال نے مجھے پریشان کر دیا تھا۔" حبیب اللہ خان بیٹے کی موجودگی میں اس نصیحت پر کچھ جزبز ہوئے تھے۔ صندل بی نے جواباً گہری سانس بھری۔

"میں نے کچھ ایسا کہا تو نہیں تھا۔ لیکن خیر۔" وہ لمحہ بھر کو رُکی تھیں۔

"یہ اچھا کیا آپ نے کہ اپنے بیٹے کو ساتھ لے آئے۔"

وہ اب خوش الحان کی جانب دیکھ رہی تھیں۔ حبیب اللہ خان کو اب یقین ہو گیا کہ ان کا شک صحیح ہے۔

"یہ یقیناً لاریب اور خوش الحان کے نکاح کے متعلق جان گئی ہیں۔ اس لیے ناراض نظر آتی ہیں۔"

یہ سوچ سارا راستہ ان کے ہمراہ رہی تھی۔ یہ کچھ نہ کچھ جانتی ہیں تب ہی انہوں نے خوش الحان کو "اپنے بیٹے" کہا ورنہ وہ ہمیشہ اس کے لیے بہت شفقت بھرا لہجہ اپناتی ہیں" وہ سوچ رہے تھے جبکہ صندل بی کی نگاہوں کا مرکز خوش الحان تھا اور مخاطب وہ حبیب اللہ خان سے تھیں۔

"میں آپ کو بھی اس طرح نہ بلواتی۔ اگر معاملہ بیٹی کا نہ ہوتا۔" ان کا دوسرا جملہ حبیب اللہ خان کو ہی نہیں خوش الحان کو بھی الرٹ کر گیا۔

"حبیب صاحب! بہت تکلیف دی ہے آپ نے مجھے۔ مجھے آپ سے یہ امید نہیں تھی۔" وہ مزید کہہ رہی تھیں۔ خوش الحان نے باپ کی جانب دیکھا پھر اسے لگا کہ اسے کچھ کہنا چاہیے۔

"بابا کا کوئی قصور نہیں ہے۔ بابا تو خود۔" وہ کہنا چاہتا تھا کہ اس کے بابا داؤد منور کی وجہ سے مجبور تھے مگر صندل بی نے اس کی بات کاٹی۔ وہ برہم تھیں اور ان کو غصے میں کسی کی بات سننے کی عادت نہیں تھی۔

"تم خاموش رہو۔ تم سے تو بات بھی نہیں کرنا چاہتی میں۔ پہلے زمین سے پوری طرح اُگ جاؤ۔ پھر مخاطب ہونا مجھ سے۔" وہ درشتی سے بولی تھیں۔ حبیب اللہ خان اور خوش الحان دونوں ہی ساکت رہ گئے۔ خوش الحان کو ان کا انداز بالکل پسند نہیں آیا تھا۔

"ان کو یقیناً کچھ نہ کچھ بھنک پڑ چکی ہے۔ اسی لیے اتنی خفا ہیں" اب ان دونوں نے ایک ساتھ سوچا تھا لیکن دونوں ہی خاموشی سے ان کا چہرہ دیکھتے رہے کہ وہ خود ہی مزید آگے گفتگو کریں تاکہ پتا چل سکے کہ انہیں کیوں بلوایا گیا ہے۔

لیکن انہوں نے دروازے کے باہر کی جانب کھڑی ایک لڑکی کو کچھ اشارہ کیا تو اگلے ہی لمحے وہ ایک پوٹلی نما لڑکی کو کمرے کے اندر کی جانب لے آئی تھی۔ اس کے آدھے سر پر دوپٹہ تھا اور اس کے بال دوپٹے سے جھانکتے محسوس ہو رہے تھے۔ حبیب اللہ خان ہی نہیں خوش الحان بھی چونک اٹھا۔ درس گاہ میں چھوٹی بچیوں کے علاوہ کبھی کوئی لڑکی بے حجاب نظر نہ آئی تھی اور اس حلیے میں تو بالکل بھی نہیں۔ وہ لڑکی دوپٹے کے ایک کونے سے چہرہ چھپانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔

"اس کا دوپٹہ نیچے کرو۔" انہوں نے لڑکی سے کہا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر اس کا دوپٹہ چہرے سے نیچے کرنا چاہا۔

"یہ مت کریں صندل بی۔ یہ مت کریں۔" دوسری لڑکی نے گھگھیا کر التجا کی تھی۔

"اتنی اللہ والی مت بنو زہرہ۔ تمہاری اوقات پتا چل چکی ہے سب کو۔ جتنی ہو اتنی ہی نظر آؤ۔" انہوں نے اسے ڈپٹا تھا اور پھر خود اٹھ کر درشتی سے اس کا دوپٹہ چہرے سے ہٹا ڈالا۔ اس لڑکی نے گردن بالکل جھکا لی تھی۔ خوش الحان نے الجھ کر باپ کی جانب دیکھا۔

اس کی بالکل سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ حبیب اللہ خان کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔ وہ سمجھ نہیں پایا کہ وہ بھی اسی کی طرح سوالیہ نشان بنے ہوئے ہیں، اپنے تاثرات چھپانے میں کامیاب ہیں یا پھر ان کے لیے یہ معمول کی بات ہے۔

"آپ اسے جانتے ہیں۔؟" اب کی بار انہوں نے براہِ راست خوش الحان سے سوال کیا تھا۔ وہ ہڑبڑایا۔

"میں کیسے جان سکتا ہوں۔ میں نے تو انہیں پہلے کبھی دیکھا بھی نہیں۔" اسے یہ ساری صورت حال بالکل اچھی نہیں لگ رہی تھی۔

"تم انہیں جانتی ہو زہرہ۔؟" انہوں نے دوسرا سوال اس لڑکی سے کیا تھا۔ اس کے چہرے پر پہلے ہی ایسے تاثرات تھے جیسے وہ انتہائی تکلیف برداشت کر رہی ہو۔ صندل بی نے اپنا رُخ مکمل اس کی جانب موڑا۔

"میں نے کچھ پوچھا ہے زہرہ۔؟" وہ غرائی تھیں۔ لڑکی خوف سے لرزتے ہوئے اونچا اونچا رونے لگی۔

ماحول کا رنگ زرد پڑنے لگا۔ حبیب اللہ خان نے خوش الحان کی جانب استفہامیہ انداز میں دیکھا۔ اسے
بڑا عجیب لگا۔ یہ تو اس کے کردار پر سوالیہ نشان تھا۔

"یہ سب کیا ہو رہا ہے۔؟" خوش الحان اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"جب میں نے کہہ دیا کہ میں انہیں نہیں جانتا تو انڈرا سٹوڈ سی بات ہے کہ وہ بھی مجھے نہیں جانتیں۔" وہ ناراضی بھرے لہجے میں بولا تھا۔ صندل بی کا بہت احترام کرتا تھا لیکن ان کے بارے میں جو باتیں وہ
سن چکا تھا۔ داؤد منور سے ان کے اور صندل بی کے ماضی کے متعلق سن کر جو حقائق اس کے سامنے آئے تھے
اس کی وجہ سے سارا احترام جیسے ختم ہو کر رہ گیا تھا اور آج ان کا غیر انسانی رویہ دیکھ کر وہ مزید متنفر ہو رہا تھا۔ اس
کے دل میں ان کے لیے مزید عزت باقی نہ رہی تھی۔

"نہیں۔ یہ انڈرا سٹوڈ سی بات نہیں ہے۔ اس لڑکی کا کہنا ہے کہ آپ کا اور اس کا افیئر ہے۔ آپ اسے
میسج کرتے ہیں اور آپ دونوں کے درمیان رات رات بھر گفتگو ہوتی ہے۔" ان کی توپوں کا رخ اب خوش
الحان کی جانب تھا۔ وہ ہکا بکا رہ گیا۔

"یہ کیا بکواس ہے۔ میں تو انہیں جانتا تک نہیں۔ آج آپ کے یہاں پہلی بار دیکھ رہا ہوں انہیں۔" اس
کا لہجہ خود بخود گستاخ ہو گیا تھا۔

اب کی بار حبیب اللہ خان پہلے سے زیادہ چونک اس لڑکی کو دیکھنے لگے۔ وراثت نے بھی کچھ اس قسم کی
شکایت کی تھی۔ یہ ایک ہی طرح کا معاملہ لگتا تھا۔ صندل بی کی آنکھیں مزید سرخ نظر آنے لگی تھیں۔

"خوش الحان۔" حبیب اللہ خان نے گھر کنے والے انداز میں اسے پکارا تا کہ وہ چپ رہے پھر صندل
بی کی جانب دیکھتے ہوئے بولے۔

"اگر مناسب سمجھیں تو ذرا تفصیل سے بتائیں۔ آپ کو کوئی غلط فہمی ہو سکتی ہے۔ مجھے چند دن پہلے وراثت
نے ایسی ہی ایک بات بتائی تھی۔ مجھے لگتا ہے۔" وہ اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ ان کی بات کاٹ دی گئی۔

"میں آپ کو شکل سے پاگل نظر آتی ہوں۔ غلط فہمی کی بنیاد پر اتنی بڑی بات کر سکتی ہوں میں۔ اور ملازم کا
نام لے کر آپ اپنے بیٹے کو بچانا چاہتے ہیں تو آپ کو شرم آنی چاہیے۔ میں سوچ بھی۔" اس بار ان کی بات
کاٹ دی گئی اور یہ کام خوش الحان نے کیا تھا۔

"ایک منٹ۔ آپ مجھ سے بات کریں۔ یہ بار بار میرے کردار پر الزام کیوں لگاتی جا رہی ہیں۔ میں
نے تو ان دونوں میں سے کسی کی شکل بھی کبھی نہیں دیکھی۔ میں تو انہیں نہیں جانتا۔ اور اس قدر الجھنے کی ضرورت
کیا ہے۔ یہ اٹھارہ سو ساٹھ کا زمانہ نہیں ہے کہ چیزیں کارپٹ کے نیچے چھپائی جا سکیں۔ میری ایک ہی رجسٹرڈ
سم ہے۔ آپ اس کا ریکارڈ چیک کروالیں۔ دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہو جائے گا۔ مجھے ان محترمہ کا فون نمبر تو
دور نام تک نہیں پتا۔ آپ کا خوامخواہ دماغ چل گیا ہے۔"

"خوش الحان۔ بکواس بند کرو۔ چپ ہو جاؤ۔ مجھے بات کرنے دو۔" حبیب اللہ خان نے دانت کچکچاتے
ہوئے اسے ٹوکا تھا پھر وہ دوبارہ صندل بی کو دیکھنے لگے۔

"صندل بی! آپ پہلے ان بچیوں کو یہاں سے بھجوائیں۔ اچھا نہیں لگتا ایسے۔ یہ بہت نامناسب
ہے۔ ہم ان کی غیر موجودگی میں اطمینان سے بات کر سکتے ہیں۔ بات میرے بیٹے کی ہو یا کسی کی بیٹی
کی۔ الزام تراشی غلط ہے۔ آپ وضاحت تو کرنے دیں مجھے۔" حبیب اللہ خان نے معاملے کو اپنے طریقے
سے ہینڈل کرنا چاہا۔

"بات کرنے کے لیے بچا ہی کیا ہے حبیب صاحب۔ نامناسب حرکت تو آپ کے بیٹے نے کی



ہے۔ اس کا انداز ہی بتا رہا ہے کہ یہی مجرم ہے ورنہ اس قدر جلال میں کیوں آگیا ہے یہ۔ کڑوا سچ برداشت
کرنے میں ناکام ہو کر آپ کا بیٹا بدتمیزی پر اتر آیا ہے۔ کچھ سکھایا نہیں آپ نے اسے۔ آپ سے یہ امید نہیں
تھی مجھے کہ آپ اولاد کی تربیت میں اس طرح ناکام ہو جائیں گے۔"

صندل بی نے بنا کسی لگی لپٹی کے کہا تھا۔ حبیب اللہ خان نے ایک سرد سی لہر اپنی ریڑھ کی ہڈی سے سر کی
جانب سفر کرتی ہوئی محسوس کی۔ یہ بہت بڑا طعنہ تھا اور انہوں نے کسی اور کے منہ سے سنا ہوتا تو اس شخص کا منہ
نوچ چکے ہوتے مگر سامنے صندل بی تھیں۔

"گستاخی معاف صندل بی! لیکن یہ بات آپ تب کہتی ہوئی اچھی لگتی ہیں جب آپ کا ماضی بالکل
صاف و شفاف رہا ہو یا آپ کی اپنی اولاد اعلیٰ تربیت کا کوئی شاہکار ہو۔ پہلے اپنے گھر کی خبر تو لے لیں پھر اس
طرح کی باتیں کیجیے گا۔" خوش الحان نے پہلے سے زیادہ تلخ لہجے میں کہا تھا۔ حبیب اللہ خان کے تپتے ہوئے
کلیجے پر کسی نے جیسے برف کی سلائی کر ڈالی تھی لیکن سامنے بیٹھی خاتون کو بھی وہ لیٹ ڈاؤن ہوتے نہیں دیکھ سکتے
تھے۔

"خوش الحان! خاموش ہو جاؤ۔ یہ سب واقعی نہیں سکھایا میں نے تمہیں۔"

خوش الحان نے زچ ہو کر انہیں دیکھا لیکن بولا کچھ نہیں کیونکہ دل ہی دل
میں شرمندہ تو وہ بھی تھا۔ آج سے پہلے کبھی کسی بڑے کے سامنے اس نے ایسا گستاخانہ لہجہ نہیں اپنایا تھا۔ صندل
بی بھی اولاد کے اس طعنے کے لیے تیار نہیں تھیں۔ وہ اس قدر مغرور تھیں کہ انہیں لگتا تھا، وہ ہی لوگوں کے ماضی
کھول کھول کر ان کے بخیے ادھیڑ سکتی ہیں آج جب ان کو یہ طعنہ ملا تھا تو وہ غصے سے ابلنے لگی تھیں۔ انہوں نے
ساتھ کھڑی خدیجہ کو اشارہ کیا تھا کہ وہ زہرہ کو ساتھ لے کر باہر چلی جائے۔ ان کے کمرے سے باہر نکلتے ہی وہ
کھا جانے والے انداز میں حبیب اللہ خان کو دیکھنے لگیں۔

"آپ کو بھی اپنا نوکر نہیں سمجھا تھا ہم نے۔ حالانکہ آپ دو ٹکے کے ملازم ہی تھے۔ پستی جب خون میں
رچی ہوئی ہو تو کتنی بھی جھاڑ پونچھ کر لو، وہ نکل نہیں سکتی۔ آپ کے بیٹے نے میری توہین کر کے یہ بات ثابت
کر دی ہے حبیب اللہ خان۔"

وہ منہ سے الفاظ نہیں آگ نکال رہی تھیں۔ حبیب اللہ خان نے پہلی مرتبہ ان کے منہ سے اپنا نام اس
طرح بنا "صاحب" کے لاحقے کے سنا تھا۔ دل کو ایک اور دھچکا لگا

"آپ تحمل سے میری بات تو سنیں۔ وہ بچہ ہے۔ جذباتی ہے۔ اسے کچھ سمجھ نہیں ہے وہ کیا کہہ رہا
ہے۔ خوش الحان! تم صندل بی سے معافی مانگو فوراً اور باہر جیپ میں جا کر بیٹھو۔ میں ابھی آتا ہوں" وہ دونوں
طرف کے طوفان کا سامنا ایک ساتھ کرنا چاہ رہے تھے۔

"میں معافی نہیں مانگوں گا بابا۔ میں نے کوئی غلط بات نہیں کہی۔" وہ بھی آج کچھ زیادہ ہی بپھرا ہوا
تھا۔ حبیب اللہ خان کا دل چاہا، اسے ایک تھپڑ رسید کر دیں۔ صندل بی کی استہزائیہ ہنسی ان کے حجاب کے اندر
سے بھی سنائی دی تھی۔

"دیکھ لیا۔ یہ ہے آپ کی اولاد۔ اب مجھے یقین ہو گیا کہ میری لڑکی ٹھیک کہتی ہے۔ اگر آپ کا بیٹا غلط نہ
ہوتا تو یوں آپے سے باہر نہ ہوتا۔ اسے چھوٹے بڑے کی تمیز نہ بھولتی۔ بدتمیزی کر کے بری الذمہ ہونا چاہتا
ہے۔ جان چھڑانا چاہتا ہے۔"

وہ جس انداز میں بات کر رہی تھیں۔ ان کی شخصیت پر جچتا نہیں تھا لیکن ان کی ذات کی نفی جب جب کی
جاتی تھی، وہ ایسے ہی آپے سے باہر ہو جاتی تھیں۔ وہ اپنے وجود کی پجاری تھیں۔ وہ خود ہی اپنی مرشد تھیں اور

خود ہی مُرید۔ انہیں سمجھانا آسان نہیں تھا۔

"میں ایسا کیوں کروں گا بھائی۔ میں تو اس قصے سے اتنا ہی ناواقف ہوں جتنا آپ تہذیب و تمیز سے۔ اور میرے باپ کو اولاد کا طعنہ دینا بند کردیں۔ میرے باپ نے آپ کی خاطر اپنی اولاد کو بھی سولی پر ٹانگ رکھا ہے۔ آپ کی بیٹی کو اپنے گھر کی زینت بنا رکھا ہے۔ کون کرتا ہے کسی کی خاطر اتنا۔ لیکن میرا باپ کر رہا ہے تاکہ آپ کی اولاد در بدر کی ٹھوکریں نہ کھائے۔ ہمارا احسان ماننے کے بجائے آپ ذلت پر اُتر آئی ہیں۔ بہت اللہ والی بنتی ہیں آپ۔ حالانکہ آپ کی داستانیں بھی سن رکھی ہیں ہم نے۔ اللہ والوں کے یہ کام نہیں ہوتے۔ پہلے اپنے گریبان میں جھانکیں اور پھر کسی دوسرے پر الزام لگائیں۔ آئی ایم شیور آپ کو میرے اور لاریب کے نکاح کے متعلق سن گن مل چکی ہے تب ہی آپ نے یہ نیا ڈرامہ شروع کردیا ہے۔ عجیب ہیں آپ۔ کسی کو سکون سے رہنے ہی نہیں دیتیں۔ آپ کی وجہ سے ہماری زندگی بھول بھلیاں بن چکی ہے۔ مصائب سے باہر نکلنے کا راستہ ہی نہیں مل رہا۔"

وہ چپ ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ صندل بی کا چہرہ جلتا ہوا شرارہ لگنے لگا تھا۔

"خوش الحان! خاموش ہوجاؤ۔ ورنہ میرا ہاتھ اٹھ جائے گا۔ مجھے وہ کام کرنے پر مجبور نہ کرو جو میں نے ساری زندگی نہیں کیا۔ چپ کرجاؤ اور معافی مانگو۔" حبیب اللہ خان اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

"میں کہہ چکا ہوں۔ میں معافی نہیں مانگوں گا" اس نے باپ کو بالکل اپنے مقابل دیکھ کر لہجہ مدھم کرلیا تھا مگر دل کی بھڑاس نکالنے سے باز نہ آیا تھا اس لیے اپنی جگہ سے اٹھا اور ایک سمت ہوتے ہوئے دوبارہ بولا۔

"اگر یہ اللہ والی ہیں تو ہم ان سے بڑے اللہ والے ہیں۔ آج تک کسی کا دل دکھایا ہے نہ کسی کو ایسی اذیت دی ہے کہ وہ خون تھوکنے پر مجبور ہوجائے۔ جبکہ ان کے دامن پر تو کئی لوگوں کی کردار کشی کے چھینٹے ملیں گے آپ کو۔ اب ہماری باری ہے بابا۔ وہ جو دوسروں کے ساتھ ہوتا رہا ہے۔ اب ہمارے ساتھ ہونے لگا ہے۔ ان سے بولیں، ہم سے معافی مانگیں۔"

اس نے اپنی بات اطمینان سے مکمل کی تھی اور پھر کسی کی بھی جانب دیکھے بنا باہر نکل گیا تھا۔ صندل بی ہکا بکا اس کی پشت کو دیکھتی رہ گئی تھیں۔ اتنی توہین بھی نہیں کی تھی کسی نے ان کی۔ جبکہ خان بابا کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ وہ کھڑے رہیں یا بیٹے کے پیچھے جائیں۔

☆☆☆

"بیا آج صبح صبح کون سا شوق اٹھ کھڑا ہوا ہے۔؟"

ماسی جیبہ نے گلّے کے تیزی سے چلتے ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے ناپسندیدگی سے کہا تھا۔ ماسی کو باورچی خانے میں اپنی اجارہ داری میں مداخلت ہمیشہ ہی چونے پر مجبور کردیتی تھی۔ گلّے اُبلے ہوئے آلوؤں کو ایک ہاتھ کی مدد سے دبا دبا کر پیستے ہوئے دوسرے ہاتھ سے ان میں وہ تمام مسالہ جات بھی ملاتی جارہی تھی جو اس نے پہلے سے نکال کر رکھے تھے۔

"ماسی! دل چاہ رہا تھا کہ خستہ سا آلو کا پراٹھا بناؤں اور ہر لقمہ دہی کی چٹنی میں ڈبو ڈبو کر کھاؤں۔ اس لیے یہ پنچایت لگا کر بیٹھی ہوں" اس کے ہاتھ جس طرح عجلت سے چل رہے تھے، زبان بھی ایسی عجلت سے چلی تھی۔ ماسی جیبہ ہنسی۔

"پہلے بھی پالے ہیں ایسے چونچلے تم نے۔ آلو کا پراٹھا بنانا آتا کب ہے تمہیں۔ ہٹو، میں بنادیتی ہوں۔" وہ آگے نہیں بڑھی تھی صرف صلاح دی تھی کیونکہ گلّے اتنے آرام سے اس کی بات ماننے کی نہیں، یہ بھی اچھی طرح جانتی تھی وہ۔ گلّے کے تیزی سے حرکت کرتے ہاتھ رُکے، اس نے مُڑ کر ماسی کی جانب طنزیہ انداز میں دیکھا۔

"پراٹھا بنانا آتا ہے مجھے۔ لیکن میں بناتی نہیں ہوں کیونکہ تمہارا بڑا خان اور چھوٹا خان سبزی سے بنی کسی بھی چیز کو دیکھ کر جیسی شکلیں بناتے ہیں، اس کو دیکھنے سے بہتر لگتا ہے کہ انہیں یخنی اور بھنے گوشت ہی کھلاتی رہوں۔" اپنی بات مکمل کرکے وہ پھر آلوؤں والے برتن میں مگن ہوگئی تھی۔ ماسی مزید زور سے ہنسی۔

"ارے ہٹو بھی۔ ابھی تمہارا خان آئے گا تو اتنا تربوز جتنا منہ پھلا لے گا کہ میری زال کو چولہے کے آگے جھونک رکھا ہے۔ اس کو چکر آتے ہیں۔ متلی ہوجاتی ہے اور تم فارغ بیٹھی روٹیاں توڑتی رہتی ہو۔ یاخدا! میری تو بہت غصہ کرنے لگا ہے خان لیا۔ ڈر لگتا ہے مجھے۔"

اس کے چہرے پر بشاشت تھی۔ وہ پہلے بھی مذاق میں حبیب اللہ خان کی شکایت گلّے سے کیا کرتی تھی لیکن اس بار اس کے چہرے پر پھیلی بشاشت گلّے کو مصنوعی لگی۔ ہاتھ جو پہلے کی نسبت سست ہو رہے تھے، مزید سست ہوئے اور پھر رُک گئے۔ اسے ماسی پر ترس آیا۔ اسے اونچے خفا لہجے کی عادت نہیں تھی۔

"وہ تمہیں چڑاتے ہیں ماسی۔ ورنہ ان کو ایسی زنانہ باتوں کی کیا خبر۔" وہ مزید بھی کہنا چاہ رہی تھی لیکن ماسی نے ہنستے ہوئے اسے کچن شیلف سے ہٹانا چاہا۔

"ہاں ہاں۔ تم اس کی بیوی ہو۔ تمہیں ہی پتا ہوگا اس کے دل میں کیا ہے۔ میرے تو جو دل میں آئی۔ میں نے کہہ دی۔ اب تم ہٹو اور مجھے یہ سب سمیٹنے دو۔ خستہ اور لذیذ آلو کا پراٹھا کھانا چاہتی ہو تو مجھے بنانے دو۔ تم جا کر اپنی چہیتی کو جگاؤ۔ خوشل خاص طور پر کہہ گیا تھا کہ اس کو ناشتا کروا دینا۔"

آخری جملہ کہتے ہوئے اس کی آنکھیں ذو معنی رنگوں سے سج گئی تھیں۔ گلّے نے بغور اس کی جانب دیکھا لیکن آج پہلی بار اسے یہ "اشارہ" قابلِ غور نہ لگا تھا۔ وہ چند لمحے بے تاثر نگاہوں سے اسے دیکھتی رہی پھر اس نے اپنے سامنے پڑے باؤل کو تھوڑا سا آگے کی جانب کھسکایا اور خود ہاتھ دھونے کے لیے سنک کی جانب بڑھی۔

"تم جیت گئیں ماسی۔ بناؤ بہترین قسم کا پراٹھا۔ میں اس کو جگا کر لاتی ہوں۔" وہ کہتے ہوئے کچن سے نکل گئی تھی۔

☆☆☆

"خوشل کی جانب سے میں معافی مانگتا ہوں۔"

وہ جھکے ہوئے انداز میں بولے تھے۔ انہیں صندل بی کی دل داری عزیز تھی لیکن نجانے کیوں پہلی بار وہ یہ کرتے ہوئے خوش نہیں تھے۔

"یہ سب یقیناً کسی غلط فہمی کی بنا پر ہوا ہے۔ خوش الحان ایسا نہیں ہے۔ دراصل مجھے لگتا ہے یہ سب وراثت کررہا تھا مگر وہ بھی انجان تھا۔ چند دن پہلے اس نے ایک شکایت کی تھی۔ میں بتاتا ہوں، آپ کو۔ آپ وضاحت کا موقع تو دیں۔"

حبیب اللہ خان نے ان کے غضب ناک انداز کو دیکھتے ہوئے مزید تحمل سے کہا تھا۔ انہیں لگتا تھا وہ اس سارے مسئلے کے آخری سرے کو آسانی سے پکڑ سکتے ہیں۔ وراثت والا معاملہ اور یہ معاملہ کچھ ملتا جلتا تھا۔ اگر کڑی سے کڑی ملائی جاتی تو مسئلہ سلجھ سکتا تھا۔

صندل بی نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ ان کی آنکھیں ان کی دلی کیفیت کو ظاہر کررہی تھیں۔ وہ یقیناً بہت ہرٹ ہوئی تھیں۔ حبیب اللہ خان دل میں شرمندہ تھے۔ ان کے اپنے بیٹے نے بہت توہین کردی تھی ان کی لیکن توہین تو ان کی بھی ہوئی تھی۔ ان کے پورے خاندان کو ہی لپیٹ میں لے لیا گیا تھا حالانکہ وہ صرف ایک

"موبائل نمبر ہی ٹریس کروالیں۔" سب چیزیں واضح ہوسکتی تھیں مگر وہ چاہتی تھیں کہ جو وہ کہہ رہی ہیں بات کو من وعن مان لیا جائے۔ ان کی پرانی عادت تھی۔ وہ اپنے ہر موقف، ہر غلطی پر ڈٹ جانے کی عادی تھیں۔

خوش الحان بھی جوانی کے جوش میں بہت کچھ کہہ گیا تھا مگر کہیں نہ کہیں وہ اس کی باتوں سے متفق تھے مگر مسئلہ یہ تھا کہ وہ صندل بی کے منہ پر اتنی صاف گوئی سے کام لینے کی ہمت نہ رکھتے تھے۔ خواہش کے باوجود ان کا دل انہیں اس کام سے روک دیتا تھا۔

"آپ نے اپنے بیٹے کو میرے ماضی کے متعلق کیا بتا رکھا ہے۔ کون سی کہانیاں سنائی ہیں آپ نے اسے میری کہ وہ میری اتنی بے عزتی کر گیا ہے۔؟" وہ ان کے چہرے کو ایک ٹک دیکھتے ہوئے پوچھ رہی تھیں۔

"ایسا کچھ نہیں ہے۔ وہ ابھی ناسمجھ ہے۔ جذباتیت کے غلبے میں بک رہا تھا وہ۔ اسے کیا پتا کس بات کا۔ میں اسے خود لاؤں گا آپ کے سامنے۔ گھٹنوں کے بل بیٹھ کر کان، پکڑ کر معافی مانگے گا آپ سے۔ آپ تحمل سے میری بات تو سنیں۔"

وہ منت کرتے ہوئے بولے تھے۔ صندل بی نے ان کی کسی بات کو جیسے سنا ہی نہیں تھا۔ ان کی سماعتیں ناکارہ ہونے لگی تھیں۔ انہوں نے بپھرے ہوئے انداز میں حبیب اللہ خان کی جانب دیکھا۔

"حبیب اللہ خان! بہتر ہوگا آپ یہاں سے تشریف لے جائیں۔ میں آپ کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ میرا خون اس وقت کھول رہا ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ میرے منہ سے کچھ الٹا سیدھا نکل جائے اور اللہ کے یہاں آپ کی پکڑ ہو۔"

وہ بول تحمل سے ہی تھیں۔ ان کے الفاظ تو سخت تھے مگر آنکھوں میں جو انداز تھا وہ الفاظ سے بھی زیادہ جان لیوا تھا۔ جن آنکھوں میں چاہ دیکھنے کی خواہش میں انہوں نے کئی زندگیوں کو آگ لگا دی تھی، وہی آنکھیں آج ان سے بے گانی ہو گئی تھیں۔ حبیب اللہ خان کو لگا جیسے کسی نے دہکتا ہوا کوئلہ ان کی روح پر داغ دیا ہو۔

"دفع ہو جائیں یہاں سے۔ میں آپ کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔ آپ نے اپنے بیٹے کو میرے ماضی کے متعلق کیا بتا رکھا ہے۔ کیا اول فول بک رہا تھا وہ۔ کیا سکھایا ہے آپ نے اسے ساری زندگی۔ اللہ والوں کی توہین کرنا۔

اللہ کے پیاروں کا دل دکھانا۔ میں سمجھتی تھی آپ ہمدرد ہیں میرے۔ وفادار ہیں مجھ سے۔ لیکن آپ تو آستین کے سانپ نکلے۔ آپ نے میرے ساتھ وہی کیا جو باقی سب لوگ کرتے رہے۔ آپ سب لوگ اہل مکہ جیسے ہیں۔ انہیں بھی اللہ کے راستے پر چلنے والوں سے خار تھی۔ وہ بھی اللہ کے پیاروں کی تضحیک کرتے تھے آپ اور آپ کی اولاد نے بھی یہی وتیرہ اپنا لیا۔ لیکن میرا کیا بگاڑ لیں گے آپ۔ میرا اللہ میرے لیے موجود ہے۔ وہ آپ کو ذلیل و رسوا کر دے گا۔ آپ مجھے رسوا کرنا چاہتے تھے تب ہی بیٹے کو میرے سامنے لا کھڑا کیا۔ ہے نا۔ مگر آپ بھی تباہ و برباد ہو جائیں گے بالکل ایسے جیسے داؤد منور ہوا ہے۔ سنا ہے تھوک کے بجائے منہ سے خون اگلتا ہے۔ یہی ہوگا آپ کے بیٹے کے ساتھ بھی۔ زمین پر جگہ نہ بچے گی اس کے لیے۔ کیڑوں کی خوراک بنا دوں گی اسے میں۔"

وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر مسلسل بول رہی تھیں پھر بھی ان کے پاس بددعائیں ختم نہ ہو رہی تھیں۔ وہ ان کے خوش الحان کو بددعائیں دے رہی تھیں۔

"آپ کو اندازہ بھی نہیں ہے کہ میری ریاضت نے مجھے کس مقام پر پہنچا دیا ہے۔ میری ایک بددعا آپ کی چھ فٹ کی اولاد کو زندہ نگل سکتی ہے۔"

وہ لمحہ بھر کو رکیں اور براہ راست حبیب اللہ خان کی آنکھوں میں دیکھا۔



"میں بخشتی ہوں آپ کو۔ لیکن آپ کے بیٹے کو کبھی معاف نہیں کروں گی میں۔ اللہ کی میز پر رکھ دی ہے میں نے اس کے نام کی فائل۔ اسے کہیے گا تیار رہے۔ اللہ والوں سے پنگے لینے کا انجام ہمیشہ برا ہوا کرتا ہے۔"

ان کا رعونت سے بھرا لہجہ تھا یا غلاظت سے بھرا کوئی ٹرک۔ لیکن حبیب اللہ خان کو جیسے منہ پر تھپڑ پڑا تھا۔ وہ بے ہوشی سے نہیں کوما سے بیدار ہوئے تھے۔ اتنی رعونت، اتنا غرور۔ وہ کیا سمجھتی تھیں خود کو۔ باقی مخلوق کیا تھی ان کے لیے۔ ایک وہ تھیں جو اللہ کو پیاری تھیں اور باقی سب کو وہ اس اعزاز سے محروم کر دینا چاہتی تھیں۔ کس بنیاد پر۔ ایسا تھا کیا ان میں۔ وہ انہیں اور ان کی آنے والی نسلوں کو بددعائیں دے رہی تھیں۔ ان کے الفاظ کانوں میں سوئیوں کی طرح چبھ رہے تھے۔

دھمکی تھی، انتباہ تھا یا اعلان جنگ۔ ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔ صندل بی ان کے ساتھ ایسا کیسے کر سکتی تھیں۔ انہیں بولنے کا موقع دیے بغیر وہ کیسے ان کے بیٹے کو جھولی بھر بھر بددعائیں دے سکتی تھیں اور بددعائیں تو کیا دعائیں بھی کیسے دے سکتی تھیں کسی کو۔

ایسی کون سی "اللہ والی" تھیں وہ۔ ان کو تو اس مقام پر پہنچایا ہی انہوں نے تھا۔ وہ نور القلوب میں بیٹھی تھیں تو ان کی وجہ سے تھیں۔ علاقے کے لوگ ان کو دیکھ کر جھک کر سلام کرتے تھے تو ان کی وجہ سے کرتے تھے۔ وہ اپنے باپ، بھائی اور شوہر کے بعد اگر آج بھی اس قابل تھیں کہ تمام تر سہولیات کے ساتھ زندگی گزار رہی تھیں تو یہ سب ان کی وجہ سے تھا اور وہ ان ہی کے بیٹے کو بددعائیں دے رہی تھیں جبکہ وہ ان کی اولاد کو اپنے گھر میں پناہ دیے ہوئے تھے۔ ان کا دماغ جیسے جلنے لگا۔

"آپ اگر اللہ والی ہیں تو آپ کو اللہ والی بنایا میں نے ہے۔ اور آپ مجھے اپنے عتاب سے ڈرائیں گی۔ ارے یہ تو اللہ بھی نہیں کرتا۔ آپ نے یہ جرات کہاں سے کر لی۔ ہمیں اللہ سے ڈرائیں گی آپ۔ کیوں؟ کیا ہم کلمہ گو نہیں ہیں۔ ہم سے پیار نہیں کرتا اللہ۔ صرف آپ ہی ایسی انوکھی جنمی ہیں۔ اونہہ۔ سمجھتی کیا ہیں آپ اپنے آپ کو۔ میرے بیٹے کے بارے میں یہ سب بکتے ہوئے موت کیوں نہ آگئی آپ کو۔"

وہ یہ سب سوچ رہے تھے۔ کہہ نہیں سکتے تھے۔ انہوں نے ساری زندگی اس عورت کو بہت عزت دی تھی، بہت احترام کیا تھا اس کا۔ وہ جو سوچ رہے تھے اس کے منہ پر کیسے کہہ دیتے۔ وہ کھول رہے تھے مگر بول نہیں رہے تھے۔ ایک لمحے میں جیسے کسی نے ان کے سامنے ان کے زندگی کے سب ابواب کھول کر رکھ دیے تھے۔ انہوں نے اس عورت کی چھوٹی بڑی اچھی بری ہر تدبیر کو ممکن بنانے کے لیے کیا کیا نہیں کیا تھا۔ وہ تو اپنی ویلیوز کو بھی بھول گئے تھے۔ کسی جاہل معتقد کی طرح ان کی ہاں میں ہاں ملائے چلے جانے کو اعزاز سمجھتے رہے تھے وہ۔ اور ان کو اس سب کے بدلے میں ملا کیا تھا۔

انہوں نے گہری گہری سانسیں بھری تھیں ورنہ شاید ان کا دل بند ہو جاتا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھے تھے اور تھکے تھکے قدموں سے دروازے تک گئے تھے۔ ان کی چال میں استقامت نہیں تھی۔ دروازے تک پہنچتے پہنچتے ان کے دل میں جانے کیا سمائی کہ وہ واپس پلٹ کر آئے تھے۔

"آپ بہت اللہ والی ہیں۔ یہ بات جو میں آپ کو بتانے والا ہوں، مجھے یقین ہے، آپ کے موکلوں نے آپ کو پہلے سے بتا دی ہوگی لیکن پھر بھی یہاں سے جانے سے پہلے میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں۔" وہ لمحہ بھر کو سانس لینے کے لیے رکے تھے۔

"جب آپ اپنے سارے خاندان سے منہ موڑ کر یہاں تشریف لائی تھیں اور آپ نے خود کو سب سے

محبر تسلیم کرتے ہوئے ان سب سے ایک بھی پیسہ لینے سے انکار کر دیا تھا کیونکہ آپ کو یقین تھا کہ کماتے ہیں اور آپ چونکہ اس قدر معزز و محترم تھیں، وہ پیسہ درکار ہوتی تھیں کہ ساری زندگی تمام کاروبار رہنے کے بعد آپ تائب ہو کر یکدم "اللہ والی" ہوگئی تھیں اور آپ نے پیار اور بنانے کا سوچا تھا تو وہ ساری رقم جو میں نے آپ کو دی تھی وہ دراصل میری نہیں تھی۔ وہ پیارا سرمایہ آپ کے شوہر [illegible] جنہیں آپ دنیا کا سب سے بڑا گنہگار قرار دیتی ہیں۔ وہ تھیں آپ کے ہاتھوں ذلیل [illegible] فراہم کیا تھا بھی آپ کی اس درجہ محبت میں مبتلا تھا کہ اس نے یہ درس گاہ بنانے کے لیے اپنا سب کچھ آپ کو دان کر دیا تھا۔ اور اب بھی وہ ہر ماہ ایک خطیر رقم درس گاہ کے اکاؤنٹ میں بھجواتا رہتا ہے۔ میں چاہتا ہوں اور آج کے بعد میں بھی کبھی آپ کی شکل نہیں دیکھوں گا لیکن میں نے سوچا جاتے ہوئے آپ کو یہ راز کی بات ضرور بتا دوں۔ آپ بلندیوں کے کچھ زیادہ ہی اونچی اڑان بھر چکی ہیں۔ آپ کو نیچے آنے میں آسانی ہوگی۔"

وہ اس قدر تلخی سے اپنا پورا نقطۂ نظر بیان کر رہے تھے۔ مندل بی کے لیے یہ انکشاف واقعی نیا تھا یا بتدا میں انہیں سرمایہ حبیب اللہ خان نے ہی فراہم کیا تھا اور بعد میں ان کے اپنے اس قدر معتقدین بن چکے ہو گئے تھے کہ ان کی مالی امداد نے کبھی یہ نوبت نہ آنے دی تھی کہ وہ کسی سے کچھ مانگتیں۔ انہیں بالکل خبر نہیں تھی کہ دلاور بھی درس گاہ کے لیے رقم بھجواتے تھے۔

"کیسا لگتا ہوگا جب ایک شخص جسے آپ خود سے کمتر، گنہگار اور بدکار سمجھتے ہوئے دھتکار چکے ہوں اور آپ کو پتا چلے کہ وہ آپ سے کہیں باظرف اور معتبر ہے۔"

حبیب اللہ خان جو ہمیشہ ان کے حسن سے مرعوب رہے تھے جیسے یکدم ایک گرفت سے آزاد ہو گئے تھے۔ انہوں نے ان کی موجودگی میں کبھی خود کو اس قدر پُرسکون محسوس نہیں کیا تھا جتنا وہ آج کر رہے تھے۔

"امید ہے ہماری آخری ملاقات آپ کے اعصاب پر بھاری نہیں پڑے گی۔" وہبز کے استہزائیہ ہنسی جننے کے لیے انہوں نے بالکل بھی ہمت نہیں کی تھی۔ وہ خود بخود ان کے چہرے پر چمکنے لگی تھی۔

"اوہ میں بھول ہی گیا تھا کہ آپ تو اللہ والی ہیں۔ آپ کے اعصاب تو لوہے کے بنے ہوئے ہیں۔ نازک اعصاب تو ہم گنہگاروں کے ہوا کرتے ہیں۔"

اپنا جملہ مکمل کر کے وہ رکے نہیں تھے بلکہ تیزی سے قدم اٹھاتے ہوئے باہر نکل گئے تھے اور ساتھ ہی عشق کا خناس دماغ سے ہانپتا ہوا نکلا تھا۔ وہ داستان جو ان کے بچپن میں شروع ہوئی تھی آج اس مقام پر ختم شد ہوگئی تھی۔

☆☆☆

"میں ماسی کو ناشتہ بنانے کا کہہ آئی ہوں۔ وہ آلو کے پراٹھے بنا رہی ہے۔ اب اگر تم پوستیوں کی طرح پڑی رہو گی تو سب ٹھنڈا ہو جائے گا اور ماسی ناراض ہوگی۔"

گلے نے لاریب کو ساکت و جامد بستر پر بیٹھا دیکھ کر دوسری دفعہ کہا تھا۔ وہ جاگ رہی تھی لیکن بستر سے نکلنے کو تیار نہ تھی۔ اس کی آنکھیں زیادہ دیر سوتے رہنے کی وجہ سے سوجی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

"میرا دل نہیں چاہ رہا گلے۔ میرے سر میں درد ہے۔ آپ پلیز یہاں سے چلی جائیں، مجھے اکیلا چھوڑ دیں۔" وہ سپاٹ سے لہجے میں بولی تھی۔ گلے نے بچوں کی طرح منہ بسور کر اسے دیکھا پھر اس کے پاس اس کے بستر پر بیٹھ گئی۔

"میں نہیں جا سکتی۔ میں نے سوچ لیا ہے کہ میں ہمیشہ تمہارے ساتھ ہی رہوں گی۔ بیٹیوں کو کون اکیلا چھوڑتا ہے بھلا۔" وہ دلار سے بولی تھی۔ لاریب نے مندی مندی آنکھوں سے اسے دیکھا۔ وہ پہلے بھی اس



کے ساتھ کبھی بیزار کُن یا منفی طریقے سے بات نہیں کرتی تھی لیکن ایسے لاڈ بھی کبھی نہیں اٹھاتے تھے اس نے۔ اس کے چہرے پر بے یقینی سی چمکنے لگی۔ رات والے واقعات اس کی یادداشت سے محو ہو چکے تھے مگر ذہن پر جو دھند چھائی تھی وہ ثابت کر رہی تھی کہ اسے مخصوص انجکشن دیا گیا ہے۔ اس کی وجہ سے اس کا سر بیدار ہو جانے کے بعد بھی بھاری ہی رہتا تھا۔

"یہ بات میرے پیرنٹس کو کیوں نہیں بتائی کسی نے۔؟" وہ خود کلامی کے انداز میں بولی تھی۔ گلے اس کا چہرہ دیکھ کر رہ گئی۔ اس کا دل جیسے کسی نے مسلا تھا۔ رات بھر اس نے لاریب کو نیند میں بڑبڑاتے سنا تھا۔ وہ فجر کی اذان کے بعد اس کے کمرے سے اپنے کمرے میں واپس آئی تھی۔

"آپ مجھے اپنے ساتھ رکھ لیں۔ مجھے چھوڑیں مت۔ یہ مت کریں میرے ساتھ۔ مجھے اکیلا رہ جانے سے ڈر لگتا ہے۔" ایسے ہی ننھے ننھے جملے وہ یکے بعد دیگرے بڑبڑاتی جاتی تھی۔ گلے کو اس پر ترس آنے لگا تھا۔

"تمہیں یاد آ رہی ہے ان کی۔؟" یہ جملہ گلے کے منہ سے پھسلا تھا حالانکہ وہ یہ پوچھنا نہیں چاہتی تھی۔ لاریب نے فوراً کوئی جواب نہیں دیا تھا بلکہ وہ دائیں کروٹ سے سیدھی ہوئی اور بازو آنکھوں پر رکھ لیا۔ گلے اس کے بولنے کا انتظار کرتی رہی پھر اس کی خاموشی سے عاجز آ کر پوچھنے لگی۔

"تمہیں ہری حویلی اچھی نہیں لگتی۔ تم ہمارے ساتھ نہیں رہنا چاہتیں؟"

"آپ مجھے کب تک اپنے ساتھ رکھ لیں گی۔ ایک دن آئے گا آپ بھی مجھ سے بیزار ہو جائیں گی۔ سب مجھ سے بیزار ہو جاتے ہیں۔ سب کو میں ہی بری لگنے لگ جاتی ہوں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے گلے۔ لوگ مجھے تنہا کیوں چھوڑ دیتے ہیں۔" سپاٹ لہجہ مگر الفاظ جیسے درد سے ڈوبے ہوئے۔

"ایسا نہیں ہے لاریب۔" گلے نے سمجھانا چاہا مگر اس نے بات کاٹ دی۔

"ایسا ہی ہے ایسا ہی۔ ہے" وہ انتہائی اکتائی ہوئی لگ رہی تھی۔ گلے چند لمحے کچھ نہیں بولی بلکہ سوچتی رہی کہ اپنا موقف اس کے سامنے کیسے بیان کرے لیکن پھر اسے لگا کہ یہ وقت مناسب نہیں ہے، وہ اسے بعد میں بھی اپنی محبت کا یقین دلا سکتی ہے تو بولی۔

"اچھا چلو چھوڑو۔ آؤ ناشتہ کرتے ہیں۔ ماسی آلو کے پراٹھے بنا رہی ہے۔"

"میرا دل نہیں چاہتا گلے۔" اس نے پھر انکار کر دیا تھا۔

"دل کو سمجھاؤ پھر۔ ماسی کے ہاتھ کے پراٹھے نظر انداز کرنا غلطی ہی نہیں گناہ ہے۔ یہ ماسی سمجھتی ہے۔" وہ مسکرا کر بولی تھی۔ لاریب جو چت لیٹی تھی۔ بائیں جانب کروٹ لیتے ہوئے بولی۔

"میرا دل سمجھتا بھی تو نہیں ہے۔ دل چاہتا ہے مر جاؤں یا پھر سب کو مار ڈالوں۔" وہ بے چارگی سے بولی تھی۔ گلے زور سے ہنسی۔

"تم نہیں مار سکتیں کسی کو۔ کسی کو مارنے کے لیے بہت ہمت درکار ہوتی ہے۔ کہاں سے لاؤ گی یہ ہمت۔"

اپنی جانب سے وہ مذاق ہی کر رہی تھی۔

"ہمت نہیں گلے۔ نفرت۔ نفرت درکار ہوتی ہے۔ اور مجھے لگتا ہے، مجھے سب سے نفرت ہوتی جا رہی ہے۔" اس کے لہجے میں شکست خوردگی تھی۔ گلے کو اس کی بات سے شدید دکھ پہنچا۔

(آخری قسط آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

## مکمل ناول

### انیسویں قسط

# عسرِ یسرا

حسنہ حسین

وہ دیوار کا سہارا لیتے لڑکھڑاہٹ پر قابو پاتے اندر آیا۔ تمام مناظر گڈمڈ ہونے لگے۔ سانسیں بھاری ہونے لگیں۔ اس کا دل بس اب جیسے بند ہونے کو تھا۔ وہ بے قابو ہو کر فرش پر جھک گیا تھا۔ یہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ اس کی بیٹی کے ساتھ۔ اسے سانس نہیں آ رہا تھا۔ وہ مر رہا تھا۔ ختم ہو رہا تھا۔ اس کے اندر سب ایک دم سے ختم ہو گیا۔ ہر سکت، ہمت اور حوصلہ۔ ہر امید، لگن اور یقین۔ پہلا وار تھا۔ دوسرا وار

موبائل کی ایک ہلکی سی بیپ تھی۔ اس نے لرزتی انگلیوں سے لاک کھولا۔ دھڑا دھڑ تصاویر کھلتی گئیں۔ حدینہ اور حماد شیرازی کی تصاویر۔ وہ اس کے ساتھ مال میں تھی، وہ مہنگی ترین دکانوں پر شاپنگ کر رہی تھی۔ ریستوران میں لنچ کر رہی تھی۔ ڈانس فلور پر اس کی بانہوں میں بانہیں ڈالے کھڑی تھی۔ پارک میں گھوم رہی تھی۔ ہنس رہی تھی۔ مسکرا رہی تھی۔

فارس وجدان اندر تک فنا ہو گیا۔

اس کی شادی شدہ زندگی کو آگ لگانے والا، اس کی بیٹی کو جان سے مارنے والا دوسرا چہرہ۔ حماد شیرازی کا تھا۔

آنکھوں میں وحشت بھرا جنون لیے وہ اشتعال میں اٹھ کر گھر سے نکلا تھا۔

اس کا رخ شیرازی انٹرپرائزز کی طرف تھا۔ معلوم نہ تھا وہاں اس وقت کون ہو سکتا تھا۔ اعظم یا ہارون۔ وہ دونوں میں سے کسی سے بھی

مل سکتا تھا۔ صدر دروازے سے اندر داخل ہوتے، ریسپشن پر کسی کے متوجہ ہونے سے پہلے، شدید غصے کے عالم میں سیڑھیاں چڑھتے۔ اس نے میٹل پلانٹ اسٹینڈ سے گلاس والز پر پے در پے کئی وار کرکے شیشے توڑ دیے۔ ایک شور سا اٹھا۔ دائیں طرف، بائیں طرف، گزرتے لوگ متوجہ ہوئے۔ خوف اور ہراس بھری کیفیت الگ سے پھیلی۔

اعظم شیرازی لفٹ سے نکل کر اپنے آدمیوں کے ہمراہ، رپورٹ سنتے، بات کرتے آ رہے تھے۔ ابھی ابھی میٹنگ ختم ہوئی تھی۔ ہارون شیرازی پہلو میں تھا۔ اعظم شیرازی آگے تھے۔ وہ اندر داخل ہوتے ہی سفید روشن ٹائلز پر قدم دھرتے ان پر اچانک سے حملہ آور ہوا تھا۔ سکیورٹی گارڈز ایک دم سے آگے ہوئے تھے۔ اسے پیچھے ہٹانے لگے تھے۔

اعظم شیرازی کی آنکھوں میں تعجب کے ساتھ ہی بے یقینی کا تاثر ٹھہر گیا۔

"میں حماد کے راستے میں کبھی نہیں آیا۔ آپ نے حماد کو میرے راستے میں کیوں آنے دیا؟"

وہ بھرپور مزاحمت کے ساتھ اپنا آپ چھڑاتے ہوئے اعظم شیرازی پر چیخا تھا۔ ہارون شیرازی سکتے میں کھڑا رہا۔

"کتنی بار ماریں گے آپ مجھے۔ اور کتنی بار قتل کریں گے میرا۔"

اعظم شیرازی کی پھٹی ہوئی نگاہیں اس کے چہرے پر جمی تھیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ بات کیا تھی۔ ماجرا کیا تھا۔ معاملہ کیا تھا۔ کیوں وہ اس طرح پاگل ہو رہا تھا۔ متوحش ہو رہا تھا۔

سکیورٹی گارڈز پکڑ کر کھینچ کر اسے قابو کرنے لگے۔ وہ پانچ لوگ تھے۔ وہ ایک تھا۔ وہ اپنی تمام تر مزاحمت کے ساتھ ڈٹ گیا تھا۔ لہو رنگ آنکھیں اعظم شیرازی پر، ان کے بیٹے پر جمی رہ گئی تھیں۔ صرف ایک گھونسہ، جو پیٹ میں لگا تھا، ایک ضرب جو سر پر لگی تھی۔ وہ اسے قابو کرکے نیچے گراتے فرش کے ساتھ لگا چکے تھے۔

"چھوڑ دو اسے!" اعظم شیرازی کی آواز گرج بن گئی تھی۔ گارڈ نے چونک کر انہیں دیکھا۔ یہاں انہیں خطرہ تھا۔ کون جانے وہ نوجوان ان کے ساتھ کیا کر سکتا تھا۔

"میں نے کہا، چھوڑ دو اسے!" اب کے دھاڑ کر بولے۔ راہداری میں دور تک سناٹا پھیل گیا۔ ان کے حکم پر اسے آزاد کر دیا گیا۔

ان کے قدم بے ساختہ اس کی طرف اٹھے اور پھر رک گئے۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ اس کی سسکیاں ان پر ایک رعشہ سا طاری کر گئیں۔

وہ آہستگی سے اٹھ گیا۔

ایک زخمی، بپھری ہوئی نگاہ ان پر ڈالتا وہیں سے پلٹ گیا۔ مہیب سناٹوں کی زد میں اعظم اور ہارون شیرازی کھڑے رہ گئے تھے۔

☆☆☆

مجھے سنو،
جیسے کوئی بارش کو سنتا ہے
نہ توجہ سے اور نہ بے خیالی سے
دھیمے قدموں کی خاموش آہٹ میں
ابر برساتی اس رم جھم کے درمیاں
اور ہوا میں گرتے اس پانی کے جیسے
ہوا لہرائے ایسے کہ وقت گزرتا ہو جیسے
یہ دن ہے کہ اب گزرا چاہتا ہے
وہ رات ہے کہ آیا چاہتی ہے
اُس موڑ پہ موجود دھند لکے کی رنگینی میں
اُس موڑ پہ موجود وقت کی بے چینی میں
(اکتاویو پاز)

کسی بھٹکے ہوئے مسافر کی طرح وہ لندن کی گلیوں میں یہاں وہاں بس ایسے ہی پھرتا رہا۔ اس کا موبائل مسلسل بجتا رہا تھا۔ میسج آ رہے تھے۔ وہ گھر نہیں گیا تھا۔ اس نے ابھی تک کسی سے بات بھی نہیں کی تھی۔ ٹاور برج کے پاس رک کر اس نے مردہ ویران نگاہوں سے نیچے گہرائیوں تک دیکھا۔ رات کی تاریکی میں ٹھٹھرتے ہوئے سرد موسم میں بلندی سے وہ منظر



خاماہیت ناک لگ رہا تھا۔ اس نے گہری سانس لے کر ریلنگ پر گرفت جمائی تھی۔ موبائل پھر سے بجنے لگا تھا۔ اب کے اس نے موبائل نکال کر اسکرین کو دیکھا تھا۔ جمیلہ داؤد کی کال تھی۔ وہ آنکھوں میں نمی لیے کھڑا رہا۔ پھر اس نے کال ریسیو کرلی۔

"فارس۔!" ان کی آواز میں ایک تڑپ تھی۔ "کہاں ہو تم؟ فون کیوں نہیں اٹھا رہے تھے تم ٹھیک ہو؟"

ان کی آواز سے لگ رہا تھا جیسے وہ رو رہی ہوں۔

وہ موبائل کان سے لگائے اپنی جگہ کھڑا رہا۔ سرخ پڑتی آنکھیں پھر سے نم ناک ہونے لگیں۔

"کچھ بولو بیٹا! مجھ سے بات کرو۔" وہ بے تاب ہو کر بولیں۔ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا، انہیں علم ہو چکا تھا۔

"آپ کو معلوم ہے ممی ابارشن کیسے کرواتے ہیں؟" اس کی آواز بھاری۔ گلوگیر تھی۔ جمیلہ داؤد کو لگا ان کا دل بند ہو جائے گا۔

"فارس۔" ان کی آواز کانپی۔

"لاسٹ ویک میں نے اس کی ہارٹ بیٹ سنی تھی۔ ایوری تھنگ واز نارمل۔" اس کا لہجہ کمزور اور آواز بھاری ہو رہی تھی۔ آنکھیں مسل کر آنسوؤں کا اثر دبانا چاہا۔

"لیکن۔ اس نے میری بیٹی کے ٹکڑے کر دیے۔ ممی! اس نے میری بیٹی کو مار دیا۔ عدینہ نے۔ آپ کے بیٹے نے۔ آپ کے بیٹے نے۔" وہ آنکھوں پر ہاتھ رکھے ہچکیوں کے ساتھ رو رہا تھا۔ جمیلہ داؤد کا دل پھٹنے لگا۔

"وہ فارس کی بیٹی تھی۔ اس لیے اس کے ساتھ یہ سب یہ ہوا۔

ابارشن۔ ایک جیتا جاگتا وجود کس اذیت سے گزرا ہوگا۔ سوچ کر اس کا دل پھر سے کٹنے لگا۔

"میں نے سوچا تھا۔ میں اسے پروٹیکٹ کروں گا۔ میں اسے کبھی بھی کوئی تکلیف نہیں ہونے دوں گا۔ آئی ویل میک شیور کہ اس کا باپ اس کے ساتھ زندگی کے ہر موڑ پر موجود ہو۔ میں ہارون نہیں ہونا چاہتا تھا۔ لیکن۔ میں بھی وہی ہوں۔ ممی! میں اسے نہیں بچا سکا۔ میں اپنی بیٹی کو نہیں بچا سکا۔"

"فارس بیٹا!" وہ تڑپ کر آوازیں دیتی رہ گئیں۔ "بیٹا! تم کہاں ہو اس وقت؟ مجھے بتاؤ میں حیدر کو بھیج رہی ہوں۔ پلیز۔ فارس۔!" موبائل کی بیٹری اسی لمحے ڈیڈ ہو گئی۔ وہ سر پکڑ کر کتنی ہی دیر تک بیٹھا رہا۔

عدینہ زبیر اور حماد شیرازی کی تصویریں آنکھوں میں لہرانے لگیں۔ وجود سلگ اٹھا۔ ذہن گزشتہ ایکس سالوں کی اذیتوں کو بار بار دہرانے لگا۔

بھٹکا ہوا تو پہلے سے تھا۔ مزید بھٹک گیا، راستوں کی پہچان ختم ہو گئی۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا تو رک گیا۔ دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا۔

اس کے اطراف میں لوگوں کی آمد و رفت موسم کی مناسبت سے کم پڑ گئی۔ سڑکیں، راستے، گلیاں ویران ہو گئیں۔ ہوائیں یک دم سے تیز ہوئیں تو سردی کی شدت سے وجود ٹھٹھرنے لگا۔

تیز ہواؤں کی زد میں آہستگی سے قدم اٹھاتے کوئی شخص تاریکی میں ابھر کر سامنے آیا تھا۔ اسے بازو سے پکڑ کر اٹھاتے ہوئے وہ سہارا دے کر اسے تنگ گلی سے اندر کہیں لے جانے لگا۔ وہاں جہاں آگ جل رہی تھی۔ جہاں بے گھر لوگوں کا ایک جمگھٹا سا نظر آ رہا تھا۔ لوہے کی ٹین میں لکڑیاں کاغذ وغیرہ ڈال کر جگہ جگہ آگ بھڑکائی جا رہی تھی۔ سردی سے بچنے کا مشترکہ انتظام کیا جا رہا تھا۔ اس شخص نے اسے اپنی پناہ گاہ میں بیٹھنے کی جگہ دی تھی۔ اس نے بیگ سے ایک پھٹی ہوئی سی شال نکال کر اس کے کندھوں پر ڈالی تھی۔ وہ کیتلی میں پانی ڈال کر اس بھڑکتی ہوئی آگ پر چڑھا چکا تھا۔ پھر اس نے گرم قہوہ بنا کر وہ پلاسٹک کا مگ اس کے ہاتھ میں دیا تھا۔ اس کا وجود بخار سے تپ رہا تھا۔ اس کی حالت ابتر ہو رہی تھی۔ وہ مردہ زندہ سا۔ اپنی حالت سے یکسر بے نیاز بیٹھا ہوا تھا۔

"اسے پیو! بہتر محسوس کرو گے!"

اس نے مگ ہاتھ میں لیے آہستگی سے نگاہ اٹھائی تھی۔ منظر دھندلا کر واضح ہو گیا تھا۔

اس شخص نے ذہل کپڑے پہن رکھے تھے، کوٹ جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا۔ جینز کے پائنچے ادھڑے ہوئے تھے۔ پرانے جوتے، تسمے گھٹنوں کے گرد کس کر بندھے ہوئے۔ اس کی بھوری داڑھی تھی۔ بھورے بال قدرے لمبے، اونی کیپ سے جھانک رہے تھے۔ دستانوں سے جو انگلیاں جھانک رہی تھیں وہ نیلی ہو رہی تھیں۔ وہ اسے اپنی جانب دیکھتا پا کر مسکرایا تھا۔

"ہوم لیس (بے گھر) لگتے تو نہیں ہو۔ باہر کیوں ہو؟"

وہ اس پہر۔ اس وقت۔ وہ "ہوم لیس" ہی تھا۔ اسے پوری دنیا خود پر تنگ ہوتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ نظریں جھکا گیا۔ بھاپ اڑاتا مگ انگلیوں میں دبا ہوا تھا۔

"کچھ کھو دیا ہے کیا؟" اسے پھر سے دیکھتے جانچتے، اپنے مخصوص عرب انگلش لہجے میں پوچھا۔

اس نے ماؤف ہوتے دماغ کے ساتھ اس کا سوال سمجھنے کی کوشش کی۔

اسے اس پل خود میں اور سامنے بیٹھے اس شخص میں کوئی فرق نظر نہیں آ رہا تھا۔ مگر فرق تھا۔ ظاہری نہیں۔ باطنی بھی۔

اس شخص کی آنکھوں میں زندگی تھی۔ حزن بھی تھا۔ اعتماد تھا۔ وہ بات بے بات مسکرا بھی رہا تھا۔ بظاہر اس کے پاس کچھ نہیں تھا۔ مگر اطمینان ایسا جیسے سب کچھ ہو۔

"یعنی میری طرح۔" اس نے خود سے ہی کچھ سمجھ کر اپنے پلاسٹک کے مگ سے ایک لمبا گھونٹ لیا۔ فارس نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کا غم کسی کے جیسا نہیں ہو سکتا تھا۔

"تم مرنے کے لیے باہر ہو۔ ہم زندہ رہنے کے لیے باہر ہیں!" اپنی بات کہہ کر دھیرے سے ہنسا۔ خالی مگ میں دوبارہ قہوہ انڈیلا۔ آگے کو ہو کر فارس کی طرف دیکھا۔ ان کے مابین آگ کے شعلے بھڑک رہے تھے۔

"اللہ کسی کی وسعت اور برداشت سے زیادہ اس پر بوجھ نہیں ڈالتا لڑکے!" آیت پڑھ کر سناتا وہ سیدھا ہو بیٹھا۔ چند لمحوں تک وہ فارس کو دیکھتا رہا۔

"مسلمان ہو؟"

اس نے آہستگی سے سر کو جنبش دی۔

"کیا کھو دیا ہے؟" اس نے دوبارہ پوچھا۔

اتنے عرصے بعد۔ اسے پہلی بار احساس ہوا تھا جیسے وہ ڈاکٹر مصطفیٰ کے سامنے بیٹھا ہے۔

"سب کچھ۔"

خاموشی ایک بار پھر چھا گئی۔ وقت سرکنے لگا۔ آس پاس باتوں کا شور مدھم ہوتا کم ہو گیا۔ وہ اسی جگہ ایک ہی پوزیشن میں، بیٹھا ہوا تھا۔ اس شخص کی نگاہیں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ اب اسے آنکھیں مسلتے، آنسو پیتے، اور گہری سانس لے کر ضبط پکڑتے دیکھ سکتا تھا۔

"تمہیں پتا ہے۔ یہ مصحف میں اللہ تبارک، تعالیٰ نے تمام اصحاب کرام میں۔ صرف زید بن حارثہ کا ہی کیوں نام لیا؟"

سرد بے نام سی خاموشی میں اس شخص کی آواز کافی دیر بعد گونجی۔ وہ اینٹ پر سر رکھے کروٹ کے بل لیٹا ہوا تھا۔ سردی کی شدت سے ٹھٹھرتا ہوا۔ کپکپا بھی رہا تھا۔ نگاہیں فارس پر ہی جمی ہوئی تھیں۔ وہ ایک لمحے کے لیے بھی اس پر سے نظر نہیں ہٹا سکا تھا۔ یوں لگتا تھا وہ لمحے بھر کے لیے غافل ہو گا اور یہ نوجوان کچھ کر لے گا۔

"ایسی کتاب جس میں انبیاء اور جلیل فرشتوں کے نام لیے گئے ہیں۔ اس میں صرف ایک صحابی۔ زید بن حارثہ کا نام ہی کیوں؟"

فارس کی آنکھوں میں ایک ویرانی سی جھلک رہی تھی۔ ایک خالی پن سا انگ انگ میں اترا ہوا تھا۔ وہ اس لمحے سمجھنا بھی چاہتا تو سمجھ نہیں سکتا تھا۔ جاننا بھی چاہتا تو جان نہیں سکتا تھا۔ وہ شخص اٹھ کر بیٹھ گیا۔ چند ایک لکڑیوں کا آگ میں اضافہ کر دیا۔

"زید بن حارثہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بیٹے کے طور پر جانے جاتے تھے۔ زید بن محمد!! یہ ان کی پہچان تھی۔ جب قرآن میں منہ بولے بیٹوں کے تعارف کے حوالے سے آیت نازل ہوئی۔ تو ان



سے یہ اعزاز چھن گیا۔ یہ جو نام کے ساتھ محمد لگتا تھا۔ یہ نام ہٹا دیا گیا۔ تو یہ بات انہیں شدید غم سے دوچار کر گئی۔" دور کہیں دھند میں ہیولا سا ابھرتا دکھائی دیا تھا۔ "پھر ان کی طلاق بھی ہوئی تھی۔ اس وقت وہ بہت مشکل وقت سے گزر رہے تھے۔ اللہ سبحان و تعالیٰ نے وہ نعمتیں جو ان سے۔ اس وقت لے لی گئیں۔ ان کے بدلے میں انہیں یہ اعزاز عطا کیا۔ ان کا نام اپنی آخری عظیم کتاب میں شامل کر دیا۔ نام لے کر حوالہ دیا۔ قیامت تک پڑھی جانے والی۔ آوازیں کی۔ تابعین کی۔ اولیاء صالحین کی کتاب میں ان کا ذکر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے درج ہو گیا۔" وہ شخص اب اس کی ذہنی مردہ نگاہوں میں کوئی تاثر دیکھنا چاہتا تھا۔ جو جمود سا اس کے اعصاب پر طاری تھا اسے توڑنا چاہتا تھا۔ فارس صدمے میں تھا۔ اس پر کوئی ضرب کام نہیں کر رہی تھی۔ اس کے اعصاب نرم نہیں پڑ رہے تھے۔ اس کی اذیت کم نہیں ہو رہی تھی۔ اسے اس کے وجود میں اپنی ذات اپنا چہرہ اپنا غم نظر آنے لگا۔

"اللہ نے مجھے چھوڑ دیا ہے!" اس کے لب ہلے۔

"صرف وہی تو نہیں چھوڑتا!" بہت سال پہلے ڈاکٹر مصطفیٰ نے بھی یہی کہا تھا۔

"آپ نہیں جانتے میں کن حالات سے گزر رہا ہوں۔"

"تم بھی نہیں جانتے، میں کن حالات سے گزر کر یہاں پہنچا ہوں!" وہ مسکرایا تھا۔ فارس گردن موڑ کر اسے دیکھنے لگا۔ ہیولا پہلے ایک تھا۔ اب دو۔ اور تین ہو گئے۔ سرد تاریک رات میں کسی کی تلاش جاری تھی۔

"اس آیت سے میں نے سیکھا ہے۔ زندگی میں جب بھی۔ تم کچھ ایسا کھو دو۔ جسے کھونے کا تصور بھی نہ کیا ہو۔ تو جان لو۔ تمہیں اللہ کی طرف سے کچھ ایسا ضرور ملنے والا ہے جسے پانے کا تم نے گمان بھی نہیں کیا ہو گا۔ چھن جائے تو صبر کر لو۔ ہم نہیں جانتے۔ بدلے میں ہمیں کیا ملنے والا ہے۔ اس میں ہمارے لیے کیا مصلحت پوشیدہ ہے۔"

روانی سے بات کرتے اب وہ اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔

"زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ سے ایک پہچان لے لی گئی۔ پھر بدلے میں جو اعزاز ملا۔ اس سے اندازہ کر لو اللہ کتنا کریم ہے۔ اس کی عطائیں کتنی اعلا ہیں۔ اس کا اجر کتنا عظیم ہے۔ وہ اپنے بندوں کے غم اور بوجھ سے کبھی غافل نہیں ہوتا۔"

قدموں کی آوازیں زیادہ قریب سے آنے لگیں۔ فارس کی نگاہیں اس شخص پر ٹھہری رہیں۔

"آپ نے کیا کھویا۔"

دور کہیں سے گاڑی گزری تھی۔

"گھر، وطن، ماں، باپ، اولاد۔ خاندان۔ سب۔! ہم سوریا کے لوگ۔ ہمارے حصے میں دنیا کی ساری آزمائشیں ایک ساتھ آ گئیں!" مسکراہٹ مزید گہری ہوئی تو بھوری مائل آنکھوں کی نمی بڑھ گئی۔ اس نے اپنی ہتھیلیاں پھیلاتے ہوئے آسمان کی طرف دیکھا۔ "اللہ کریم" (اللہ کرم والا ہے)"

دیار غیر میں۔ ایک بے گھر کے۔ بے وطن۔ سخت کڑی سردی میں، وہ کھلے آسمان تلے بیٹھا۔ بات بات پہ شکر۔ اللہ کا ہی ادا کر رہا تھا۔ اس کی مسکراہٹ گہری تھی۔ سکون بھری۔ اس کی آنکھوں سے غم جھلک رہا تھا۔ صبر بھرا غم۔ اس کا خیال تھا ساری دنیا اسے ترک کر چکی تھی مگر اس کا اللہ ابھی بھی اس کے ساتھ ہی تھا۔ وہ اسے ابھی بھی اپنی آنکھوں میں لیے ہوئے تھا۔

جانے ایسا یقین، اعتماد اور قربت سوچ وہ شخص کہاں سے لایا تھا۔ اپنے پانچ جوان بچوں کو کھونے کے بعد بھی وہ ٹوٹا نہیں تھا۔ اس کی اولاد تو ابھی اس دنیا میں آئی بھی نہیں تھی۔ ابھی تو اس نے دیکھا یا چھوا بھی نہیں تھا۔ اگر اس کا دل صرف تصور سے پھٹ رہا ہے تو وہ سب کچھ آنکھوں سے دیکھ لینے کے بعد بھی اتنے صبر میں کیسے بیٹھا ہوا ہے۔

"اتنا سب کچھ کھو دینے کے بعد آپ کو کیا ملا!"

بوڑھا چند لمحوں تک اسے دیکھتا رہا۔

"مجھے اللہ ملا ہے۔" اس نے کہا۔ "پہلے میں

ایک عیسائی تھا۔ اب میں ایک مسلمان ہوں۔"

فارس وجدان کی منجمد نگاہیں اس کے چہرے پر ٹھہری رہیں۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کا کندھا تھپتھپایا۔ یوں جیسے تسلی دی ہو۔ "یہ وقت بھی گزر ہی جائے گا۔"

خاموشی ایک بار پھر چھا گئی۔ کتنی ہی دیر تک فارس اسے دیکھتا رہا۔ پھر اس کے لبوں میں جنبش ہوئی۔

"میں آپ کے جیسا نہیں ہوں۔ میں یہ نہیں سوچ سکتا کہ مجھے میرے گمان سے بڑھ کر کچھ ملے گا۔ میں یہ سوچ رہا ہوں۔ مزید مجھ سے کیا چھین لیا جائے گا۔" اس کی آنکھیں مکمل طور پر نم ہو چکی تھیں۔ وہ مایوسی کی اتھاہ گہرائیوں میں اترا ہوا تھا۔

"تم شیطان کو خود پر حاوی ہونے دے رہے ہو۔"

"یہ شیطان نہیں ہے۔ یہ میں ہوں۔ یہ میں ہو چکا ہوں۔"

بوڑھے نے تاسف بھری نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"آزمائش مومن بنانے کے لیے آتی ہے، شیطان بنانے کے لیے نہیں!"

فارس وجدان کے اندر باہر ایک دم سے خاموشی چھا گئی۔

"ایک دن تمہیں اندازہ ہوگا۔ میں کتنا درست تھا۔ تم کتنے غلط تھے۔ اس وقت جب تمہیں تمہارے حصے کا انعام ملے گا۔"

"میرے حصے میں ایسا کچھ نہیں ہوگا۔"

"برا گمان رکھو گے۔ تو برا ہو جائے گا!!"

"میں نے اچھا سوچا تھا۔ میرے ساتھ اچھا بھی نہیں ہوا!!"

"اسے کہتے ہیں۔ قسمت، نصیب، آزمائش۔"

فارس خاموشی سے اسے دیکھتا رہ گیا۔

"آج نہ سہی۔ لیکن کبھی تو تم سمجھ ہی جاؤ گے!" اپنی بات ختم کر کے وہ اینٹ پر سر رکھے سونے کے لیے لیٹ گیا۔

وہ رات فارس وجدان نے کھلے آسمان تلے ماسوائے اس کے وہاں سب ہی سکون سے بیٹھے تھے، لیٹے تھے، پڑے تھے۔ صبح وہ نیم تاریکی میں ہی اٹھ کر جانے ہی والا تھا جب دیوار کے ساتھ ترتیب سے رکھی چھوٹی چھوٹی پینٹنگز توجہ کا مرکز بن گئیں۔ بوڑھا وہیں پہلو میں ہی سویا ہوا تھا۔ اجالے میں اب وہ واضح نظر آیا تھا۔ اس کے برشز اور رنگوں سے تھیلا بھرا ہوا تھا۔ اس کی داڑھی قدرے لمبی تھی۔ آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئیں۔ کپڑے بھی کافی پرانے تھے۔ مگر ٹیلنٹ کمال کا تھا۔ اس نے چھوٹی چھوٹی پینٹنگز پر خطاطی کر رکھی تھی۔ جن میں قدرتی مناظر کی جھلکیاں نظر آ رہی تھیں۔

"خریدنا چاہو گے؟" وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ قیمت بھی بتانے لگا۔ اس نے وہیں کھڑے کھڑے اپنی جیبوں میں ہاتھ ڈالا۔ جیبیں خالی تھیں۔ والٹ گھر رہ گیا تھا۔ اس نے اپنی نفیس گھڑی اتار کر اس کے سامنے رکھ دی۔ تین پینٹنگز اٹھائے وہاں سے چلا گیا۔ ان میں ایک چھوٹی سی پینٹنگ عسریسرا کی تھی۔

خزاں بہار کا منظر دکھلاتی ہوئی۔

ایک شامی پناہ گزین کی پینٹنگ۔

☆☆☆

"تم نے۔ یہ کیا حرکت کی ہے حماد؟" کال ریسیو ہوتے ہی جمیلہ داؤد غصے سے چیخ پڑی تھیں۔

"کیسی حرکت؟" وہ ان جان ہوا تھا۔

"تم اتنا گر جاؤ گے۔ مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی!" ان کی آواز شدت جذبات سے کانپنے لگی۔ "تم نے۔ تم نے اس کا گھر اجاڑ دیا۔"

"اور جو اس نے میرے ساتھ کیا۔ اس کا کیا؟"

جمیلہ داؤد اپنی جگہ تھم گئی تھیں۔ اذیت سے آنکھیں میچ کر اپنی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔

"بچپن سے لے کر اب تک۔ میں ہمیشہ دیکھتا آیا ہوں۔ آپ نے فارس کو اہمیت دی۔ آپ نے فارس کا خیال رکھا۔ آپ نے مجھے تک بھلا دیا۔" اشتعال میں اپنی آواز پر قابو پاتے وہ سرد لہجے میں بولا تھا۔

فون کان سے لگائے جمیلہ داؤد اپنی جگہ منجمد کھڑی رہ گئی تھیں۔

"ڈیڈ ایک مشین بن گئے۔ انہوں نے خود کو مصروف کر لیا۔ اور میں؟؟ آپ سب کی اس جنگ میں۔ میں کہاں تھا ممی؟" وہ چیخ پڑا۔ ان کا شدت سے دھڑکتا دل ڈوبنے لگا۔

"اس نے علیزے کے ساتھ افیئر چلایا۔ ہمارا رشتہ ختم ہو گیا اور آپ۔ آپ پھر بھی اس کے ساتھ کھڑی رہیں۔ اس کی حمایت میں۔ آپ کے اپنے بیٹے کا معاملہ تھا۔ اور آپ۔" وہ بہت اذیت اور غصے سے کہہ رہا تھا۔ "آپ کو اس دن اس بات کی کوئی پرواہ نہیں تھی کہ مجھ پر کیا بیتے گی؟۔ اس دن بھی آپ کو یہی فکر تھی کہ فارس کے ساتھ کیا ہوگا؟ آپ لوگوں نے مجھ سے اس کی حقیقت چھپائی۔ جھوٹ بولا۔ جب وہ سارا وقت ہی ہماری زندگیوں میں تھا تو۔ آپ سب یہ کیوں کہتے رہے کہ وہ نہیں ہے؟"

ان کی آنکھ کے کنارے نم ہو چکے تھے۔ ایک بے یقینی سی تھی کہ جس اولاد کو انہوں نے شدتوں سے چاہا تھا۔ وہی اولاد ان کی ریاضت اور محبت پر شک کر رہی تھی۔

"تم۔ مجھے قصوروار ٹھہرا رہے ہو؟" ان کے لبوں میں جنبش ہوئی۔

وہ ضبط کیے چپ رہا۔

"اور اپنا موازنہ فارس سے کر رہے ہو!؟" ان کی آواز اب کپکپا رہی تھی۔

"وہ ہمارے گھر آیا تو اس وقت پانچ سال کا تھا۔ تمہارے ڈیڈ اسے چھوڑ کر چلے گئے، تمہارے دادا نے اس کا سرنیم بدل دیا۔ اس کی پہچان بدل دی۔ اسے گمنام کر دیا۔ اس کے پاس تو کوئی رشتہ ہی نہیں ہے۔ مگر تمہارے پاس، تمہارے پاس تو سب کچھ ہے حماد! میں۔ تمہارے ڈیڈ۔ دادا۔"

"کوئی نہیں ہے میرا، آپ سب مجھے بے وقوف بناتے رہے۔" بپھر کر بولا۔

"کس چیز کی کمی ہونے دی ہم نے؟" انہوں نے اذیت سے پوچھا۔ "میں پہلی بار فارس کو چھوڑ کر گئی تھی تو وہ تمہاری وجہ سے۔ تم امریکا میں تھے۔ میرے بعد اس پر کیا گزری تمہیں کوئی اندازہ نہیں۔ دوسری بار تمہاری غلطی سے اس کے ساتھ جو کچھ ہوا۔ کیا اس سے بھی غافل ہو سکتے ہو؟"

حماد کے ہاتھ بھنچ گئے۔

"اور تیسری بار جب میرا اس سے رابطہ ہوا۔ میں یہاں امریکا میں تمہارے ساتھ۔ چوبیس گھنٹے رہی ہوں۔ فارس کے پاس تو میں صرف دو ہفتوں کے لیے جاتی تھی۔ تمہیں وہ دو ہفتے نظر آ رہے ہیں کہ ان میں ممی تمہارے پاس نہیں تھیں۔ وہ پورا سال۔ یا دن۔ مہینے۔ جب میں تمہارے ساتھ تھی۔ ان کا کیا؟" وہ چیخ پڑیں۔ حماد لہو رنگ آنکھوں کے ساتھ فون، کان سے لگائے کھڑا رہا۔

"میں نے کبھی تم پر کسی کو فوقیت نہیں دی۔ فارس کا جو حق تھا میں تو اسے وہ بھی نہیں دے سکی۔ اسے اس گھر میں۔ اس چھت کے نیچے ہونا چاہیے تھا۔ اسے تمہارا کمرہ تمہارے ساتھ شیئر کرنا چاہیے تھا۔ تم دونوں کے کپڑے بھی ایک جیسے ہونے چاہیے تھے۔ کھانا بھی ایک ہی ٹیبل پر۔ اسکول بھی ایک ہی جیسا۔ یہ ہوتی ہے اولاد کی مساوات۔ تمہیں سب ملا۔ اسے کچھ نہیں ملا۔ اور تمہیں۔ تمہیں ان کچھ چیزوں سے بھی مسئلہ ہے جو اسے مل گئیں؟"

حماد دم سادھے اپنی ماں کو سن رہا تھا۔

"تم بیمار ہوتے تھے تو میں تمہارے لیے جاگتی تھی۔ فارس کے ساتھ تو کوئی نہیں ہوتا تھا۔ اس لیے پلیز۔ کم از کم فارس کے ساتھ اپنا موازنہ مت کرو۔ اس کے ساتھ تمہارا موازنہ نہیں بنتا!"

"آپ ابھی بھی۔ فارس کی سائیڈ لے رہی ہیں۔ مجھے شک ہونے لگا ہے جیسے وہ آپ کی سگی اولاد۔"

"کاش!۔" انہوں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "کاش وہ میری سگی اولاد ہی ہوتا۔ اسے میں نے جنم دیا ہوتا۔ پھر شاید میں اس کے لیے وہ سب کر سکتی جو میں نے تمہارے لیے کیا۔ صلہ مجھے تم سے بھی نہیں چاہیے۔ کہ ماں کو اولاد سے کوئی اجر نہیں چاہیے

ہوتا۔ لیکن اتنی بے حسی بھی نہیں ہونی چاہیے کہ ماں کا درد سمجھ ہی نہ سکے۔"

"مجھے پہلے صرف شک تھا۔ اب یقین ہو چکا ہے۔ آپ کے لیے صرف وہ اہم ہے۔ اس کی ذات۔ اس کے غم۔ اس کی خوشیاں اس کی زندگی۔"

"تب ہی تم نے اسے برباد کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کا گھر اس کی زندگی اجاڑ دی۔" انہوں نے کرب سے پوچھا۔

"ہی براٹ اٹ اپون ہم سیلف! (یہ سب اس نے خود کیا ہے اپنے ساتھ)" وہ چیخا۔ "ہی انٹروادن ہوا تھ فیچر ڈ ان مائی لائف (وہ ایک ہی تھا جس نے میری زندگی میں مداخلت کی تھی)۔ اس نے تابیر کو مجھ سے چھینا تھا۔"

جمیلہ داؤد کو شاک لگا۔

"حماد یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ تابیر نے فارس کو خود اپروچ کیا تھا۔ وہ اس میں انٹرسٹڈ تھی۔ تم نے کبھی آ کر ہم سے بات کی ہوتی تو یہ معاملہ بھی واضح ہو جاتا۔ وہ تمہارے ساتھ اپنے رشتے میں سیریس تھی ہی نہیں۔ اس نے فارس کے ساتھ افیئر چلانے کی کوشش کی۔ جب کوئی رسپانس نہیں ملا تو تمہارے دادا سے وہ کو اس کر دی۔ تمہیں لگتا ہے بابا کو بے وقوف بنانا آسان ہے؟ اگر اس بات میں ذرا سی صداقت ہوتی تو وہ دونوں آج ساتھ ہوتے۔ تمہارے دادا نے تم از کم تابیر کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی تھی۔ اس نے تمہارا رشتہ ختم کیا تھا۔ کیونکہ وہ ان کی نظروں سے گر چکی تھی۔"

وہ لب بھینچے خاموش رہا۔

"معافی مانگ لو اپنے دادا سے۔ پلیز حماد۔ واپس آ جاؤ۔!"

"دادا نے دھمکی دی ہے۔ گھر سے نکالا ہے۔ ایسے تو پھر ایسے ہی سہی۔"

"ایک غلطی کر چکے ہو۔ دوسری غلطی مت کرو۔" انہوں نے روتے ہوئے سمجھانا چاہا۔

"میں نے کوئی غلطی نہیں کی۔ اپنا بدلہ لیا ہے۔ اور شادی تو میں اسی سے کروں گا۔ چاہے آپ لوگ اعتراض کریں یا انکار!" اس نے حتمی لہجے میں بات کر کے کال کاٹ دی تھی۔ جمیلہ داؤد اپنی جگہ گنگ سی رہ گئی تھیں۔

☆☆☆

ہارون شیرازی دیوار گیر کھڑکیوں کے سامنے لندن کی بلند ترین عمارتوں پر نگاہیں جمائے کھڑا تھا۔ اندھیرے میں روشنیاں سی بکھری ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ مکمل بیدار نائٹ لائف میں اسے اپنے آس پاس کہیں موت کا گمان ہو رہا تھا۔ دھماکے سے جیسے کچھ پھٹنے کو ہو۔ زندگی اجڑنے اور ذات کا تماشا بننے کو ہو۔

"میں برباد کر دوں گا!! سب کو تباہ کر دوں گا!"

فارس وجدان کی آواز گھر کی دیواروں سے ٹکرا کر بار بار پلٹ رہی تھی۔ ان کے تمام تر سوئے ہوئے خدشات بیدار ہو چکے تھے۔ خوف کو آواز مل گئی تھی۔ ذہن ماؤف سا ہو رہا تھا۔ فارس وجدان اعظم شیرازی کو دھمکی دے کر گیا تھا۔ اس کی وہ دھمکی اسے پریشانی جتلا کر رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا کسی بھی لمحے ان کی خفیہ شادی کی خبریں سرعام پھیل جائیں گی۔ آرزو جہانگیر کا قصہ پھر سے شروع ہو جائے گا۔ ان کے کردار پر سوالیہ نشان لگ جائے گا۔

ان کا خیال تھا اعظم شیرازی معاملے کو اپنے طور پر سلجھا دیں گے۔ ویسے ہی جیسے وہ ہمیشہ سے کرتے آ رہے تھے۔ مگر ان کی جانب سے مکمل خاموشی تھی۔ انہوں نے ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں سنایا تھا۔ کوئی حکم نہیں دیا تھا۔ اب جب وہ کچھ نہیں کر رہے تھے تو اسے ہی کچھ کرنا تھا۔ ساری رات وہ سوچتا رہا۔ اکیس سالوں کے بعد اچانک ملاقات کا فیصلہ کچھ مشکل تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ غصے اور انتقام میں کچھ کرے۔ وہ اس سے ملاقات کر لیں۔ وہ اس طوفان کے آگے بند باندھ سکیں۔

سوال یہ تھا وہ اسے کیا دے سکتا ہے۔؟ پیسے میں بہت طاقت ہوتی ہے۔ وہ اس کی زندگی کو یکسر بدل سکتا ہے۔ وہ اپنے اور اس کے معاملات کو ٹھیک



کر سکتا ہے! فارس سب بھول جائے گا۔ جیسے وہ بھول گئے تھے۔

ہارون نے شام تک حیدر کو حکم دیا اور وہ اسے فارس وجدان کے فلیٹ تک لے کر گیا۔ ایک بیگ ملازم کے ہاتھ میں تھا۔

فلیٹ کی بیل بجاتے خطر سا کھڑا رہا۔ بار بار کلائی موڑ کر وقت دیکھتا اور اندر سے ابھرتے اضطراب پر قابو پاتا رہا۔

کچھ ہی دیر میں دروازہ کھل گیا تھا۔

فارس وجدان سامنے کھڑا تھا۔ لمحے بھر کے لیے اس کی سرخی مائل آنکھوں میں آگ کا تاثر بھڑک کر سرد ہو گیا تھا۔ لب سختی سے بھنچے رہے تھے۔ گرفت ہینڈل پر جمی رہی۔ اسے اپنے باپ کا چہرہ یاد نہ ہوتے ہوئے بھی یاد رہ گیا تھا۔

"کیا ہم بات کر سکتے ہیں؟" ہارون کی آنکھوں میں دکھ کی شبیہ نظر آ رہی تھی۔ چہرے سے پریشانی کے تاثرات نمایاں ہو رہے تھے۔ دو دن پہلے جس حال میں اسے دیکھا تھا۔ وہ منظر اور حالت۔ وہ ابھی بھی اس پر حاوی تھی۔ اس کی کیفیت پہلے سے کچھ بھی مختلف نہ تھی۔

حیدر اس کے پیچھے ہی کھڑا تھا۔ سر جھکائے مؤدب سا۔

"شاید آپ غلط جگہ پر آ گئے ہیں!"

"میں تم سے ضروری بات کرنا چاہتا ہوں!"

وہ چند لمحوں تک انہیں دیکھتا رہا۔ ہارون شیرازی کا خیال تھا وہ دروازہ بند کر دے گا۔ مگر اس نے انہیں اندر آنے کا راستہ دے دیا۔ کچھ حساب باقی تھے۔

ہارون شیرازی نے اندر داخل ہوتے ایک طائرانہ نگاہ اطراف میں دوڑائی۔

اس کا چھوٹا سا فلیٹ بہت سرد ہو رہا تھا۔ کھڑکیوں پر پردے گرے ہوئے تھے۔ روشنیاں مبہم سی۔ نیلگوں تاثر لیے ہوئے تھیں۔ فلیٹ تقریباً خالی تھا۔ بس لاؤنج میں دو صوفے رکھے نظر آ رہے تھے۔

وہ جینز پر ہلکے رنگ کا سویٹر زیب تن کیے۔ اپنی سرخ اور متورم آنکھوں کے ساتھ سامنے بیٹھ گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں شناسائی کی کوئی رمق نہیں تھی۔ نہ کوئی شکوہ۔ نہ کوئی شکایت۔ نہ گلہ۔

رویہ ایسا جیسے وہ کسی اجنبی کے سامنے بیٹھا ہو۔ کوئی ان جان شخص بس ایسے ہی اس کے گھر کے اندر آ گیا ہو۔

"مجھے بہت دکھ ہے جو تمہارے ساتھ ہوا۔" ہارون نے گفتگو کا آغاز کیا۔ وہ سرد تاثرات کے ساتھ چپ چاپ بیٹھا رہا۔

"حماد نے جو کیا اس کی میں تم سے معافی مانگتا ہوں! یہ بہت غلط حرکت تھی۔" ہارون نے مزید کہا۔

جلتی ہوئی آگ میں فارس وجدان کو کھڑا کر دیا گیا۔

"میں تمہارے اس نقصان کو کمپنسیٹ کرنا چاہتا ہوں!" اشارہ ملتے ہی ملازم نے اس کے سامنے پیسوں سے بھرا ایک بیگ رکھ دیا۔

شعلوں کی تپش اب وجود سے آنکھوں میں اتر آئی تھی۔ لب باہم پیوست رہے۔ وہ انجبی نگاہوں سے انہیں دیکھتا رہا۔ وہ اس کی آنکھوں کے تاثر سے کچھ تذبذب ہوئے۔

اس نے ابھی تک کچھ نہیں کہا تھا۔ مگر وہ اسے سننا چاہتے تھے۔ کوئی مطالبہ۔ اعتراض۔ شکوہ۔ کوئی بات ہی سہی۔ تاکہ وہ کھل کر اس کے سامنے اپنی آفر رکھ سکیں۔ مگر اس نے لب سینے رکھے۔ اس کی خاموشی نے ہارون کا اضطراب بڑھا دیا۔

"میں چاہتا ہوں تم یہ سب بھول کر موو آن کر جاؤ۔ میں ہر طرح سے تعاون کے لیے تیار ہوں۔"

وہ اسے فنانشلی سپورٹ کرنے کی بات کر رہے تھے۔ بھاری رقم اور بزنس کی آفر دے رہے۔ وہ اس کا آخری دم تک ساتھ دیں گے۔

ان کے تمام دعوؤں میں ولدیت کا ذکر کہیں نہیں تھا۔ ہارون نے یہ نہ کہا وہ اسے اپنا لیں گے۔ اپنے نام اور اس کی حقیقی پہچان سے نواز دیں گے۔

ان کا دماغ حساب کتاب میں بہت تیزی سے چل رہا تھا۔ وہ اس کے زخموں پر مرہم پیسوں سے رکھ رہے تھے۔ وہ اس کی محرومیوں کو آسائشات سے تول رہے تھے۔ پچویشن ایسی بنا رہے تھے جیسے بس اب لوٹ آئے ہوں۔ سب ٹھیک کرنے کے لیے۔ سارے حقوق۔ سارے فرائض ادا کرنے کے لیے۔

وہ انہیں دیکھ رہا تھا۔ انہیں سن رہا تھا۔

" آپ ہمیشہ سے یہی چاہتے تھے! ہمیشہ سے۔ " اس کے لب ہلے۔ ہارون شیرازی بات ادھوری چھوڑ کر اسے ناسمجھی سے دیکھنے لگے۔

"اسی لیے۔ آپ کبھی بھی۔ میرے پیچھے نہیں آئے۔"

ہارون شیرازی ایک دم سے گڑبڑا گئے جتنی توجہ اور خاموشی سے وہ ان کی بات سن رہا تھا۔ انہیں لگا وہ اسے قائل کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔

"فارس۔"

"اعظم شیرازی کا وعدہ صرف ایک بہانہ تھا۔ مجھے چھوڑنا آپ کا ذاتی فیصلہ آپ کی اپنی خواہش تھی۔"

ہارون شیرازی اپنی جگہ تھم گئے۔ ان کا پورا وجود جیسے کسی آہنی شکنجے میں جکڑا گیا۔ جس گفتگو سے وہ بچنا چاہ رہے تھے وہ شروع ہو چکی تھی۔ جس معاملے کو وہ اکیس سالوں پہلے دفن کر چکے تھے وہ پھر سے زندہ ہو رہا تھا۔ وہ یہاں اس لیے نہیں آئے تھے۔ اس بحث میں پڑنے۔ ان سوالات میں الجھنے نہیں آئے تھے۔

ان کا سر بے اختیار نفی میں ہلا۔ "ف۔ راس۔ ایسا نہیں ہے!"

"ایسا ہی ہے!" اس کی کاٹ دار آواز سناٹے میں گونج کر رہ گئی۔

" فارس! میں، میں بہت مجبور تھا۔ تم۔ اس وقت بہت چھوٹے تھے، تم شاید نہیں جانتے لیکن تمہارے دادا نے۔" وہ شروع ہو گئے۔

فارس وجدان کی خاموش نگاہیں ہارون شیرازی کے چہرے پر ٹھہری رہ گئیں۔ وہ خود کو بری الزمہ کرتے ہوئے کسی معاہدے کا حوالہ دے رہے تھے۔ وہ اسے دادا کے فیصلوں سے آگاہی دے رہے تھے۔ وہ کتنے مجبور، بے بس اور لاچار تھے، انہیں نہ چاہتے ہوئے بھی اسے چھوڑنا پڑا تھا۔

اور وہ خاموش ویران آنکھوں سے اپنے باپ کو دیکھ رہا تھا۔

ہارون شیرازی کی تحریر بالکل صاف تھی۔ ان کے نامہ اعمال میں کسی ظلم کا حوالہ نہیں تھا۔ حقوق اور فرائض کی کوئی بات نہیں تھی۔ ذکر صرف ایک " مجبوری" کا تھا۔ وہ ہر الزام سے بری تھے۔ جو بھی ہوا تھا۔ اعظم شیرازی سے ہوا تھا۔ وہ ان کے باپ تھے۔ وہ ان کی حکم عدولی نہ کر سکے۔ وہ اتنے کمزور تھے کہ اسٹینڈ نہ لے سکے۔

پتھر کے مجسمے میں ڈھلا ہوا فارس اپنے باپ کو دیکھ رہا تھا۔ وہ باپ جو بائیس سالوں کے بعد اس سے ملاقات کر رہا تھا۔ وہ باپ جسے اپنی کسی غلطی کا ادراک تھا نہ احساس۔ نہ کسی فیصلے پر دکھ تھا۔ نہ پشیمانی۔ کیسا چہرہ تھا جو انہوں نے پینٹ کر رکھا تھا۔ اپنی ہی مرضی کا۔ اپنے حساب سے۔ کیسی شان دار تصویر تھی ان کی۔ جس میں وہ خود کو کھڑا رکھتے تھے اور کیسا عظیم سا پتلا تھا ان کے نفس کا۔ جس کے سامنے وہ خود ہی اپنا سر جھکائے ہوئے تھے۔

" اعظم شیرازی کو بیچ میں مت لائیں۔" صوفے سے اٹھتے ہوئے اس نے تحمل سے دانت پیس کر متنبہ کیا۔ " جس طرح میں اس وقت آپ کے اور اپنے بیچ کسی کو نہیں لا رہا۔ آپ بھی مت لائیں۔ " اس کی آنکھیں لہو رنگ ہو رہی تھیں۔ آواز غصیلی۔ وجود سلگ رہا تھا۔

"فارس!"

" مجھے سب سے پہلے ملازم کا بیٹا آپ نے کہا تھا۔ مجھے یتیم سمجھ کر میرے سر پر پہلا ہاتھ آپ نے رکھا تھا۔ میری آواز سن کر کال آپ نے کاٹی تھی۔ مجھے بازوؤں سے پکڑ کر خود سے الگ آپ نے کیا تھا۔ " اس کی مضبوط آواز میں بے انتہا درد اور غصہ جھلک رہا تھا۔ کرب اور شدت نظر آ رہی تھی۔



" وہاں کوئی اعظم شیرازی نہیں تھا! وہاں کوئی اعظم شیرازی کبھی نہیں تھا! " وہ حلق کے بل چیخا۔ ہارون شیرازی کو اپنے اندر سب فنا ہوتا ہوا محسوس ہوا۔

" فیصلہ آپ کے باپ نے کیا۔ آپ نے ایک باپ ہو کر کیسے مان لیا۔ " اس نے درشتی سے پوچھا۔ وہ لاجواب ہو گئے۔ اتنے سرد ماحول میں انہیں اپنی ہتھیلیاں بھیگتی ہوئی محسوس ہوئیں۔

" ڈر تھا جائیداد سے عاق نہ کر دیں۔ محبت جائیداد سے تھی۔ جائیداد کے لیے مجبور ہوئے۔ "

جس آئینے میں وہ اپنا عکس دیکھتے تھے ٹوٹ کر چور ہوا۔ اس کے ٹکڑے روح کے اندر گہرائیوں تک اترتے گئے۔

" کیا مجبوری میں اولاد کا قتل جائز ہے؟ اسے چھوڑنا، اسے بھولنا اس کی ذمہ داری سے ہاتھ کھینچ لینا بھی؟ " وہ پھنکارا۔ " کیا کہہ رہے تھے آپ۔ بیٹے کی غلطی؟ اعظم شیرازی کا فیصلہ؟ میرے ساتھ ان اکیس سالوں میں جو کچھ بھی ہوا اس کے ذمہ دار صرف آپ ہیں۔ میرے ہر دکھ اور ہر غم کی وجہ آپ ہیں۔ میری بچی کی جان آپ کی وجہ سے گئی ہے۔ وہ گھٹیا لڑکی مجھے میرے منہ پر ناجائز کہہ کر گئی۔ آپ کی وجہ سے۔ اور آپ کو لگتا ہے آپ سے کبھی کوئی غلطی نہیں ہوئی ہے؟ "

اپنے ضمیر کے ٹوٹے ہوئے آئینے میں اپنا بکھرا ہوا عکس دیکھتے، اندر کی جنگ میں لڑتے، کٹتے، مرتے ہوئے وہ کس قدر کوشش سے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

ان کی سالہا سال سے بند آنکھیں کھل گئی تھیں۔

" اور آج۔ آپ کو میرا ایک نقصان نظر آیا۔ اور اسے کمپنسیٹ کرنے چلے آئے۔ ان پیسوں سے؟ " آنکھوں سلگ اٹھیں۔ " آپ کو کیا لگا میں بھی آپ جیسا ہوں؟ پیسے دیکھ کر اولاد کا غم بھول جاؤں گا؟ آپ کی غلط ... آپ کا ظلم بھول جاؤں گا؟ " اس کے الفاظ چابک تھے۔ ان کا وجود لہولہان ہو گیا۔

" فارس۔ بیٹے۔ " وہ ایک دم سے بے اختیار ہو کر آگے بڑھے۔

" میرا نام مت لیں۔ " اس نے ضبط کر کے پیچھے ہٹتے ہوئے انہیں روکا۔ ہاتھ بڑھا کر ایک فاصلہ قائم رکھنے کی تاکید کی۔ " اور مجھے پلیز بیٹا مت کہیں۔ یہ حق صرف میرے باپ کا تھا اور میرا باپ مر چکا ہے۔ "

ان کا دل بھنچ گیا۔

" اکیس سال پہلے مجھے آپ کی ضرورت اور چاہت تھی۔ پھر میں نے آپ کو مار دیا۔ میں نے ساڑھے چھ سال کی عمر میں۔ اپنے اس دماغ میں۔ آپ کو ایک نہر میں گرا کر مار دیا۔ پھر پہاڑ سے گرا کر مارا۔ پھر ایکسیڈنٹ میں۔ "

ان کی سانسیں تھم گئیں۔ آنکھوں میں ایک کرب سا جھلکنے لگا۔

" پھر میں نے آپ کی قبر بنائی۔ دفن کیا اور پھر سمجھ لیا میں یتیم ہوں۔ میرے ماں یا باپ نہیں ہیں۔ میں ہر رات یہی کرتا تھا! میں ہر رات آپ کو اور آرزو جہانگیر کو دفن کرتا تھا ایسے آسانی رہتی تھی۔ بھولنے میں آسانی رہتی تھی۔ "

ان کی آنکھیں مکمل بھیگ گئیں۔ وہ کچھ بھی کہنے کے قابل نہ رہے۔

" میں نے آپ کو اندر آنے دیا۔ سوچا سن لوں۔ اعظم شیرازی کا بیٹا آج مجھ سے کیا کہنے والا ہے۔ ہو سکتا ہے میری بچی کی تعزیت کے لیے آیا ہو۔ ہو سکتا ہے اسے اپنے ظلم کا احساس ہو گیا ہو اور معافی مانگنے آیا ہو۔ لیکن ہارون اعظم شیرازی پیسوں سے بھرا ہوا ایک بیگ لایا ہے۔ " اس نے آنکھوں میں نفرت لیے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ " اسے ڈر ہے کہ میں چیخ چیخ کر پوری دنیا کو یہ نہ بتا دوں کہ میرا باپ کون ہے۔ " اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ کنپٹی کی رگیں ابھری ہوئی تھیں۔

ہارون شیرازی زمین کی تہوں میں اترتے چلے گئے۔

"اگر آج آپ بھری دنیا میں اعلان بھی کریں کہ میں آپ کا بیٹا ہوں تو میں آپ سے لاتعلقی کا اظہار کروں گا۔ میں اپنی رگوں سے آپ کا خون نہیں نکال سکتا۔ لیکن میں اپنے نام کے ساتھ آپ کا نام نہیں لکھوں گا!"

اس نے میز سے پیسوں کا بیگ اٹھا کر ان کے قدموں میں پھینک دیا۔ کچھ نفرت اور حقارت سے۔

"ہارون شیرازی نہیں جانتا ایسی تربیت نہیں ہوئی میری کہ پیسوں کو دیکھ کر پاگل ہو جاؤں۔ اور ایسے چھوٹے غم بھی نہیں ہیں میرے کہ دنیا کی دولت ان کا مداوا کر سکے۔"

بس وہ آخری وار۔ وہ آخری حملہ اور ضرب تھی اور ان کا خودساختہ بت پاش پاش ہوگیا۔

"اب آپ جا سکتے ہیں!" اس نے دروازہ کھول کر انہیں جانے کا راستہ دکھایا۔ وہ کچھ دیر تک یونہی کھڑے رہے۔ قدم اٹھائے تو بھاری محسوس ہوئے۔ نگاہیں بھٹک کر دوبارہ اس کے چہرے تک گئیں۔ وہ چہرہ جس میں ہمیشہ انہیں آرزو جہانگیر کی جھلک نظر آتی تھی۔ وہ آنکھیں جو اس کے دھوکے کی یاد دلاتی تھیں۔ وہ تاریک، اور ویران آنکھیں۔ وہ کسی آرزو جہانگیر کی نہیں تھیں۔ وہ چہرہ بھی اس کا نہیں تھا۔ وہ دروازے تک آئے اور رک گئے۔ گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ وہ بھی انہیں ہی دیکھ رہا تھا۔ جیسے کسی دشمن۔ کسی حریف، کسی ظالم کو دیکھا جاتا ہے۔ وہ اس کی آنکھوں سے جھلکتے شدید نفرتوں کے طوفان میں گم ہونے لگے۔

اکیس سال۔ کسی نے ہر رات انہیں مارا اور وہ دن کے اجالے میں پھر سے زندہ ہوئے۔

اکیس سالوں تک۔ کوئی ان کی مسلسل قبر بناتا رہا اور وہ دفن ہو کر باہر نکلتے رہے۔

اکیس سالوں تک۔ کوئی سزا بھگتا رہا ان غلطیوں کی جو وہ مسلسل کرتے رہے۔

وہ جسے ڈھال ہونا چاہیے۔ وہ تلوار بن گیا۔ جسے وار سہنا چاہیے۔ وہ مقابل ہوگیا۔

وہ فلیٹ سے باہر نکلے اور دروازہ زور سے بند ہوگیا۔ وہ راہداری میں بیگ ہاتھ میں لیے اپنے ملازم کے ہمراہ کھڑے تھے۔ آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ سر جھکا ہوا تھا۔ جس اعتماد کے ساتھ وہ آئے تھے وہ ریزہ ریزہ ہو چکا تھا۔ جس استحقاق سے خسارہ پورا کرنے چاہتے تھے، وہ استحقاق مٹی ہوا تھا۔

اور اندر فارس وجدان دروازے کے ساتھ پشت لگائے، ٹھنڈے فرش پر اپنا سر ہاتھوں میں دبائے بیٹھا رہ گیا تھا۔

☆☆☆

مرے لیے کون سوچتا ہے؟
جدا جدا ہیں مرے قبیلے کے لوگ سارے
جدا جدا سب کی صورتیں ہیں۔
سب ہی کو اپنی انا کے اندھے کنویں کی تہ میں
پڑے ہوئے
خواہشوں کے پنجر
ہوس کے ٹکڑے
حواس ریزے
ہراس کنکر تلاشنا ہیں
سبھی کو اپنے بدن کی شہ رگ میں
قطرہ قطرہ لہو کا لاوا انڈیلنا ہے
سبھی کو گزرے دنوں کے دریا کا دکھ
وراثت میں جھیلنا ہے
مرے لیے کون سوچتا ہے
سبھی کی اپنی ضرورتیں ہیں
مری رگیں پھیلتی جراحت کو کون بخشے
شفا کی شبنم
مری اداسی کو کون بہلائے
کسی کو فرصت ہے مجھ سے پوچھے
کہ میری آنکھیں گلاب کیوں ہیں
مری مشقت کی شاخ عریاں پر
سازشوں کے عذاب کیوں ہیں
مری ہتھیلی پہ خواب کیوں ہیں
مرے سفر میں سراب کیوں ہیں
مرے لیے کون سوچتا ہے
سبھی کے دل میں کدورتیں ہیں
(محسن نقوی)



☆☆☆

کروٹوں پر کروٹیں بدلتے وہ کچھ بے چینی اور بے قراری کے عالم میں اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ اس کے کمرے کی کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں۔ پھر بھی دم گھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ سلیپنگ پلز سے کوئی افاقہ نہیں ہوا تھا۔ بے آرامی وجود کا حصہ رہی تھی۔ وہ سر تھامے کتنی ہی دیر تک بیٹھا رہا۔ ایک عجیب سی منجمد کرتی ہوئی روٹین اب زندگی کا خاصا ہو چکی تھی۔ نہ اسے اپنی ذات سے کوئی سروکار رہا تھا۔ نہ زندگی کی کوئی فکر تھی۔ وہ پاکستان لوٹ آیا تھا۔ اپنا رابطہ اور تعلق ہر کسی سے ختم کرنے کے باجود اسے اپنا وجود مختلف ڈوریوں سے جڑا ہوا۔ لپٹا ہوا۔ بھٹکتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔

سکون ختم ہو چکا تھا۔ بے قراری انگ انگ میں گھر کر چکی تھی۔ صدمے پر صبر آگیا تھا۔ مگر تکلیف پھر بھی محسوس ہوتی تھی۔

وہ صبح سے شام تک کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے، مارگلہ کی پہاڑیوں پر بے مقصد ٹہلتے، کسی بنچ پر مجسمے میں ڈھل کر وقت گزار دیتا۔

گھر آتا تو دم گھٹتا اور چیخنے کا دل چاہتا۔ سناٹے سے وحشت ہوتی۔ ابھی بھی اس کی کیفیت ایسی ہی تھی۔

آہٹ کا احساس ہوا تو چونک کر اٹھ بیٹھا۔ اس کا فلیٹ تیسری منزل پر تھا۔ مکمل طور پر محفوظ کہ دروازہ بھی لاکڈ رہتا تھا۔ اٹھ کر باہر آگیا۔ سامنے ہی گیلری میں سایہ سا لہرایا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر ڈنڈا اٹھا لیا۔ دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہوگیا۔ ڈور سلائیڈ ہوتے ہی کسی نے اندر سر ڈالا۔ وہ گھما کر مارنے ہی لگا تھا کہ پورے چاند کی روشنی میں گھنگھریالے بال نمایاں ہوئے۔ پھر عینک۔ پھر چہرہ۔

"کوئی ایک کام تو تم نارمل انسانوں جیسا کر لیا کرو!" راحم آفاق پر نظر پڑتے ہی اسے تپ چڑھی۔ جو بھاری ڈنڈا ہاتھ میں تھا اسے بڑے صبر کے ساتھ نیچے کیا ورنہ دل یہ ہی چاہ رہا تھا کہ وہ اسے جڑ دے۔

"دروازہ بند تھا یار! میں اندر کیسے آتا؟" معصومیت کی انتہا لنگڑا کر چلتا صوفے پر ڈھے گیا۔ جھٹ سے جوتا اتارا۔ ریلنگ پھلانگتے وقت پاؤں کہیں پھنس گیا تھا اور نتیجتاً بہت سخت چوٹ آئی تھی۔

"ڈور بیل ڈیکوریشن کے لیے نہیں لگائی گئی!" فارس اس کے سر پر کھڑا تھا۔

"اوہ مجھے بالکل پتا نہیں تھا!" جرابیں اتار کر زخم کا معائنہ کرتے سر اٹھایا۔ نیم تاریکی میں وہ سیاہ جینز پر سفید رنگ کی شرٹ زیب تن کیے کھڑا تھا۔ آنکھوں کے حلقے نمایاں تھے، رنگت بھی زرد۔ چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔ ویرانی خاموشی اور سناٹا۔ اندر بھی اور باہر بھی۔ اس کے چھوٹے سے فلیٹ میں زندگی بس اس دل تک محدود تھی جو دھڑک رہا تھا۔ ورنہ وجود تو ایک زندہ لاش جیسا تھا۔

اپنے زخم کو چھوڑ چھاڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ "تم پاکستان آگئے اور مجھ سے رابطہ نہیں کیا۔!"

"میں نے ضروری نہیں سمجھا!" مڑ کر کچن میں چلا گیا۔ کیبنٹ سے فرسٹ ایڈ باکس نکال کر اس کے سامنے میز پر رکھ دیا۔ راحم ہنوز اپنی جگہ کھڑا رہا۔

"تو تم نے ضروری نہیں سمجھا!" اس کا لہجہ چبھتا ہوا تھا۔

"زخم صاف کر لو، انفیکشن نہ ہو جائے!" اس کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی اسے گھونسا پڑا تھا۔ وہ میز پر لڑھک کر نیچے جا گرا۔ ہونٹ کا کونا پھٹ گیا۔ خون کی دھار بہہ نکلی۔

"بہت کھجلی ہو رہی تھی اس ہاتھ میں۔" اپنے ہاتھ کو جنبش دیتے اس نے کہا۔ گریبان سے دبوچ کر دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ اس نے راحم کو اس سے پہلے اس قدر شدید غصے میں نہیں دیکھا تھا۔ "پانچ مہینے ہو گئے ہیں مجھے تمہیں ڈھونڈتے ہوئے اور تم نے ضروری نہیں سمجھا!" آنکھوں میں قہر لیے اس کی گرفت سخت پڑی تھی۔ وہ سر جھکائے چپ رہا۔

وہ اس کا گریبان چھوڑ کر بکتا جھکتا سیدھا کمرے میں گیا۔ لائٹس آن کر کے۔ اس کا سامان

مشتعل ہو کر الٹ پلٹ کرتا ہوا۔ کچھ ڈاکومنٹس تھے، بس کے ٹکٹس،۔ اور ایک ہینڈ گن۔ وہ اسے اٹھائے باہر آیا۔

"پنڈی کیوں جا رہے ہو تم؟ اور یہ گن کس لیے ہے؟" اس کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔ حالات بدل چکے تھے، وقت گزر چکا تھا مگر راحم آفاق کے سامنے وہ ہمیشہ وہی ٹین ایجر فارس ہو جاتا تھا جسے کچھ جواب اور وضاحتوں کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ بس خاموشی اور۔ صرف خاموشی۔

"کچھ پوچھ رہا ہوں میں تم سے؟" وہ پھٹ پڑا۔ وہ دم سادھے چپ رہا۔

"اس لیے کہ اس گھٹیا لڑکی نے تمہارے بھائی سے شادی کر لی تو تم نے اپنی زندگی برباد کرنے کا فیصلہ کر لیا؟ یہ نہیں سوچ رہے کہ اچھا ہوا۔ وہ ناگن تمہاری زندگی سے نکل گئی؟"

فارس کی مٹھیاں سختی سے بھنچ گئیں۔ اس کی سرخی مائل آنکھوں میں قہر کی نمی بڑھتی گئی۔

"کیا پلان ہے تمہارا؟ اب کیا کرنا چاہتے ہو تم؟" خاموشی چھائی رہی۔

"بتاؤ مجھے یہ سب میرا وہم اور شک ہے۔ تم ایسے کچھ نہیں کر رہے۔" اسے گریبان سے دبوچ کر جھنجھوڑ ڈالا۔

"یہ گن میری پروٹیکشن کے لیے ہے اور راولپنڈی میں جاب کے لیے جا رہا ہوں۔" اس نے سختی سے اپنا گریبان چھڑا لیا تھا۔ ضبط سے چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ آنکھوں کی نمی بڑھ چکی تھی۔

راحم لب بھینچے اسے دیکھتا رہا۔ انداز سے واضح تھا اسے فارس کی کسی بات پر یقین نہیں آیا تھا۔

"یہ ٹھیک نہیں ہے۔ جو تم سوچ رہے ہو۔ یا جو کرنا چاہ رہے ہو۔ فارس یہ ٹھیک نہیں ہے!"

وہ تحمل سے چند لمحوں تک راحم کو دیکھتا رہا پھر اس نے لاؤنج ٹیبل کی دراز سے کچھ کاغذات نکال کر اس کے سامنے رکھے۔ اپائنٹمنٹ لیٹر اسے پنڈی سے موصول ہوا تھا۔ جس کمپنی کی طرف سے۔ اس کمپنی کا نام بھی لکھا تھا۔ اس کی لائسنس شدہ گن پچھلے پانچ ماہ سے اس کے پاس تھی۔ یہ وقت کافی تھا۔ کسی پر حملہ کرنے۔ کسی کی جان نکالنے کے لیے بھی۔

"شاید تم نہیں جانتے۔ تمہارے صاحب کا پوتا اپنی بیوی کے ساتھ لندن میں ہے۔"

راحم کے اندر کے تمام خوف اور خدشات جھاگ کی طرح بیٹھ گئے۔ اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرتے، اس نے گہری سانس لے کر اپنے اعصاب پر قابو پانے کی کوشش کی تھی۔

پھر وہ اس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔ لندن میں وہ جتنا عرصہ اس کے ساتھ رہا۔ ہمیشہ سوال نظر انداز کر کے وضاحتوں کو چھپا لیا کرتا تھا۔ سن کر ان سنی کرتا ہوا۔ کوئی کیا سوچتا ہے۔ اس سے بے پرواہ نظر آتا ہوا۔ مگر پہلی بار اس نے راحم آفاق کو کوئی وضاحت دی تھی۔

"تمہارے ساتھ جو کچھ بھی ہوا۔ اس کا مجھے بہت افسوس ہے۔"

"لیکن مجھے نہیں ہے، میں یہ سب ڈیزرو کرتا تھا!" اس کی ویران آنکھوں میں زندگی کی رمق نہ تھی۔ اس کے چہرے سے مسکراہٹ ختم ہو چکی تھی۔ اس کے دل میں اب کوئی احساس نہ تھا۔ راحم چند لمحوں تک اسے دیکھتا رہا۔ وہ اس کے لیے بھائیوں جیسا تھا۔ اس کی تکلیف ہمیشہ اسے عجیب سا دکھ دیتی تھی۔

"یہاں تم غلط ہو!" اسے گلے سے لگاتے ہوئے پشت تھپتھپائی۔ "تم بس یہ ہی ایک مکا ڈیزرو کرتے ہو جو میں نے تمہیں مارا ہے!"

فارس کے لبوں پر تلخ سی مسکراہٹ ابھر کر معدوم ہو گئی۔

"بہت بھوک لگی ہے یار! تمہارے پاس کچھ کھانے کو نہیں ہے!" الگ ہو کر وہ کچن کی طرف بھاگا۔ فریز کھول کر نگاہ دوڑائی۔ ایک ہاتھ میں جوس پکڑا، دوسرے سے سالن کا بول نکالا۔ "روٹی منگوا دو بس۔ صبح سے کچھ نہیں کھایا"

جم کر میز پر بیٹھ گیا۔

گہری سانس لیتے فارس نے کوٹ اٹھایا اور نکل گیا۔ جوس پیتے ہوئے راحم کی نگاہیں اس باکس پر ٹھہری رہیں جو لاؤنج کی ٹیبل پر رکھی تھی اور ہینڈ گن جس پر پورے چاند کی روشنی پڑ رہی تھی۔

☆☆☆

مجھے سنو،
جیسے کوئی بارش کو سنتا ہے
مجھے سنے بغیر،
سنو میں کیا کہتا ہوں
کھلی آنکھوں کے ساتھ جیتے جاگتے
پانچ حسوں کو تمام، بیدار رکھتے ہوئے
ابر برس رہا ہے، دھیمے قدموں جیسے
الفاظ کی دھیمی سرسراہٹ کے جیسے
ہوا، پانی اور لفظ بنا کوئی اوزان لیے
یہ جو ہم ہیں اور یہ ماہ و سال و لمحے
نارساں وقت کی گراں بار ہوا سی لیے
(اکتاویو پاز)

☆☆☆

وہ اپنی ای میلز دیکھ رہا تھا۔ لاشاری گروپ آف انڈسٹریز کی جانب سے گزشتہ رات ہی جواب موصول ہوا تھا۔ اس کی سی وی دیکھی جا چکی تھی۔ اسے انٹرویو کے لیے بلایا گیا تھا۔

وہ کچھ دیر تک پیشانی مسلتا رہا۔ پنڈی سے ایکسپٹنس لیٹر اسے مل چکا تھا۔ لیکن اس کی خواہش لاشاری گروپ آف انڈسٹریز سے جڑنے کی تھی۔ شیرازی انٹرپرائزز کے مقابلے میں بس لاشاری گروپ ہی آ سکتا تھا۔ مقابلہ شاید ان کا ہی تھا۔ ان میں ہی تھا۔ اعظم شیرازی بزنس میں مات دینے کی بھرپور صلاحیت رکھتے تھے۔

"حیدر تمہیں ڈھونڈ رہا ہے،" اس کے برابر میں صوفے پر دھم سے بیٹھتے ہوئے راحم نے ہیڈ فونز ہٹا کر کہا۔

"تمہاری ممی بھی۔۔ چھ مہینے ہو گئے ہیں۔ تم نے کوئی رابطہ نہیں کیا۔ سب تمہارے لیے بہت پریشان ہیں۔"

اس کا سر جھکا رہا۔ انگلیاں کی پیڈ پر متحرک رہیں۔ وہ نئی میل ٹائپ کر رہا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ جو ہوا سو ہوا۔ لیکن۔ اس طرح رابطہ ختم کر دینے سے کیا ہو گا؟"

وہ بتا نہیں سکا اس خاندان سے دوری میں ہی اس کی بھلائی تھی۔

راحم ٹہلتے، چاکلیٹس کھاتے، لیپ ٹاپ پر کوئی کام کرتے مسلسل اسے دیکھتا رہا۔ اٹھ کر اس کے پاس پنجوں کے بل بیٹھ گیا۔ گردن آگے کر کے اسے دیکھا۔ مشکوک ہو کر۔

"کیا چل رہا ہے تمہارے دماغ میں؟"

فارس نے اس کی پیشانی ٹھوک کر پیچھے کیا۔"

آوچ!" وہ سر پکڑ کر کراہا۔ "کیا ہے یار!"

"اپنے کام سے مطلب رکھو!" اتنے عرصے بعد اس نے باقاعدہ طور پر کوئی بات کی تھی۔

"دیکھو اگر تم قتل کی پلاننگ کر رہے ہو تو۔ تمہیں پہلے مجھ سے بات کرنی چاہیے!"

لیپ ٹاپ بند کر کے ایک طرف کر دیا۔ "تم سے کیوں بات کرنی چاہیے؟"

راحم کی آنکھیں پھیل گئیں۔ "آئی نیو اٹ، تم واقعی میں کچھ کرنے والے ہو؟" اسے کندھوں سے تھام کر جھنجھوڑ ڈالا۔ "ہوش میں آؤ فارس! ایک بار پھر سن لو۔ ایک انسان کا قتل۔ پوری انسانیت کا قتل!" وہ چیخا۔

"بات وہ کر رہا ہے۔ جو بچوں کو اغوا کرتا ہے!"

"وہ ایک نیکی کا کام تھا!" جتا کر کہا۔

فارس تاسف سے سر ہلاتا رخ موڑ کر کچھ اور لکھنے لگا۔ اس نے گھوم کر، اور صوفے کے پیچھے کھڑے ہو کر باقاعدہ اس کا لیٹر پڑھا۔

"ہمم! لاشاری گروپ آف انڈسٹریز! کیا کرنا چاہتے ہو؟ ویسے اس کا مالک مجھے بھی کچھ خاص پسند نہیں۔ کیوں نہ مل کر ہم لاشاری گروپ آف انڈسٹریز کا بیڑہ غرق کر دیں؟"

"کیا تم مجھے کام کرنے دو گے؟" جھلا کر کہا تو وہ ہاتھ کھڑے کیے واپس صوفے پر آ بیٹھا۔ میز پر ٹانگ پر ٹانگ رکھی۔ شک بھری نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔

"میں فی الحال صرف جاب تلاش کر رہا ہوں۔"

اس نے ضبط کر کے وضاحت دی۔

"ہاں۔ وہ بھی صرف اس کمپنی میں جو اعظم شیرازی کے مقابلے میں ہے! تم اپنا سارا غصہ ان پر نکالنا چاہتے ہو۔ انہیں تباہ کر کے؟"

فارس لب بھینچے اسے دیکھتا رہا۔ وہ ہمیشہ اس کے دماغ تک، اس کی سوچ تک پہنچ جاتا تھا۔ آج بھی پہنچ گیا تھا۔

"ویسے کیا تم جانتے ہو ان کے ساتھ اعظم شیرازی کی رشتہ داری بھی ہے!"

فارس نے چونک کر سر اٹھایا۔ "کیسی رشتے داری؟"

"داؤد لاشاری تمہاری ممی کے والد ہیں۔"

فارس حیران سا بیٹھا رہ گیا۔

وہ گہری مسکراہٹ کے ساتھ اٹھ کر چلا گیا۔

اگلے دن صبح سویرے جاگنگ سے واپسی پر ماتھے سے پسینہ صاف کرتے اس کے پاس آیا۔ فارس سیاہ تھری پیس سوٹ میں ملبوس اپنے جاب انٹرویو کے لیے مکمل تیار نظر آ رہا تھا۔

"بیسٹ آف لک!" کندھا تھپتھپا کر صوفے پر جا بیٹھا۔ ٹی وی آن کر لیا۔ چپس کا پیکٹ بھی کھول لیا۔

"تم یہاں سے کب تک جانے والے ہو؟" چپس کھاتے ہوئے اس کا منہ رک گیا۔ گردن موڑ کر فارس کو دیکھا۔ تاثرات ایک دم سے خطرناک ہو گئے۔

"شرم نہیں آتی اپنے بڑے بھائی سے ایسا سوال کرتے ہوئے؟" غصے سے بھڑک کر بولا۔ "بھول گئے وہ وقت۔ جب میں نے تمہیں گونیا ہاؤس میں پورے چار سالوں تک برداشت کیا تھا۔"

"اس برداشت کے پیسے بھی تم نے بہت لیے ہیں۔ میں تمہیں فری میں یہاں کیوں رکھوں؟" وہ سرد لہجے میں بولا۔ آنکھوں میں شک تھا۔ کہیں اسے دوبارہ نہ بھیجا گیا ہو۔

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ کرایہ لے لینا مجھ سے" الجھا کر اپنے مطلب کی بات تک لانا راحم آفاق کے داہنے ہاتھ کا کھیل تھا۔

فارس وجدان کا پارہ چڑھ گیا۔

"تمہارا اپنا کوئی گھر نہیں ہے جو تم یہاں رہو گے؟"

"میں آج کل بہت غریب ہو چکا ہوں۔ کھانے کے لیے پیسے بھی نہیں ہیں!" مسکین سی شکل بناتے اپنے ٹریک سوٹ کی خالی جیبیں بھی دکھائیں۔

"غریب کے پاس گاڑی ہے۔ موبائل ہے۔ لیپ ٹاپ ہے۔ برانڈڈ کپڑے ہیں۔ بس گھر نہیں ہے!" فارس نے دانت پیسے۔

"نظر کیوں لگاتے ہو۔ ماشاء اللہ بولو۔ اللہ مجھے اور رزق دے!"

فارس ضبط کر کے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

اس کا انٹرویو لیا گیا، سی وی دیکھی گئی، تجربے اور صلاحیتوں سے متاثر ہو کر ہائیر کر لیا گیا۔ کمپنی جوائن کرتے ہی اس نے تمام معاملات پر بہت باریک بینی سے نظر رکھنا شروع کی تھی۔ جیسا کہ اس کا خیال تھا۔ شیرازی بزنس ایمپائر کو حریف کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ مقابلہ جیسے ان سے تھا۔ ان سے ہی ہو سکتا تھا..

اسے کمپنی جوائن کیے تیسرا ہفتہ تھا جب اسے داؤد لاشاری کے بیٹے کی آمد کی اطلاع ملی تھی۔ جو امریکا کے ٹرپ سے حال ہی میں لوٹا تھا۔ فائل اٹھائے اپنے آفس سے نکل کر آفس اسٹاف کی گیدرنگ میں نظر آتے، کچھ ان جانے چہروں کو



دیکھتے وہ دائیں طرف لفٹ میں داخل ہوا تھا۔ اس کے ساتھ نیوی تھری پیس سوٹ میں ملبوس پچاس سالہ اسمارٹ اور سلم سا مرد اندر داخل ہوا۔ موبائل پر کچھ دیکھتے وہ ایک ہاتھ جیب میں ڈالے رک گیا تھا۔

اسکرین اسکرول کرتے، کچھ دیکھ کر مسکراتے وہ ایک دم سے گنگنانے لگا تھا۔ عادتاً۔ یونہی۔ سرشاری کے عالم میں۔

وقت رک گیا۔ لفٹ کی چاروں دیواریں فارس وجدان پر ایک دم سے تنگ ہوئیں۔ اس کی پیشانی عرق آلود ہونے لگی۔ آنکھوں میں دہشت کا تاثر ٹھہر گیا۔ سناٹے میں وہ مخصوص دھن بار بار گونجتی ہوئی ایک دم سے بلند ہونے لگی۔ اتنی بلند کے فارس کو اپنے کان پھٹتے ہوئے محسوس ہوئے۔

"یہ حماد تو نہیں ہے!" تیز روشنی میں ایک دھندلی سی شبیہ نمایاں ہوئی۔

"تو تمہارے مالک نے تمہیں ہمارے آگے چارے کی طرح پھینک دیا تا کہ وہ اپنے پوتے کی جان بچا سکے۔"

بھاری قدموں کی آہٹ، تاریک کوٹھڑی کا اندھیرا۔ دہشت بھری سخت پتھریلی آواز۔ اور وہ گنگناہٹ۔

"شیردل سے کہو اس لڑکے کو لے جائے!"

"اور ہاں! اس سے کہنا لاش ہم اعظم شیرازی کو ہی بھیجیں گے! اسے پتا چلنا چاہیے اگر حماد ہمارے ہاتھ آ جاتا تو ہم اس کا کیا حشر کرتے!"

کوٹھڑی کی تاریکی نے اسے مکمل طور پر نگل لیا۔

اب وہ فون کان سے لگا چکا تھا۔ کچھ سنتے ہی غصے میں آ گیا تھا" کیا میں نے یہ نہیں کہا تھا مجھے رپورٹ شام چھ بجے تک مل جانی چاہیے؟"

وہی سرد لہجہ۔ کرخت آواز۔

"یہ میرا کام ہے۔ تو میرے طریقے سے ہی ہو گا انڈراسٹوڈ؟"

اس نے کس قدر کوشش سے گردن موڑ کر اس کا چہرہ دیکھا۔ سیاہی مائل گہری آنکھیں، جیل سے جمے ہوئے بال، کلین شیوڈ چہرہ۔ کال سنتے پتھریلے ہوتے تاثرات۔

لفٹ مطلوبہ فلور پر رکی تو وہ بات کرتے اس سے پہلے ہی نکل گیا۔ دروازے برابر ہو گئے۔

فائل اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے جا گری۔

داؤد لاشاری کا بیٹا۔ جنید لاشاری۔

لاشاری گروپ آف انڈسٹریز کا وارث۔

جمیلہ داؤد کا بھائی۔

فارس وجدان اپنی جگہ ساکت کھڑا رہ گیا۔

☆☆☆

"میں نے حیدر کو بتا دیا ہے تم یہاں رکے ہوئے ہو!" چار پانچ دن تک غائب رہنے کے بعد راحم اس سے ملنے آیا تو سنجیدگی سے بتایا۔ "اب کل کلاں کو کوئی اونچ نیچ ہو گئی تو سب میرا گلا ہی دبوچیں گے۔ تو اس لیے۔"

فارس چپ رہا۔ یوں جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ عموماً وہ ایسی باتوں پر سخت ردعمل دیتا تھا۔

"ہیلو!" اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرایا۔ "یہیں ہو۔ یا کہاں ہو؟"

وہ گردن موڑ کر اسے دیکھنے لگا۔ آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ حلقے بھی نمایاں تھے جیسے وہ راتوں تک سویا نہ ہو۔

"تم ٹھیک ہو؟" وہ ایک دم سے سنجیدہ ہو گیا۔ اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"میں نے اسے دیکھا ہے!"

"کس کی بات کر رہے ہو تم؟"

"جس نے مجھے اغوا کیا تھا!"

راحم کو شاک لگا۔ "کیا سچ میں۔ کیسے؟ تم تو کہتے تھے تمہیں کچھ یاد نہیں ہے۔"

فارس نے گہری سانس لے کر اپنا سر ہتھیلیوں پر گرا لیا۔ اس کی حالت ابتر تھی۔ وہ اسی ٹراما سے گزرتا

ہوا نظر آ رہا تھا۔
"وہ داؤد لاشاری کا بیٹا ہے، ممی کا بھائی!"
راحم آفاق اپنی جگہ حیران و ششدر بیٹھا رہ گیا۔ سماعت پر جیسے یقین نہیں آیا۔
"تم نے اسے کیسے پہچانا؟" صدمے سے نکل کر پوچھا۔
"آواز سے۔ گنگناہٹ سے۔ وہ دھن کبھی میرے ذہن سے نہیں نکلی۔"
راحم نے حیران ہو کر اسے دیکھا۔
"ہوسکتا ہے تمہیں غلط فہمی ہوئی ہو۔"
"نہیں میں اس کی آواز نہیں بھول سکتا، مجھے سب یاد ہے۔" اس کا رنگ اڑا ہوا تھا۔ سانسیں بھاری چل رہی تھیں۔
"آر یو شیور؟"
اس نے سر کو اثبات میں جنبش دی۔
"اگر میں نے اسے پہچان لیا ہے۔ تو ہوسکتا نام کی وجہ سے وہ بھی مجھے پہچان لے۔"
"تمھاری اس کے ساتھ ملاقات ہوئی ہے؟"
"ابھی تک نہیں!"
معاملہ ایک دم سے پیچیدہ لگنے لگا۔
"تم اب کیا سوچ رہے ہو؟"
"میں ریزائن کرنا چاہتا ہوں!"
"تم ڈر رہے ہو؟"
"محتاط ہو رہا ہوں!"
راحم خاموش ہوگیا۔ بات ختم ہوگئی۔ اگلے دن وہ ایک بار پھر اس کے سامنے تھا۔
"میرے خیال سے ہمیں اعظم صاحب سے بات کرنی چاہیے!" وہ چائے کا مگ ہاتھ میں لیے گیلری میں کھڑا تھا۔
"یہ میرا مسئلہ ہے۔ اسے سلجھاؤں گا بھی میں ہی۔"
"بیوقوفی کی باتیں مت کرو!"
"وہ ان کی بہو کا بھائی ہے۔ اتنا قریبی اور اہم رشتہ ہے۔ تمہیں لگتا ہے وہ میری بات پر یقین کرلیں گے؟"
راحم کچھ کہہ نہ سکا۔
"اور ممی۔ وہ کیا سوچیں گی؟ اس وقت جس طرح کے حالات چل رہے ہیں، سب کی نظر میں ولن تو میں ہی ہوں!" فارس کا لہجہ سرد ہوگیا تھا۔
"تمہیں ثبوت چاہیے؟"
"ہاں۔ شاید تب ہی کوئی یقین کرسکے۔"
"تمہارے ارادے کیا ہیں؟" راحم اب کے سینے پر بازو باندھے کھڑا ہوگیا۔
اس نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔
"مدد کرو گے میری؟"
"اگر پلان شیئر کرو گے تو۔"
اس نے گہری سانس لی۔ "یہ آسان نہیں ہے لیکن۔ میں اس پر نظر رکھنا چاہتا ہوں!"
"ڈن ہوگیا پھر، یہ مجھ پر چھوڑ دو!" کندھا تھپتھپا کر چلا گیا۔ اس نے اپنی نوکری سے اسی دن ریزائن دے دیا۔ شام تک راحم اپنے کمرے سے برآمد ہوا۔ لیپ ٹاپ میز پر اس کے سامنے کھول کر رکھ دیا۔
"ذرا یہ دیکھو۔ بس تھوڑی سی ایفرٹ۔" نیند سے بوجھل آنکھیں۔ گھنگھریالے الجھے ہوئے بال۔ اسے نیند بھی آ رہی تھی۔ بھوک بھی لگ رہی تھی اور وہ مارگلہ ہلز پر ہائیکنگ کا بھی کہہ رہا تھا۔
فارس نے اچنبھے سے اسے اور پھر لیپ ٹاپ اسکرین کو دیکھا۔ جس پر لاشاری گروپ آف انڈسٹریز کے ہیڈ آفس والی عمارت کے تمام کیمروں کی سی سی ٹی وی فوٹیج لائیو چلتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔
"یہ تم نے کیا کیا؟"
"میں نے آئی پی ایڈریس کو آنلائن سرچ کیا، لوگنگ ان۔ بہت سمپل۔ پھر سکیچر انفارمیشن کی کوشش۔ پاس ورڈز ٹرائے کیے اور بوم!!۔" کرسی کو گھماتے ہوئے یوں بولا جیسے بہت آسان کام ہو۔
"تم نے لاشاری گروپ آف انڈسٹریز کا پورا



سکیورٹی سسٹم ہیک کرلیا!" فارس صدمے سے اسے دیکھ رہا تھا۔
"ہاں! تم نے کہا تھا تمہیں میری ہیلپ چاہیے۔ لو ہوگئی ہیلپ۔"
فارس اسے دیکھ کر رہ گیا۔
لیپ ٹاپ اسکرین پر مختلف اسکرینز کے مناظر واضح تھے۔ پارکنگ ایریا تک کی ریکارڈنگز، راہداریوں کی۔ ریسپشن کی۔ اندرونی احاطے کی بھی۔
"تم نے۔ تم نے یہ سب کیسے کرلیا؟"
"آئی ٹی اسٹوڈنٹ ہوں، کیا تم بھول گئے؟" کرسی کا رخ گھماتے ہوئے لیپ ٹاپ کا رخ اپنی طرف کرلیا۔
"میرا نہیں خیال تھا کہ اس کے لیے ہمیں سکیورٹی سسٹم کی ضرورت پڑے گی۔ میں صرف۔ اس کی کالز ٹریس کرنا چاہ رہا تھا۔"
"اسی کے لیے ہی تو یہ سب کیا ہے۔ تم اس کے دماغ تک پہنچنا چاہتے ہو۔ جب کہ میں اس کے آفس، اس کے فون تک، پھر ہمیں یہ بھی دیکھنا ہے وہ کن لوگوں سے ملتا ہے۔ کن سائٹس کو وزٹ کرتا ہے۔" وہ اب محتاط اور بہت پروفیشنل گفتگو کر رہا تھا۔ قدرے سنجیدہ بھی لگ رہا تھا۔
"اس میں خطرہ بھی ہوگا!"
"یہ والے کام مجھ پر چھوڑ دو۔" اس نے مطمئن ہو کر کہا۔
"تم کیا کرو گے؟"
"دیکھتے جاؤ بس!" وہ اپنی جیکٹ اٹھاتا وہاں سے چلا گیا۔
اس رات رہائشی عمارت کے نیچے اعظم شیرازی کی گاڑی آ کھڑی ہوئی۔ حیدر اوپر آ گیا تھا۔ وہ اس کے فلیٹ کا دروازہ بجا رہا تھا۔ اس نے دروازہ نہیں کھولا۔ اس نے کالز بھی ریسیو نہیں کی۔ اور میسج بھی نہیں دیکھے۔ موبائل آف کیے اپنے کمرے میں بند ہوگیا۔
"اعظم صاحب تم سے ملنا چاہتے ہیں!" جاگنگ سے واپس آ رہا تھا۔ حیدر نے اسے راستے میں آ لیا۔
"میں کسی سے نہیں ملنا چاہتا! بار بار مجھے ڈسٹرب کرنا بند کردو!" سخت لہجے میں کہہ کر وہ چلا گیا۔ اس کے بعد بھی دو بار ان کی گاڑی اسے نظر آئی۔ مگر وہ ان سے ملنے، ان کی بات سننے نہیں گیا تھا۔

☆☆☆

راحم آفاق نے اپنا کام مکمل کرلیا تھا۔ بگ ڈیوائس وہ اس کے آفس میں لگا چکا تھا۔ سی سی ٹی وی کیمرے مکمل اس کے کنٹرول میں تھے۔ موبائل کالز تک ٹریس ہوسکتی تھیں۔ اس کی گاڑی پر بھی ٹریکر موجود تھا۔ اب وہ جنید لاشاری کی کالز بھی سن سکتا تھا۔ میسجز بھی دیکھ سکتا تھا۔ اس نے ان تین دنوں میں یہ کام اس قدر محنت اور ہوشیاری سے کیا تھا کسی کو بھنک تک نہیں پڑی تھی۔
"اندازہ نہیں تھا تم اس کام میں اتنے پروفیشنل ہو۔" وہ متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکا۔
"دیکھ لو!" اس نے فخر سے کالر سیدھے کیے۔
"خوامخواہ میں ہلکا لیتے رہتے ہو۔ میرے جیسے دوست اور بھائی قسمت والوں کو ملتے ہیں!"
فارس کی کھوجتی نگاہیں اس کے چہرے پر جمی رہیں۔
"کون ہو تم؟" اس نے سنجیدگی کے عالم میں بہت اچانک سے پوچھا۔
"یہ کیسا سوال ہے؟" راحم نے اچنبھے سے فارس کو دیکھا۔
"بلیک ہیٹ ہیکر؟ وائٹ ہیٹ ہیکر!" وہ میز پر کہنیاں جما کر آگے ہوا۔
"کول!" راحم ہنستے ہوئے سیدھا ہو بیٹھا۔
"یا پھر ریڈ ہیٹ ہیکر؟" رک کر کہا۔
"یہ تم مجھے میرے بالوں کی وجہ سے کہہ رہے ہو؟" راحم نے ہنسی میں بات اڑاتے اس کی توجہ اپنے

سیاہ بالوں کی طرف دلائی جن میں سرخی مائل شیڈ نظر آتا تھا۔

"یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے!" فارس کی نگاہیں اس کے چہرے پر جمی رہیں۔ وہ جیسے اسے پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"میں تو بس ایک راحم ہوں! صرف ایک راحم!" بازو پھیلا کر کہا۔

"اب سمجھ میں آرہا ہے اعظم شیرازی نے تمہیں سترہ سال کی عمر میں ہی کیوں ہائر کر لیا!"

"ہاہا۔ کیا سمجھ آرہا ہے!" اس نے پلیٹ سے بادام اٹھا لیے۔

"یقیناً تم شیرازی انٹر پرائزز کا کوئی سسٹم ہیک کرتے پکڑے گئے تھے!"

"میں کبھی پکڑا نہیں جاتا!" پورے اعتماد سے نفی کی۔

"مگر حیدر تمہیں گردن سے پکڑ کر لایا تھا۔ یہ اس نے کہا۔"

"وہ روبوٹ تو کچھ بھی کہتا رہتا ہے، اس کی باتوں کو سیریس مت لیا کرو۔" اعتماد سے گویا ہوا۔

"تو۔"

"تو یہ کہ میرا سر نہ کھاؤ اور اپنے دشمنوں کی جاسوسی کرو!" عادتاً اس کی پیشانی ٹھونک کر چاکلیٹ کا ریپر اتارتے ہوئے اٹھ کر چلا گیا۔

☆☆☆

اگلے چند دنوں میں جنید لاشاری کی کالز سنتے، میسجز پڑھتے، اس کی ایک ایک حرکت پر نظر رکھتے فارس وجدان پر انکشاف ہوا' اس کا فوکس اعظم شیرازی کے سوا اور کہیں نہیں تھا۔

بظاہر ان کے ساتھ رشتے داری کا لحاظ برتتا ہوا مگر اندر ہی اندر ان کی کمزوریوں کا متلاشی۔ انہیں نقصان کے منصوبے بناتا ہوا۔ مطلوبہ ڈیلز ہتھیانے کی کوشش کرتا ہوا۔ سالوں کی دشمنی تھی جو در پردہ چلتی آرہی تھی۔ کاروباری مفاد مقدم رکھ کر جو رشتہ بنایا گیا تھا۔ وہی رشتہ بہت سے فائدوں میں آڑے آرہا تھا۔ اپنے ہر خسارے کا ذمہ دار وہ اعظم شیرازی کو ہی سمجھتا رہا تھا۔ کچھ قانونی جنگیں بھی تھیں۔ کچھ اراضی کا مسئلہ بھی۔ جیت ہر جگہ اعظم شیرازی کی ہی ہوئی تھی۔ نہ ان کا سر جھکتا تھا، نہ وہ ٹوٹتے تھے اور نہ ہی انہیں گرایا جاسکتا تھا۔

جنید لاشاری کے تمام احکامات ان کے متعلق تھے۔ آنے جانے کا وقت، روٹین۔ کاروباری معاملات۔ ڈیل۔ وہ ایک ایک چیز کی خبر رکھتا تھا۔ ایک ایک بات کی رپورٹ لیتا تھا۔ اس کی بات جمیلہ داؤد سے بھی ہوتی تھی۔ ہارون شیرازی سے بھی۔ حماد پاکستان کب تک آنے والا ہے۔ یہ سوال وہ کئی بارتینوں سے پوچھ چکا تھا۔ کئی غیر قانونی کاموں میں بھی ملوث تھا۔ اس کے آدمی ایک طرح سے مجرم ہی تھے جن سے وہ ہر طرح کا کام کروا سکتا تھا۔

اسے جنید لاشاری پر نظر رکھتے تیسرا ہفتہ تھا جب ایک فون کال نے اس کے اندر سناٹے پھیلا دیے۔

بات حماد کی ہو رہی تھی۔ وہ پاکستان آچکا تھا۔ تاہم وہ اپنے گھر نہیں گیا تھا۔ جنید لاشاری جانتا تھا اس وقت وہ کہاں اور کس کے ساتھ تھا۔ چالاک اور ہوشیار انسان تھا۔ جان گیا اس وقت حماد کے اپنی فیملی کے ساتھ کچھ اختلاف چل رہے ہیں۔ اس نے اپنی مرضی سے شادی کر لی تھی۔ اس کی بیوی منظر عام پر نہیں آئی تھی۔ ان کی شادی کو ابھی تک پبلک نہیں کیا گیا تھا۔

فارس کی رگوں میں خون دوڑنے لگا۔

"تیار رہنا میں کسی بھی وقت حکم دے سکتا ہوں!"

اس نے سنا۔ سن ہو کر۔ ہیڈ فونز ہٹاتے کتنی دیر تک اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ منصوبہ واضح تھا۔ مبہم مختصر لفظوں میں ہونے والی بات اتنی مشکل بھی نہ تھی کہ اس کی سمجھ میں نہ آتی۔ سولہ سال پہلے۔ وہ جال حماد کے لیے ہی بچھایا گیا تھا۔ اور سولہ سال بعد۔ ایک بار پھر وہی جال بچھایا جا رہا تھا۔ وہ سانپ جسے اعظم



شیرازی دشمنوں میں ڈھونڈتے رہے۔ وہ سانپ ان کے بے حد قریب۔ ان کے قریبی رشتے میں موجود تھا۔ جس کی موت کی خواہش تھی۔ اور جس کی ذات سے وہ انتقام لینا چاہتا تھا۔ اس کی باری آرہی تھی۔ اس کے قتل کے منصوبے بن رہے تھے۔

"دشمن کو ہرانا ہو تو پہلے اس کی طاقت ختم کرنی چاہیے!" گاڑی میں ہونے والی وہ گفتگو اس نے واضح سنی تھی۔ یہ الفاظ جنید لاشاری کے تھے۔ اس کے دشمن کی طاقت اس کا بیٹا اور پوتا ہی تھا۔ اس کے وارث۔ جن کے لیے بزنس ایمپائر کھڑا کیا گیا تھا۔

حماد شیرازی۔ ہارون شیرازی۔

نیم تاریکی میں فارس اپنی جگہ بیٹھا انہیں دیکھ رہا تھا۔ انہیں سوچ رہا تھا۔ موبائل سامنے ہی پڑا تھا۔ اس نے ابھی تک کسی کو کال نہیں کی تھی۔ بدلہ۔ انتقام۔ غصہ اور اشتعال۔ آگ ہنوز جل رہی تھی۔

حماد شیرازی۔ جمیلہ داؤد کا بیٹا!!

اس نے ذہن سے ہر ایک منفی جذبے کو جھٹک کر اسے ایک نئی پہچان دی۔ اپنے ذاتی اختلاف بھلا کر صرف جمیلہ داؤد کا سوچا۔ حماد ان کا بیٹا تھا۔ صرف ان کا بیٹا۔

اس رات جب اسے اعظم شیرازی کی گاڑی نظر آئی تو وہ رک گیا۔ شیشہ نیچے ہوا تو وہ کھڑکی میں کہنیاں جماتے ہوئے بس چند لمحوں کے لیے رکا۔ اس نے اعظم شیرازی کی طرف نہیں دیکھا۔ مگر وہ اسے ہی دیکھ رہے تھے۔ ہلکی ہلکی بارش سے اس کے بال بھیگے ہوئے تھے۔ چہرے پر وہ تازگی نہیں تھی جو نظر آیا کرتی تھی۔

"حماد کی زندگی کو خطرہ ہے۔ بہتر ہو گا آپ اسے واپس بلالیں!"

وہ اسے دیکھ کر رہ گئے۔

"اگر میں خود سے کچھ کہتا تو آپ یقین نہ کرتے۔ جلد ہی سارے ثبوت بھجوا دوں گا!" کہہ کر پیچھے ہٹ گیا۔ ہوڈی کو سر پر چڑھاتے ہوئے مخالف قدم اٹھاتا گیا۔ بارش کی دھند میں اس کا وجود مبہم ہونے لگا۔ اعظم شیرازی کو یہ ہی لگا۔ مگر دھند ان کی آنکھوں میں تھی۔ وہ آنکھیں جن میں نمی ٹھہری ہوئی نظر آرہی تھی۔

☆☆☆

اس رات وہ سو نہیں سکا۔ وہ بار بار۔ میسجز، فونز کالز، بلنگ ڈیوائس سے ملنے والے سگنلز کا منتظر رہا۔ اور اگلا دن بھی اسی میں لگ گیا۔ شام ساڑھے چھ بجے کی کال تھی۔ ہارون شیرازی پنڈی کے لیے روانہ ہو رہا تھا۔ وہ غالباً اپنے بیٹے کو لینے جا رہا تھا۔

"ایک نہ سہی دو ہی سہی۔ یہ بھی ٹھیک ہے!" اس نے جنید لاشاری کی سرد آواز سنی۔ "نو بجے سے پہلے پہلے یہ کام ہو جانا چاہیے!"

وہ بمشکل سانس لیتے ہیڈ فونز پٹخ کر اٹھ گیا۔ اس نے حماد کے لیے اپنی تمام تر غصے اور نفرت کو دباتے ہوئے اعظم شیرازی کو کال کی۔ ان کا موبائل بند جا رہا تھا۔ جمیلہ داؤد کو۔ جو فون نہیں اٹھا رہی تھیں۔ پھر راحم سے رابطہ کیا۔ ہارون شیرازی سے بات کرنا چاہی۔ میسج کیے۔ کالز جاتی رہیں مگر کسی نے جواب نہیں دیا۔ غالباً اس وقت ان کے پاس جو نمبر تھا وہ اس کے پاس نہیں تھا۔ وہ کچھ بے قراری سے اپنے کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ دل اندیشوں میں گھرا تھا۔ دھڑکن تیز تھی۔ جیسے کچھ برا ہونے والا ہو۔

☆☆☆

ایرنگز اتارتے ہوئے عدینہ زبیر صدمے سے گنگ اور ساکت کھڑی رہ گئی۔ لمحے بھر کے لیے سماعت پر یقین نہ آیا اور جب یقین آیا تو زمین گھومتی ہوئی محسوس ہوئی۔

"تم مجھے ابارشن کا کہہ رہے ہو؟" اسے جھٹکا لگا تھا۔

حماد شیرازی نے مڑ کر کچھ تحیر سے اسے دیکھا۔ اس کے شاک بھرے تاثرات اسے عجیب لگے۔

"ہاں! یہ کوئی مشکل کام تو نہیں ہے۔ تم ایسا پہلے بھی تو کر چکی ہو۔"

عدینہ کے چہرے پر سایہ سا لہرا گیا۔
"ایکچوئلی میں تم سے کچھ دنوں میں بات کرنے ہی والا تھا۔" اس نے کف لنکس لگانے کے بعد کوٹ پہنا، پرفیوم چھڑکا اور پھر دراز سے کچھ پیپرز نکال کر اس کے سامنے رکھ دیے۔
طلاق کے پیپرز۔
عدینہ اپنی جگہ پتھر ہو گئی۔
"وی شڈ پارٹ اور وایز ناؤ!!۔" (ہمیں اپنے راستے اب جدا کر لینے چاہئیں)
وہ اب اپنے بیگ میں ضرورت کی اشیاء رکھ رہا تھا۔
"تم یہ فیصلہ کیسے کر سکتے ہو۔ ہم نے تو ساتھ میں زندگی گزارنے کا وعدہ کیا تھا۔"
"نکاح کرتے وقت سب ہی یہ ہی وعدہ کرتے ہیں۔" ہنس کر اس کی بات مذاق میں اڑائی۔
"تم۔ تم مجھ سے محبت کرتے تھے حماد!" اس نے یاد دلانا چاہا۔
"تم بھی تو فارس سے محبت کرتی تھیں۔"
وہ سن ہوئی۔
"وی آر ایون ناؤ!" (اب ہم برابر ہیں)
عدینہ زبیر کی بے یقین آنکھیں حماد شیرازی پر ٹھہری رہ گئیں۔
"تم یہ کیا کر رہے ہو۔" وہ رو دینے کو تھی۔
"میں اپنے لیے بہتری کا فیصلہ کر رہا ہوں عدینہ ڈیئر!"
اعظم شیرازی نے اکاؤنٹ فریز کر دیا تھا۔ گھر سے نکال دیا تھا۔ جائیداد کاروبار سے اس کا ہر حصہ ختم ہو چکا تھا۔ اسے اندازہ نہیں تھا عدینہ زبیر کے ساتھ اس کی شادی اتنی مہنگی پڑ سکتی ہے۔ بدلا یا انتقام وہی تھا جو پورا ہو چکا تھا۔ اب اسے اس کی ذات میں کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔
وہ صدمے میں کھڑی تھی۔ کیا کیا خواب تھے جو اس نے نہیں دیکھے تھے۔ شیرازی خاندان کے وارث سے۔ حماد سے شادی کر کے اور وہ اب اپنے راستے الگ کرنے کی بات کر رہا تھا۔
"میں صرف اتنا جانتا ہوں سب کچھ چھوڑ کر دادا کے پاس جاؤں گا تو وہ مجھے معاف کر دیں گے۔"
"اور میں؟"
"تم کیا؟"
"تم نے مجھ سے شادی کی۔"
"زبردستی نہیں کی۔"
"میں نے تمہارے لیے فارس کو چھوڑا۔"
"اپنی مرضی سے چھوڑا۔ کیا میں نے فورس کیا تھا؟" سوال کرتے تلخی سے مسکرایا اور عدینہ کے اندر غصے کی آگ بھڑک اٹھی۔
"تم میرے ساتھ ایسا نہیں کر سکتے۔ میں نے تمہارے لیے کیا کیا نہیں کیا۔" بازو سے اس کا رخ موڑ کر چیخی۔
"آواز نیچی رکھو عدینہ!" اس کا ہاتھ جھٹک کر غصے سے غرایا۔ "میں فارس نہیں ہوں کہ تمہارا ایسا لہجہ برداشت کر سکوں۔"
وہ اپنی جگہ تھم گئی تھی۔ اسے کچھ غصے سے پرے ہٹاتے اس نے اپنے بازو کی شکن درست کی۔
آنکھوں میں آنسو بھرتے اس کے قریب ہوئی۔ "حماد پلیز! ایسے نہیں کرو۔ میں نے تمہارے لیے کیا کیا نہیں کیا۔"
"اور میں نے بھی تو تمہیں پیسوں میں تہلا دیا ہے۔"
وہ جواب نہیں دے سکی۔
"پلیز ایسے نہیں کرو! میں نے تمہارے لیے"
"اوہ کم آن عدینہ! یہ کیا تمہارے لیے۔ تمہارے لیے لگا رکھی ہے تم نے؟" اکتا کر بازو پیچھے کیے۔ "یو ڈِڈ نتھنگ فار می! جو کیا اپنے لیے کیا۔ میں نے تو صرف ایک آفر کی تھی۔"
"محبت کا دعویٰ جھوٹا تھا؟" اس کے لب ہلے۔
"محبت؟ تم اتنی خوب صورت ہو۔ تمہیں پانے کی خواہش تھی۔ اب ظاہر ہے۔ ساری عمر تو اس طرح



بے گھر ہو کر نہیں گزاری جا سکتی۔ مجھے اپنے گھر واپس جانا ہے۔ اینڈ ایکچوئلی۔ آئی ایم کمنگ ٹو ریلائز کہ تمہارے ساتھ شادی کا فیصلہ غلط تھا۔ انسان کی صرف شکل و صورت میٹر نہیں کرتی اور بھی بہت کچھ دیکھنا پڑتا ہے۔"
اور بھی بہت کچھ دیکھنا پڑتا ہے۔
عدینہ زبیر کے اپنے الفاظ طمانچے کی طرح اس کے منہ پر آ لگے۔ وہ بولنے کے قابل بھی نہ رہی۔ خوابوں کا محل چکنا چور ہو گیا۔ جو کسی کے ساتھ کر چکی تھی۔ ویسا ہی اس کے ساتھ ہو گیا۔ اب وہ بچہ رکھنا چاہتی تھی تو مقابل ابارشن کا کہہ رہا تھا۔ اب وہ گھر بسانا چاہتی تھی تو مقابل طلاق کی بات کر رہا تھا۔
"تم میرے خلوص کا یہ صلہ دے رہے ہو!" آواز صدمے سے پھٹ گئی تھی۔
"خلوص؟ انوسنٹ مت بنو ڈیئر! میں جانتا ہوں تم کس نیچر کی ہو۔ کل تمہیں کوئی اور پسند آ جائے گا تو تم اس کے پاس چلی جاؤ گی۔ ویٹس واٹ یو آلویز ڈو!"
اس نے پیسوں سے بھرا ہوا لفافہ بیگ سے نکال کر میز پر اچھال دیا۔ عدینہ زبیر کے ساتھ اس کا قصہ یہیں ختم ہو رہا تھا۔
"ایک ہفتے تک کا ٹائم ہے۔ تب تک یہ فلیٹ خالی کر دینا! یا پھر خود ہی پیمنٹ دے دینا۔" ایک ہاتھ سے بیگ اٹھاتے، دوسرے ہاتھ سے فون کان سے لگائے وہ اسی وقت باہر نکل گیا۔
"جی ڈیڈ! میں بس نیچے پہنچ رہا ہوں!" وہ عجلت میں سیڑھیاں اترتا جا رہا تھا اور اس کے قدموں کی دھپ دھپ، عدینہ زبیر کے دل پر پڑ رہی تھی۔ اس کے خواب ٹوٹے مسلے جا رہے تھے۔ اس کی دنیا تباہ ہو رہی تھی۔
وہ ساکت، ویران اور متوحش سی اپنے کمرے میں کھڑی رہ گئی تھی۔

☆☆☆

وہ فکرمندی کے عالم میں ٹہل رہا تھا جب ڈور بیل بجی۔ دروازہ کھول کر دیکھا تو راحم تھا۔ وہ اس کے ساتھ ہی باہر نکل گیا۔
"اس نے بہت اچانک اپنے آدمیوں کو حکم دے دیا۔ وہ صرف موقع کی تلاش میں تھا۔"
راحم نے گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے اس کی بات سنی۔
"میں نے حیدر سے بات کر لی ہے۔ اعظم شیرازی میٹنگ میں ہیں۔ لیکن وہ سب دیکھ لے گا۔ یہ نمبر ٹرائے کرو۔"
اس نے ہارون شیرازی کا دوسرا نمبر دیا۔
"ہارون شیرازی اکیلے نہیں ہیں۔ ان کے ساتھ گارڈز بھی ہیں۔ وہ حماد کو لینے ہی گئے ہیں۔ ڈونٹ وری!" وہ کہہ رہا تھا۔
فارس کے ذہن میں جمیلہ داؤد کا چہرہ ایک بار پھر لہرایا۔ اس نے گہری سانس لے کر خیال جھٹک دیا۔ اب وہ نئے نمبر پر کال کر رہا تھا ہارون شیرازی نے اس کی کال ریسیو کر لی تھی۔ "ہیلو؟"
اس نے آواز سنی۔ لب بھینچ کر ایک لمحے کا توقف لیا۔
"آپ اس وقت کہاں ہیں؟"
وہ فارس کی آواز سنتے ہی چونک گئے۔ آنکھوں میں دکھ بھرے اضطراب کی لہر آ گئی۔ اس آخری ملاقات کے بعد کتنا ڈھونڈا تھا انہوں نے اسے۔ مگر وہ انہیں نہیں ملا تھا۔
"ف۔ فارس۔ بیٹے!"
"جواب دیجیے آپ اس وقت کہاں ہیں؟"
اس کا لہجہ اجنبی سا تھا۔
"ہم اسلام آباد پہنچنے ہی والے ہیں۔" وہ ناسمجھی کے عالم میں گویا ہوئے۔
"آپ پلیز اپنا ٹریک چینج کر لیں۔ آپ کوئی اور راستہ اختیار کر لیں۔"
"بس تھوڑا سا سفر باقی ہے۔" وہ سمجھ نہ پائے۔
"لسن ٹو می۔" اس نے زور دے کر کہا۔

"آپ ابھی اور اسی وقت۔"

فائرنگ کی آواز ایک دم سے گونجی تھی۔ دھماکے سے ہی گاڑی کے ٹائر چرچرائے تھے۔ اس کے الفاظ آدھے ادھورے وہیں رہ گئے۔ وجود ساکت ہو گیا۔

اور دور کہیں چھناکے سے شیشے ٹوٹے، الٹتی ہوئی گاڑی گھسٹ کر ٹرالر سے جا ٹکرائی۔ تڑتڑ۔ گولیوں کی آواز۔ شور اور پھر پھیلتا ہوا وحشت ناک۔ موت بھرا سناٹا۔

فارس وجدان کے ہاتھ سے فون چھوٹ کر نیچے جا گرا۔

منظر بدل رہے تھے۔ آوازیں بدل رہی تھیں۔ جگہ بدل رہی تھی۔

احساسات منجمد، آنکھیں دھندلی، دماغ ماؤف۔ سکتے کی کیفیت میں اس نے خود کو ہاسپٹل کے کاریڈور میں قدم رکھتے ہوئے پایا۔ اس کے کان ہنوز بند تھے۔ اسے کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ اسے اب جیسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ مگر اسٹریچر کے پہیوں کا شور بہت تیز تھا۔ اس شور سے جڑا ہوا منظر واضح تھا۔ سفید چادر جو خون سے رنگی ہوئی تھی۔ وجود جو گولیوں سے چھلنی لگ رہا تھا۔ دو سٹریچر۔ خون سے سرخ پڑتی چادریں۔ لٹکتا ہوا بے جان ہاتھ۔ زخمی چہرے، بند آنکھیں۔

اس نے بے اختیار دیوار کا سہارا لیتے رک کر سر اٹھایا۔ اس نے جمیلہ داؤد کو چیختے، اور روتے ہوئے، سٹریچر سے چادر ہٹاتے ہوئے دیکھا۔ اس نے اعظم شیرازی فرش پر جھکتے اور گرتے دیکھا۔

وہ خون سے سرخ پڑتے کپڑوں کے ساتھ اپنی جگہ پر ساکت سا، بے حس ہوا، کھڑا تھا۔ اس کے تاثرات میں موت کی سی ویرانی اتری ہوئی تھی۔ اس نے خود کو جمیلہ داؤد کے سامنے پایا۔ انہیں بازوؤں میں بھر کر وہ پیچھے ہٹا رہا تھا۔ وہ چیختے ہوئے اپنا آپ چھڑا رہی تھیں۔ وہ اپنے مضبوط بازوؤں کے حصار میں لے چکا تھا۔ وہ اس کے سینے میں منہ چھپائے رو رہی تھیں۔ وہ بے قابو ہو کر بار بار۔ اپنے شوہر اور بیٹے کی طرف لپک رہی تھیں۔ وہ منظر دھندلا پڑنے لگا۔ اس کی سکت اور ہمت ختم ہونے لگی۔

"حماد! حماد!" وہ اسے آوازیں دے رہی تھیں۔

راحم قدرے فاصلے پر ہی رک گیا تھا۔

اگلی صبح تک کار کریش کی خبر شہ سرخیوں میں دکھا دی گئی تھی۔

حالانکہ۔ وہ موت کا کھیل فائرنگ سے شروع ہوا تھا۔

☆☆☆

اس نے جنید لاشاری کو ہارون اور حماد شیرازی کے جنازے پر شرکت کرتے دیکھا۔ اپنی بہن کے غم میں نڈھال انہیں گلے لگا کر ان کے بیٹے کے لیے روتے دیکھا تھا۔ وہ اعظم شیرازی کے سامنے بھی رکا تھا تھے۔ وہ شخص اس کے سامنے ہی کھڑا تھا۔ کئی سال پہلے۔ اس نے اس کی جان لینے کی کوشش کی تھی۔ اور کئی سال بعد اس نے اپنی بہن کا گھر اجاڑ دیا تھا۔ کیا پیسہ، دولت میں اتنی طاقت ہے کہ اس کے لیے قیمتی زندگیوں سے کھیلا جائے؟ وہ اس شخص کی آنکھوں میں جیت اور فتح کا رنگ دیکھ سکتا تھا۔ اس نے اپنے طور پر اعظم شیرازی کی نسل ختم کر دی تھی۔ اس نے اپنے حریف کو اکیلا تنہا، لاچار بے بس کر دیا تھا۔ بہن نیم پاگل تھی۔ اب جو کچھ بچا تھا۔ صرف اس کا تھا۔ کنٹرول بھی۔ حکومت بھی۔ جس دشمنی کو دبانے کے لیے، اور جس کاروبار کو فروغ دینے کے لیے یہ شادی ہوئی تھی۔ تو وہ مقصد بالآخر پورا ہو ہی گیا تھا۔ یہ گھر، بنگلے، جائیداد اور شیرازی انٹرپرائزز۔ یہ سب کچھ اب ان کے قبضے میں جانے والا تھا۔ وہ اس شخص کی شاطر نگاہوں کو دیکھ سکتا تھا...

تین دن کی تعزیت اور پھر گھر میں ایک خاموشی۔ ایک سناٹا سا چھا گیا۔ غم اور سوگواری فضاء ہر طرف پھیلی رہی۔ کمرے سنسان۔ ملازموں کی سرگوشیاں معدوم۔ روشنیوں میں سفید ٹائلز، سفید کفن جیسے لگنے لگے۔



اس رات وہ وہیں تھا۔ وہ اعظم شیرازی کے ساتھ ان کے کمرے میں ان کا خیال رکھنے کے لیے رکنا چاہ رہا تھا۔ جہاں سب ملازم جنید لاشاری کے حکم پر کمرہ چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ وہ وہاں کھڑا رہ گیا تھا۔

"سنا نہیں میں نے کیا کہا؟" جنید لاشاری نے ایک دم سے تلخ ہو کر حکم دیا۔ اس کی خطرناک حد تک سرخ پڑتی آنکھوں میں غیض و غضب کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا۔ مٹھیاں سختی سے بھینچ کر اپنے غصے پر قابو پا لیا۔ ایک گیم اس نے کھیلا تھا۔ تو ایک چال اسے بھی چلنی تھی۔

"مجھے انہیں اکیلا چھوڑنے کی اجازت نہیں ہے!" وہ بولا تو آواز بے حد کرخت تھی۔

"کون ہو تم؟" جنید لاشاری کو اس کے لہجے سے عجیب خطرے کا احساس ہوا تھا۔ ملازم کم از کم اس طرح اس لہجے میں بات نہیں کر سکتے تھے۔

"اعظم شیرازی کا ملازم ہوں۔ فارس۔ فارس وجدان!"

صوفے پر نڈھال سے بیٹھے اعظم شیرازی نے نیم وا آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔ وہ اپنی وہی پہچان برقرار ہوئے تھا جو انہوں نے اسے دی تھی۔ حالانکہ اس لمحے۔ اس کی موجودگی میں۔ اپنی کمزوری کی حالت میں۔ وہ کسی انتقامی کارروائی کی توقع رکھے ہوئے تھے۔ اس کے دل میں کوئی خوف جمانے والا نہیں رہ گیا تھا۔ گرج دار آواز اب مردہ ہو گئی تھی۔ تحکمانہ لہجہ ختم ہو چکا تھا۔ وہ اسے دیکھ رہے تھے۔ اس بات سے قطعی بے خبر کہ جنید لاشاری اسی وقت جھٹکے سے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ دوسرے ہی پل اس نے اپنے شاک بھرے تاثرات کو چھپانے کی کوشش کی تھی۔ وہ لڑکا اجنبی سا تھا، کبھی تصور میں اس کی تصویر بھی نہ تھی۔ مگر اسے وہ نام یاد رہا تھا۔ فارس وجدان۔ وہ اسے کبھی بھی بھول نہیں سکا تھا۔

نام کے ساتھ ہی اس کے خدوخال میں اس چودہ پندرہ برس کے لڑکے کی واضح شبیہ نظر آنے لگی تھی۔ خصوصاً آنکھوں کا رنگ۔

کیا وہ اسے پہچان چکا ہے؟ یہ پہلا خیال تھا جو جنید لاشاری کے ذہن میں آیا تھا۔

"اوہ!! کبھی دیکھا نہیں تمہیں!"

"خاص آدمیوں میں سے ایک ہوں۔ ہر جگہ نظر نہیں آتا!" اس کی لہجے کی برودت آنکھوں سے جھلک رہی تھی۔ اعظم شیرازی کے لب کپکپائے۔

"حیدر سے بھی خاص؟" یونہی سوال کیا۔ اسے اعظم شیرازی کے ایک ایک آدمی کا علم تھا۔ ان کے کئی گارڈز تک اس کے اشاروں پر چلتے تھے۔

"اگر آپ مل چکے ہوں تو۔" جواب دیے بغیر اس نے دروازہ کھول کر انہیں باہر کا راستہ دکھایا۔

"صاحب آرام کرنا چاہتے ہیں!!"

جنید لاشاری کی پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار ہوئے تھے، آنکھوں میں مبہم سا شاک ہنوز ٹھہرا رہا۔ تاثرات البتہ سنجیدہ تھے۔ وہ کمپوزڈ لگ رہا تھا۔

"ٹھیک ہے!" اس نے مزید بحث کا ارادہ ترک کر دیا۔ اس لڑکے کو وہ یاد تھا یا نہیں۔ یہ الگ ہی معاملہ تھا۔ مگر ایک بات طے تھی۔ وہ اسے پہچان نہیں سکا تھا۔ ایسا کر لیتا تو کم از کم اس طرح سے بات نہ کرتا۔ یقیناً اسے وہ حادثہ یاد نہیں رہا ہو گا۔

جنید لاشاری جا چکا تو ضبط کی سرخی آنکھوں میں لیے اس نے اعظم شیرازی کی طرف قدم اٹھائے۔ اس وقت کمرے میں ان دونوں کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ وہ ان کی نظروں میں عجیب سا تاثر دیکھ سکتا تھا۔ وحشت یا خوف بھرا نہیں۔ بس اس بات کا ادراک کرتا ہوا تاثر کہ وہ لڑکا اب ان سے ایک ایک ظلم کا بدلہ لے گا۔

ان تین دنوں میں ایک بار بھی انہوں نے اسے اپنے بھائی یا باپ کے لیے روتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ تعزیت کے دوران سفید شلوار سوٹ میں ملبوس ایک ہی جگہ پر، ایک ہی کونے میں اطراف سے یکسر بے نیاز، خاموش، ویران بیٹھا رہا تھا۔ تعزیت پر کوئی

ایک انسان بھی اس کے پاس نہیں گیا تھا۔ کسی کو بھی۔ اس کے نقصان، خسارے اور رشتے کا علم نہیں تھا۔

وہ سر اٹھائے اسے دیکھ رہے تھے۔ شاید وہ کچھ کہنے آیا ہے۔ شاید کوئی غصہ، بدلہ، انتقام۔ کہ ان کے پاس کمرے میں رہنے کا حکم اسے اور کون دے سکتا ہے؟ وہ تو اس حالت میں بھی نہیں تھے کہ کچھ کہہ پاتے۔

فارس نے خاموشی سے تکیہ درست کیا تھا۔ لحاف ہٹا کر جگہ بنائی تھی۔ پھر انہیں سہارا دے کے صوفے سے اٹھایا تھا۔ بیڈ پر لٹایا تھا۔ پانی کا گلاس بھر کر اپنے ہاتھوں سے ہی پلانے لگا کہ ان کے ہاتھ بہت بری طرح سے کپکپا رہے تھے۔

انہیں لگ رہا تھا، وہ ان کی جان نکالنے آیا ہے۔ اور وہ جان ایسے نکالے گا اس کا تو گمان بھی نہیں تھا۔

وہ ایک دم سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ اس کے سامنے، اسے خود سے لگائے۔ انہیں ایک دم سے احساس ہوا۔ ان کا اور اس کا نقصان ایک ہی تھا۔ قریبی رشتوں کو دونوں نے کھو دیا تھا۔ مگر اسے رونا نہیں آ رہا تھا۔ اس کا دل پتھر اور ساکت تھا۔ اس کی آنکھ سے ابھی تک ایک آنسو بھی نہیں ٹپکا تھا۔

انہوں نے اپنے بیٹے کو، جوان پوتے کو کھویا تھا۔ ان کی ساری زندگی کی جمع پونجی ختم ہوئی تھی۔ ان کے تمام کے تمام فیصلے، ارادے، خواب اور امید۔ خاک مٹی دھول ہو کر رہ گئی تھی۔

وہ روتے رہے۔ وہ بیٹھا رہا۔ اس نے اپنے بازوؤں کی گرفت بھی ان پر نہیں جمائی۔ انہیں حوصلے کے لیے کوئی ایک جملہ بھی نہ کہا۔ کتنے سال لگے تھے انہیں ایک بت میں تراشتے ہوئے۔ اب وہ مجسمہ ہو کر کیسے بول پڑتا؟

اس رات وہ ان کے کمرے میں ہی رہا۔ اس رات بھی وہ سو نہیں سکا۔

☆☆☆

جنید لاشاری کا دماغ گھوما ہوا تھا۔ آنکھوں میں شاک اور بے یقینی کا تاثر تھا۔ فارس وجدان اگر کوئی ملازم ہوتا تو زندہ نہ ہوتا۔ اور اگر زندہ ہوتا تو اسے مردہ نہ کیا جاتا۔ اعظم شیرازی کی یہ چال سمجھ سے باہر ہو گئی۔ اس لڑکے کو اس حد تک بچانے کی کوشش کیوں کی گئی؟ اسے چھپایا کیوں گیا!؟ وہ دو بار شیرازی ہاؤس گیا اور ہر بار وہ اسے اعظم شیرازی کے ساتھ ہی نظر آیا۔ وہ ایک لمحے کے لیے بھی انہیں چھوڑ کر نہیں جاتا تھا۔ اس کے سامنے تو بالکل بھی نہیں۔ اس کی چال، انداز، لہجے اور تاثرات سے یہ نہیں لگتا تھا کہ وہ کوئی ملازم ہے۔ مگر وہ دیکھ رہا تھا۔ وہ یہی بن کر دکھا رہا ہے۔

فارس وجدان!

اس رات اسے خبر ملی شیرازی ہاؤس میں وکیل کو بلایا گیا ہے۔ جو شک تھا، وہ یقین میں بدل گیا۔ اتنا بڑا پوائنٹ وہ کیسے مس کر گئے۔ اتنی بڑی خبر سے کیسے بے خبر رہے؟ ان سے یہ غلطی کیسے اور کیونکر ہو گئی۔

"وہ مجھے پہچان گیا ہے!" یہ پہلا خیال تھا جو اسے آیا۔ یہ پہلی بات تھی جو اس نے سوچی۔ دماغ ایک دم سے کام کرنے لگا۔ منصوبہ طے ہوا۔ پولیس اپنی تحقیقات کر رہی تھی۔ معاملے کو نیا رنگ اور موڑ دینے کا وقت آ گیا تھا۔

☆☆☆

سوشل میڈیا پر یہ خبر وائرل ہو گئی۔ اخبار کے فرنٹ صفحات پر، کچھ نجی ٹی وی چینلز پر بھی چلا دی گئی۔ "جائیداد کے لالچ میں ناجائز بیٹے نے اپنے باپ اور بڑے بھائی کا قتل کر دیا۔"

اس خبر نے کھلبلی سی مچا دی۔ کہ بزنس ٹائیکون اعظم شیرازی کا تو ایک ہی پوتا تھا۔ کئی سوال اٹھائے گئے، بدنامی الگ سے۔ اپنے وجود پر ایسا دھبہ۔ اور ایسا سوال اسے شدید اذیت سے دوچار کر گیا۔ پہلا تعارف اور پہچان۔ وہ پہچان جو بھری دنیا میں پھیلا دی گئی تھی۔ ناجائز اولاد!! اس کی تصویریں وائرل ہو گئیں۔ میگزین، اخبارات اور نجی چینلز کو ایک چٹپٹا سا



ٹاپک مل گیا۔

وہ گیسٹ روم میں کتنی ہی دیر تک سر جھکائے بیٹھا رہا۔ جنید لاشاری نے پہلی چال چل دی تھی۔ سارا ملبہ اس کے سر ڈالنے کا ایک راستہ نکال لیا تھا۔ کیا شاطر دماغ تھا اس کا۔ اس کی حقیقت تک پہنچنے میں ایک لمحہ نہ لگا۔ پلاننگ بھی کر لی۔ حملہ بھی۔ وار ایسا کہ وجود حصوں میں بکھیر دیا۔

اسے لگا وہ شیرازی ہاؤس سے باہر نہیں نکل سکے گا۔ کسی کا سامنا نہیں کر پائے گا۔ کسی سوال کا جواب نہیں دے سکے گا۔ اس کی ہر وضاحت کھوکھلی۔ اس کی ہر دلیل کا مذاق اڑایا جائے گا۔ اپنی چیخوں کا گلا گھونٹنے اس نے سجدے میں سر رکھا تھا اور کتنی ہی دیر تک رکھے رہا تھا۔ اس کی حقیقت اس طرح سے نہیں کھلنی چاہیے تھی۔ وہ اپنے بیمار دادا سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔

شام تک سوشل میڈیا پر ایک اور بحث چھڑ گئی۔ جو منظر دکھایا جا رہا تھا۔ وہ دھندلا پڑ گیا۔

یہ کام راحم آفاق نے کیا تھا۔ آرزو جہانگیر کے ساتھ ہارون شیرازی کے نکاح، ڈائی وورس، پیدائش سرٹیفکیٹ۔ اس نے بڑے آرام سے تمام ڈاکومنٹس ایک ایک کر کے ہر جگہ پھیلا دیے تھے۔ اس نے جنید لاشاری کی چند ایک آڈیوز بھی شائع کر دیں۔ وہ جن غیر قانونی سرگرمیوں میں ملوث رہا تھا، ان کے متعلق کچھ دستاویزات بھی۔

"ایسے ہے تو پھر ایسے ہی سہی۔ اب دیکھتا ہوں میں اسے۔" لیپ ٹاپ پر کھٹ کھٹ انگلیاں چلاتے۔ وہ گویا ہوا۔ ایک سے زائد آئی ڈیز۔ اور ہر آئی ڈی سے جگہ جگہ بحث کرتا ہوا۔ لڑتا ہوا۔ لنک شیئر کرتا ہوا۔

فارس اس کے پیچھے کھڑا تھا۔ گول عینک پیچھے کھسکا کر وہ کرسی پر پنجوں کے بل بیٹھا گھوم بھی رہا تھا۔

"یہ جنید لاشاری تو ہاتھ دھو کر تمہارے پیچھے ہی پڑ گیا ہے۔ بہت بڑا دھچکا لگا ہے بے چارے کو تمہاری صورت میں۔ پاگل ہی ہو گیا ہے!" ہنس کر لیپ ٹاپ کی اسکرین اس کی طرف گھمائی۔ "ذرا اپنی تصویروں پر یہ لڑکیوں کے کمنٹس تو چیک کرو!" اس کے تاثرات سے قطعی بے نیاز وہ اپنی کہہ رہا تھا۔

"تم یہ سب کیوں کر رہے ہو؟" اس نے راحم سے مدد نہیں مانگی تھی۔ اسے تو یہ بھی نہیں پتا تھا کہ اس کے مسئلے کا کوئی حل بھی اس کے پاس ہے۔ گزشتہ چوبیس گھنٹوں میں جو اس کی ذات سوالیہ نشان بنی تھی تو وہ سوالیہ نشان کو یوں مٹا دے گا۔ اس کا تو وہم و گمان بھی نہیں تھا۔

"میں نے اعظم صاحب سے بات کی اور انہوں نے وہ تمام ڈاکومنٹس دے دیے جو مجھے درکار تھے۔ اگر شکریہ ادا کرنا ہے تو اپنے دادا کا کرو۔ میں نے تو یہ سب صرف پبلک کیا ہے۔ اور ہاں یہ سب فری آف چارج نہیں کر رہا۔ اس سب سے نکلتے ہی تم مجھے میری منہ مانگی قیمت ادا کرو گے۔ کیا سمجھے؟ انگلیاں دکھ گئی ہیں میری ٹائپنگ کر کر کے۔ آن لائن جنگ لڑنا کوئی آسان کام ہے؟" کرسی گول گھما کر پھر اس کی طرف رخ کیا۔

"اور دیکھو جیمز اور ولیم نے بھی ساتھ دیا ہے۔ وہ اسکرین شاٹ لے کر مجھ سے صرف اتنا پوچھتے ہیں۔ راحم یہ پازیٹو کامنٹ ہے یا نیگیٹو۔ اور بس۔ پھر وہ جانیں اور ان کے کلاس فیلوز۔ یہ تم سے زیادہ جو انگریزوں نے تمہاری حمایت میں کمنٹس کر رکھے ہیں تو یہ امداد وہاں سے آ رہی ہے۔" ہنس کر بولا۔

اس کی آنکھوں میں نمی ٹھہر گئی۔ لب بھینچے رہے۔ وہ ضبط کے کڑے مراحل سے گزرتا ہوا اٹھ کر باہر چلا گیا۔ کتنی ہی دیر تک بند دروازے کے ساتھ پشت ٹکائے کھڑا رہا۔ اندر ایک آگ سی جل رہی تھی۔ جو کچھ ہو رہا تھا، وہ اس کے اعصاب پر بھاری پڑ رہا تھا۔

اسے اعظم شیرازی کے کمرے میں بلایا

گیا۔ سامنے ہی ان کے وکیل بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ وہیل چیئر پر تھے۔ حیدر ان کے پیچھے کھڑا تھا۔

فائلز میں ان گنت ڈاکومنٹس تھے، اس کا نام، اس کی پہچان۔ اس کا سب کچھ لوٹا دیا گیا تھا۔ صرف سائن کرنے کی دیر تھی۔ اعظم شیرازی نے اپنی تمام کی تمام جائیداد اپنے پورے ہوش و حواس میں فارس وجدان کے نام کردی تھی۔

وہ صدمے سے، اور ساکت نگاہوں سے انہیں دیکھتے ہوئے اپنی جگہ پر کھڑا رہ گیا تھا۔ اشارہ ملتے ہی حیدر، وکیل، ملازم۔ سب کمرے سے چلے گئے تھے۔

وہ اعظم شیرازی کو دیکھ رہا تھا۔ اور وہ گردن اٹھائے اسے۔

"میں اس لیے یہاں نہیں رکا تھا!" اس کی آنکھیں سرخ ہو چکی تھیں۔ اس کی آواز بھیگی ہوئی تھی۔ اس کا وجود لرز رہا تھا۔ اعظم شیرازی کی کیفیت بھی اس لمحے مختلف نہ تھی۔

"اعظم صاحب میں۔" اس نے اپنے دادا کو اس لمحے سسک کر اپنا سر ہتھیلیوں میں گراتے دیکھا۔

"آپ اب میرا تماشا بنا رہے ہیں۔ آپ اب مجھ پر لگائے گئے ایک ایک۔ الزام کو سچ کر رہے ہیں۔ میں اس لیے یہاں نہیں رکا تھا۔" وہ چیخ پڑا۔

"صرف اس لیے کہ کوئی آپ کے مرے ہوئے بیٹے پر سوال نہ اٹھائے۔ آپ نے نکاح نامہ پبلک کیا۔ صرف اس لیے کہ۔ کوئی آپ کے بیٹے کے کردار پر بات نہ کرے۔ آپ میرا برتھ سرٹیفکیٹ سامنے لے آئے۔"

اعظم شیرازی کا سر نفی میں ہلا تھا۔ بہت کوشش سے وہیل چیئر سے اٹھے تھے۔

"فارس!!"

وہ دو قدم پیچھے ہٹا تھا۔

"مجھے آپ کا ہر سبق اچھی طرح سے یاد ہے۔ مجھے آپ کی نفرت یاد ہے۔ مجھے آپ کا غصہ یاد ہے۔ آپ کے فیصلوں کے زخم میری روح پر ابھی بھی تازہ ہیں۔ آپ اب یہ نہیں کریں گے۔ اب آپ اس طرح سے مجھے کوئی اور غم نہیں دیں گے۔" وہ رو رہا تھا۔ وہ ان کے سامنے پنجوں کے بل جھکا، شکست خوردگی کے عالم میں۔ اعظم شیرازی کے انگ انگ میں اذیت سما گئی۔

"ہم غلط تھے۔ ہم شروع سے غلط تھے۔ ہم نے تم پر بہت ظلم کیا۔"

"کسی یتیم کے سر پر ہاتھ رکھنا ظلم نہیں ہوتا!" اعظم شیرازی کا دل چیرا گیا۔

"آپ کے بہت احسانات ہیں مجھ پر۔ اور میں ان ہی احسانات کی وجہ سے رکا۔ اس نام کے لیے نہیں۔ اپنے نام کے لیے نہیں۔ شیرازی خاندان کے لیے نہیں۔ میں یہاں۔" اس کی آواز ایک دم سے کمزور پڑی۔ "میں یہاں صرف ممی کے لیے۔ آپ کے لیے رکا تھا اعظم صاحب!!"

اعظم شیرازی کو لگا، انہیں اگلا سانس نہیں آئے گا۔

"مجھے یہ نہیں چاہیے۔" اس نے تمام کاغذات پھینک دیے۔ "میری ذات آج پورے میڈیا پر ڈسکس ہو رہی ہے۔ صرف اتنا کریں۔ مجھے پھر سے گمنام کردیں۔ جیسے پہلے کیا تھا۔ مجھے ایک بار پھر سے مار دیں جیسے۔ جیسے پہلے مارا تھا۔ ایک اور قبر۔"

وہ جس طرح سے بات کر رہا تھا۔ ٹوٹا ہوا۔ اذیت میں۔ کرب سے۔ ان کا دل بس پھٹنے کو تھا۔

"فارس!" کس قدر کوشش سے اس کا نام لیا تھا۔

"آپ پھر سے کوئی حکم دیں۔ کوئی پلان کریں۔ کچھ تو کریں۔" وہ چیخا تھا۔ اپنی ذات پر تہمت صرف عدینہ زبیر کی سہی تھی۔ اب تو کھلے عام اس کا وجود ڈسکس ہو رہا تھا۔ نکاح نامے پر بات ہو رہی تھی۔ آرزو جہانگیر کو گھیرا جا رہا تھا۔ وہ انٹرویوز دینے سے کترا رہی تھی۔ ایک قاتل بیٹے سے وہ خود کو بھلا کیوں جوڑتی۔ وہ اس خبر کی وضاحت یا تردید کچھ بھی نہ کر رہی تھی۔ اب وہ حالات سے لڑنے کی قوت



کہاں سے لاتا؟

وہ اسے دیکھ رہے تھے۔ کتنا توڑ دیا تھا انہوں نے اسے۔ کتنا مسخ کر دیا تھا اس کی ذات کو۔ کتنی بڑی اذیت سے دوچار کر چکے تھے وہ اسے۔

"یہ ہمارا فیصلہ تھا۔ ہم نے تمہیں تمہارے باپ سے جدا کر دیا!" ان کی آواز بھاری، کمزور تھی۔ اولاد اور پوتے کا صدمہ انہیں ختم کر گیا تھا۔

"ہم نے کہا۔ ہماری نسل صرف جمیلہ کی اولاد سے چلے گی۔ دیکھو تو ہمارے غرور اور تکبر نے ہمارے ساتھ کیا کیا۔ جو بات اللہ طے کرتا ہے۔ وہ ہم نے طے کرنا چاہی۔"

فارس آنکھوں میں نمی لیے انہیں دیکھتا رہا۔

"ہم نے تم سے تمہارا حق، تمہاری پہچان چھینی۔ اور ہم سے بھی سب لے لیا گیا۔"

اس نے بے اختیار نفی میں سر ہلایا۔

"ہم نے تمہیں تنہا کیا۔ آج ہم بھی تنہا ہو گئے۔"

وہ اندر تک ٹوٹنے لگا۔ مزید وہاں بیٹھنا، انہیں سننا، انہیں دیکھنا مشکل ہو گیا۔

"ہم نے حاکم بن کر فیصلے کیے۔ ہم پر اصلی حاکم کا فیصلہ آگیا۔"

ان کا پورا وجود لرز رہا تھا۔

وہ اسی وقت اٹھ کر چلا گیا۔ اعظم شیرازی کا چہرہ تر ہونے لگا تھا۔ ان کی سسکیاں سناٹے میں گونجنے لگی تھیں۔ ان کے آس پاس اب اندھیروں کے سوا کچھ بھی نہ رہا تھا۔

☆☆☆

حیدر قانونی معاملات دیکھ رہا تھا۔ قتل کی تحقیقات جاری تھیں۔ ثبوت اتنے ٹھوس تھے کہ جنید لاشاری کو فوراً ملک چھوڑنے کا فیصلہ کرنا پڑا۔ مگر اسے ایئرپورٹ پر ہی گرفتار کر لیا گیا۔ تحقیق نئے سرے سے شروع ہوئی۔ عدالت میں کیس چلا اور اس عرصے میں جتنا پروپیگنڈا اس کے خلاف ہو سکتا تھا کیا گیا۔ مقابلہ دو خاندانوں کے بیچ تھا۔ اور معاملہ بھی چھوٹا نہیں تھا۔ اس نے آخری حد تک لڑنے کا فیصلہ کر لیا۔

ساڑھے آٹھ ماہ تک وہ جنگ جاری رہی۔ اس نے کوئی اثر یا دباؤ نہیں لیا۔ کسی دھمکی کو خاطر میں نہ لایا۔

بالآخر جنید لاشاری کو عمر قید کی سزا سنا دی گئی۔

اس رات جب وہ گھر آیا تو جمیلہ داؤد کو سیڑھیوں پر بیٹھے ہوئے پایا۔ اس نے کبھی بھی انہیں اس قدر ٹوٹا ہوا نہیں دیکھا تھا۔ ان کی رنگت زرد تھی۔ وہ بیمار رہنے لگی تھیں۔

"بھائی تھا میرا۔" وہ ان کے سامنے بیٹھا تو وہ روتے ہوئے بولیں۔ "مجھ سے سب مانگتا تو دے دیتی۔ کم از کم میرا گھر تو نہ اجاڑتا۔" اس نے آنسو صاف کرتے ان کا سر اپنے کندھے سے لگایا۔ "میری شادی۔ ایک بزنس تھا ان کے لیے۔ منافع کا سودا۔ بہن کی زندگی پر کاروبار ہو رہا تھا۔" ان کا دل غم سے پھٹا جا رہا تھا۔

"ممی!"

"لاشاری خاندان تک میرا پیغام پہنچا دو۔ میرے لیے وہ سب مر چکے ہیں۔ اب کوئی میرے پیچھے نہ آئے۔ سن رہے ہو فارس۔" وہ ہذیانی انداز میں چیخی تھیں۔

"ہاں!! میں کسی کو نہیں آنے دوں گا۔ آپ پلیز۔ آپ سنبھالیں خود کو۔ ممی۔" وہ انہیں سہارا دے کر اٹھاتے ہوئے ان کے کمرے تک لے گیا۔ ان کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ وہ نفسیاتی طور پر بے حد ڈسٹرب ہو چکی تھیں۔ ڈاکٹر نے جو ادویات دی تھیں ان کے سہارے چند گھنٹوں کی نیند لے کر اٹھ جاتیں۔ پورے گھر میں گھبرائی ہوئی سی بولائی بولائی پھرتیں۔ حماد کے کمرے میں۔ حماد کی چیزوں سے لپٹی ہوئی پائی جاتیں۔ وہ ان کے پاس گھنٹوں بیٹھا رہتا۔ چپ چاپ۔ دم سادھے۔ انہیں سنتا رہتا۔ حماد کی باتیں۔ اس نے انہیں کبھی نہ ٹوکا۔

اعظم شیرازی بیمار ہو کر بستر سے لگ گئے تھے۔

وجود کو جنبش دینے سے قاصر۔ آواز ختم۔ اب وہ کوئی بات نہیں کر سکتے تھے۔ نگاہیں ٹھہر سی۔ درد میں ڈوبی۔ اذیتوں سے پُر اس کے چہرے پر جمی رہتیں۔ وہ ان کا ہر کام خود کر رہا تھا۔ ان کی دیکھ بھال کسی ملازم کے ذمے نہیں تھی۔ وہ کھانا اس کے ہاتھ سے کھاتے تھے۔ وہ پانی اس کے ہاتھوں سے پیتے تھے۔ طاقت ختم ہوتے ہوتے بس آنکھوں تک رہ گئی تھیں۔ آنکھیں جو محض آنسوؤں سے دھندلا جاتی تھیں۔ ان کی نگاہیں اس کے چہرے پر جمی رہتیں۔ انہوں نے اتنے پیارے چہرے کو اتنی نفرت سے کیوں دیکھا۔

اب وہ اس کے گال پر ہاتھ رکھنا چاہتے تھے۔ رکھ نہیں سکتے تھے۔ ماتھا چومنا چاہتے تھے۔ اور چوم نہیں سکتے تھے۔ معافی مانگنے کی خواہش تھی۔ اور مانگ نہیں سکتے تھے۔ اس رات بھی وہ ان کے کمرے میں تھا۔ وہ ان کے پاس ہی بیٹھا ہوا تھا۔

"میں ہمیشہ سے آپ کو تنہا دیکھنا چاہتا تھا۔ میں چاہتا تھا، آپ ٹوٹ جائیں۔ آپ اکیلے ہو جائیں۔ آپ کے پاس کوئی رشتہ باقی نہ رہے۔" اس کی آواز ایک دم سے کمزور پڑی۔ "لیکن بابا!" اس نے پہلی بار انہیں اس رشتے سے پکارا جو ان کا تھا۔ "مجھے آپ کو اس طرح سے دیکھ کر خوشی نہیں ہوتی۔"

اعظم شیرازی کا دل رک سا گیا۔ "آپ پہلے جیسے کیوں نہیں ہو جاتے؟ آپ پہلے کی طرح۔ آپ۔" وہ ایک دم سے سسک پڑا۔

"آپ پہلے جیسے کیوں نہیں ہو جاتے بابا؟" ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے وہ معصوم بچے کی طرح روتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ انہیں اس حالت میں دیکھ کر سب سے زیادہ تکلیف اسے تھی۔ سب سے زیادہ غم میں وہ تھا۔ جس انسان کو اس نے ہمیشہ چٹانوں کی طرح مضبوط دیکھا تھا۔ اسے ریزہ ریزہ دیکھنا برداشت سے باہر ہو رہا تھا۔ اس رات کس قدر کوشش سے انہوں نے اپنی انگلیوں کو جنبش دی تھی۔ اس نے ان کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ ہاتھ اوپر تک۔ لرزتا۔ کپکپاتا۔ اس کے گال تک آیا۔ ان کی خواہش کا ادراک کرتے اس نے وہ ہاتھ اپنے گال پر ٹھہرائے رکھا۔ ان کی آنکھیں پھر سے نم ہوئیں۔ کپکپاتے ہونٹوں پر کوئی لفظ ٹھہر گیا۔ شاید انہوں نے اس کا نام لیا تھا۔ شاید وہ کچھ کہنا چاہتے تھے۔

"بابا!" جیسے وہ جان گیا ہو، وہ اس سے کیا سننا چاہتے تھے۔

"میں آپ سے ناراض نہیں ہوں۔ میں نے آپ کو معاف کر دیا۔ میرے باپ نے مجھے خود چھوڑا تھا۔ انہوں نے مجھے آپ کے حوالے کیا۔ یہ صرف آپ کا فیصلہ نہیں تھا۔ یہ ان کی خواہش تھی۔"

اعظم شیرازی کی سسکیاں بندھ گئیں۔ "آپ چاہتے تو مجھے مار سکتے تھے۔ زندہ رکھا آپ نے۔" اعظم شیرازی کا وجود بے جان ہونے لگا۔ "آپ چاہتے تو مجھے ان پڑھ، جاہل رکھ سکتے تھے۔ نہیں رکھا۔ مجھے صرف دکھاوے کا مردہ نہیں کیا۔ چھپا کر محفوظ بھی رکھا۔ یہ احسانات ہیں آپ کے۔ آپ نے میرے ساتھ کچھ برا نہیں کیا۔ مجھے آپ سے کوئی گلہ نہیں ہے۔"

ان کے اندر کی چیخیں اندر ہی رہ گئیں۔ گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ ان کے مظالم کو ایسا رنگ دے گا۔ ان کی تکلیف کم کرنے کے لیے۔ ان کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے۔ ان کی آسانی کے لیے۔ وہ ایسا احسان کرے گا۔ کاش طاقت لوٹ آئے، وہ اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیں۔ ہاتھ جوڑ کر منت کریں کہ وہ اس طرح نہ کہے۔ وہ چیخے۔ وہ چلائے۔ وہ اپنی تکلیفوں کا الزام ان کے سر ڈالے۔ انہیں کبھی معاف نہ کرے۔ مگر فارس وجدان نے معاف کر دیا تھا۔

اس لمحے اعظم شیرازی کا شدت سے دل چاہا وقت پلٹ جائے۔ وہ لمحہ پھر سے میسر ہو جب ہارون شیرازی ننھے فارس کی انگلی تھامے شیرازی مینشن میں داخل ہوا تھا۔ وہ لمحہ جب سہمی ہوئی نگاہوں میں ان کا عکس ابھرا تھا۔ ماضی سمٹ کر حال کا حصہ بن جائے۔ موقع پھر سے ملے۔ وہ بچہ ان کے سامنے ہو اور وہ اسے قبول کر لیں۔ اپنی انا، ضد اور ہٹ دھرمی کو فنا کر دیں۔ وقت پلٹ کر پیچھے جائے اور فارس کا بستر ان کے کمرے میں ہو۔ اس کے نام کے ساتھ شیرازی لگتا ہو۔ وہ ان کے ہمراہ گھوڑے پر سوار ہوتا ہو۔ اور اپنے بھائی کا ہاتھ تھامے سبزہ زار میں گھومتا ہو۔ کھیلتا ہو اور خوب ہنستا ہو۔ فارس وجدان شیرازی مینشن میں اوپر نیچے ہر جگہ پر بھاگتا پھرتا ہو۔ کہیں کوئی حد، لکیر، یا دیوار نہ ہو۔ نہ وہ بورڈنگ اسکول میں جائے۔ نہ وہ راتوں میں بے قابو ہو کر چیختا ہو۔

وقت موقع دے کہ وہ صرف اس کو خاص کر لیں۔ اور پوری دنیا ان کے لیے عام ہو جائے۔ نہ بدنامی کا ڈر رہے۔ نہ لوگوں کا خوف۔

وہ اس کے لیے ڈٹ جائیں۔ لڑ جائیں۔

بس ایک موقع ملے اور فارس کا ہر درد چھین لیں۔ اس کی یادداشت سے اپنی تمام تر تلخ باتیں نکال دیں۔ اپنا غصہ، اپنی نفرت، اپنا تکبر ہر منفی جذبہ احساس مٹا دیں۔

بس ایک موقع۔ صرف ایک موقع کہ وہ اس محبت کو پہچان لیں جو ان کے اندر روز اول سے تھی۔ وہ محبت جو اکثر راتوں میں بے قرار کر دیتی تھی۔ وہ فون جو وہ اکثر اس کے ہاسٹل میں کرتے تھے۔ وہ ملاقات جو ہر ویک اینڈ پر ہوتی تھی۔ وہ گولی جو انہوں نے اس کے سامنے آ کر اسے بچاتے ہوئے کھائی تھی۔ انہوں نے سمجھا تھا، محض جذبات ہیں ذمہ داری کے۔ وعدہ کی رسی ہی قدموں کو جکڑ لی ہے۔ سمجھے بنا احساسات کو مبہم کرتے رہے۔ اپنی انا کی خاطر فاصلے بڑھاتے رہے۔ اس کا وجود مسخ کر کے۔ اس کی ذات کو مٹاتے رہے۔

کتنے دکھ تھے جو انہوں نے اسے دیے۔ کتنا کرب تھا جو انہوں نے اس کی آنکھوں میں ٹھہرا دیا۔ کاش وہ آنکھیں بند کر کے کھولیں اور وہ منظر سامنے ہو۔ پانچ سالہ فارس، انگلی پکڑ کر قدم رکھتا ہوا۔ ان کے بلانے پر ان سے ہاتھ ملا کر ان کے گلے لگتا ہوا۔ کیسا خواب ناک سا منظر تھا۔ آنکھوں میں ٹھہرا ہوا۔ بار بار ابھرتا ہوا۔ مٹتا ہوا۔ ان کی سسکیوں میں ڈوبتا ہوا۔

"مجھے آپ سے کوئی گلہ نہیں!" وہ بچہ ان سے کہہ رہا تھا۔

اس رات وہ آخری الفاظ تھے جو انہوں نے سنے۔ اس رات وہ آخری بار روئے۔ وہ آخری رات تھی جو فارس وجدان نے اپنے بیمار نحیف دادا کے کمرے میں ان کے پہلو میں سو کر گزاری۔ وہ پہلی اور آخری رات۔ زندگی میں وہیں ٹھہر گئی۔ کہ اگلے دن کا سورج جب طلوع ہوا تو وہ اس دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔

اپنے باپ اور بھائی کی موت پر نہ رونے والا فارس وجدان اس دن۔ اپنے دادا کی موت پر اپنے چہرے پر ہاتھ رکھے بہت شدت سے رویا تھا۔

اس نے حقیقتاً اب جیسے کوئی رشتہ کھو دیا۔ ان کی قبر میں اس کے اندر کا کوئی حصہ بھی دفن ہو گیا۔ وہ تین قبریں۔ وہ تین حصوں میں بٹا ہوا۔ رات گئے تک وہاں بیٹھا رہا تھا۔

☆☆☆

عجیب ذت ہے<br>
کسی نے ہم کو گنوا دیا ہے<br>
کسے پکاریں کہ سخت وقتوں کی زد میں آ کر<br>
کہ جس کی سنگت شکستگی<br>
میں بھی پھر سے اٹھنے کا تھی سہارا<br>
اسی نے ہم کو گرا دیا ہے۔<br>
جو غم کے دریا میں تھا ہمارا سکوں کنارہ<br>
اسی نے ہم کو بہا دیا ہے۔<br>
جو اپنے وعدوں میں ساری دنیا سے معتبر تھا<br>
ہمارا عمروں سے ہمسفر تھا<br>
اُسی نے رنج و داغ دیا ہے<br>
کسی نے ہم کو گنوا دیا ہے<br>
عجیب ذت ہے<br>
(ارسلان عباس)

چہرے پر اس کی ماں کو کھوج رہا تھا۔ اور اس کی خوبصورت آنکھوں میں اس کے باپ کو دیکھ رہا تھا۔

تصویر وہی تھی منظر بھی۔ بس کردار بدل گئے تھے۔ حکایت پھر سے لکھی جا رہی تھی۔ اعظم شیرازی کی جگہ فارس وجدان آ گیا تھا۔ فارس وجدان کی جگہ ریان شیرازی نے لے لی تھی۔

قلم اٹھالیے گئے۔

صحیفے پھیلا دیے گئے۔

امتحان شروع ہو گیا۔

فارس وجدان کا امتحان۔

اس کی ساکت نگاہیں ریان شیرازی کے چہرے پر ٹھہری رہ گئیں۔ وہ پھر سے گھٹنوں کے بل رینگتا ہوا آگے ہوا، اس کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھے، اس کے اندر چھپنے کی کوشش کرنے لگا۔

وہ فارس۔

ایک اور فارس۔

اس نے گردن جھکا دی۔

اس نے سر گرا لیا۔

اس نے شکست تسلیم کرلی۔

ریان شیرازی اب اس کی گرفت میں تھا۔ اس کے سینے سے لگا ہوا۔ شدت سے روتا بلکتا ہوا۔ ڈرا ہوا۔ سہا ہوا۔

اندھیرے سمٹنے لگے۔ ہوائیں رک کر پھر سے چلنے لگیں۔ پتوں کی سرگوشیاں بلند ہوئیں۔ زمین نے وسعت پکڑ لی۔

وہ اسے گرفت میں لیے اٹھ کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ وہ ہنوز اس کی شرٹ دبوچے، اپنے دوسرے ہاتھ کو بند رکھے، اپنا منہ اس کے سینے میں ہی دیے ہوا تھا۔ اس کا رونا ابھی تک بند نہیں ہوئے تھا۔ اس کا ننھا دل بہت شدت سے دھڑک رہا تھا۔ فارس وجدان کا کپکپاتا ہاتھ اس کی پشت پر آ ٹھہرا۔

اس کی کپکپاہٹ کچھ مدھم پڑی۔ مگر اس کی ہچکیاں بند نہ ہوئیں۔ اس کا رونا کم نہ ہوا۔

اس نے ہاتھ بڑھا کر گاڑی کی لائٹس آن کر دیں۔ تاکہ روشنی میں اس کا خوف کم ہو۔ چہرہ لال ہو رہا تھا۔ آنکھیں پھٹی ہوئی۔ ایک دہشت تھی ان میں۔ جیسے اس نے جانے کیا دیکھ لیا ہو۔ ٹشو سے اس کی ناک منہ صاف کیا۔ پانی کی بوتل اس کے لبوں سے لگائی۔ کچھ پانی گر رہا تھا۔ کچھ اس کے حلق میں جا رہا تھا۔ مگر اس کی پیاس ختم نہیں ہو رہی تھی۔

وہ اسے چپ کیسے کروائے؟

اس نے پھر اس بیگ کو کھولا جس میں اس کا سامان تھا۔ اس میں فیڈر تھا۔ اس نے فیڈر کا ڈھکن ہٹا کر اس کے لبوں سے لگایا۔ بھوک کی شدت سے نڈھال وہ دودھ پینے لگا۔ ہچکیاں ختم ہو گئیں۔ صرف سسکیوں کا گمان ہونے لگا۔

وہ کچھ سنبھل گیا تو اس نے اسے پسنجر سیٹ پر بٹھانا چاہا اور وہ چپ ہوتے ہوتے ایک بار پھر مچل کر شدت سے رونے لگا۔ وہ کسی صورت بھی اس سے الگ ہونے کو تیار نہیں تھا۔ مجبوراً ایک بازو میں اسے لیے، اس نے دوسرے ہاتھ سے اسٹیرنگ وہیل سنبھال لیا۔ گاڑی اسٹارٹ ہوئی۔

سفر شروع ہو گیا۔

ریان کی نگاہیں اب جلتی بجھتی بتیوں پر تھیں۔ کار اسکرین پر ابھرتے لفظوں پر بھی۔ رسٹ واچ کے چمکتے ڈائل پر بھی۔

چلتی ہوئی گاڑی میں، خاموشی اور سناٹے میں نیند غالب آنے لگی۔ اس کی گردن بازو پر ڈھلک گئی۔

ریان شیرازی اپنے ننھے ہاتھ سے اس کی شرٹ ہنوز دبوچے رہا تھا۔

یہ گرفت خوف سے بچنے کے لیے تھی۔

یہ گرفت تحفظ اور امن کے لیے تھی۔ ایسی مضبوط گرفت جسے دنیا کی کوئی بھی طاقت اب چھڑا نہیں سکتی تھی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)



جویریہ مریم

# حساب برابر

شام اپنے اختتام کی طرف گامزن تھی سورج کی الوداعی کرنیں در و دیوار کے آخری بوسے لے رہی تھیں۔ وہ تھکے قدموں سے گھر میں داخل ہوا تھا۔ گھر میں ہر طرف سناٹے کا راج تھا۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ اس گھر میں تین دن بعد شادی کے ہنگامے جاگنے والے ہیں۔

گھر کی آخری شادی کے ہنگامے، گھر کی سب سے چھوٹی اور لاڈلی بیٹی کے حوالے سے، سب کے دلوں میں بہت ارمان تھے اور اس نے تو سب سے زیادہ ارمان پال رکھے تھے اپنی چھوٹی بہن کو رخصت کرنے کے حوالے سے، وہ گہرا سانس لے کر دروازہ بند کرتا سست چال سے اماں کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ صحن میں لگے چھتنار درختوں کے زرد پتے اس کے قدموں تلے چرمرا کے رہ گئے تھے۔

اماں اپنے پلنگ پر لحاف میں دبکی بیٹھی تھیں اور ان کی پائنتی میں نور بیٹھی تھی۔ پیروں پر لحاف

ڈالے ملول سی سر جھکائے۔

''آجاؤ حسن بیٹا!'' اماں اسے دیکھ کر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی تھیں۔

''اتنی خاموشی کیوں ہے اماں؟'' وہ دھیرے سے استفسار کرتا اماں کے قریب ہی بیٹھ گیا تھا اماں نے ہنکارا بھرا تھا۔

''نور کے بدمعاش سسر کی ڈیمانڈ سن کر شادیانے بجانے سے تو رہے بیٹا۔ خاموش ہی ہونا ہے۔''

''اللہ وسیلہ بنائے گا ان شاء اللہ۔'' اس نے آہستہ سے کہا تو اماں بھڑک اٹھیں۔

باہر نکل گیا تھا☆☆☆

نور اپنے گھر کی سب سے چھوٹی اور لاڈلی بیٹی تھی۔ بے حد خوب صورت، خوب سیرت سب کا خیال تھا کہ نور کے رشتے کے لیے کسی قسم کی پریشانی نہیں ہوگی، اس کے لیے تو لائن لگی ہوئی رشتوں کی مگر اس وقت سب بے حد بے یقین رہ گئے جب چھبیس کا سن لگنے کے باوجود نور کے لیے کوئی رشتہ نہیں آیا تھا۔

بڑے چاروں بہن بھائی معمول شکل وصورت والے تھے مگر کم عمری میں ہی بیاہے گئے تھے۔ نور کے معاملے میں سب حیران بھی تھے اور پریشان بھی۔ بڑی مشکلوں سے ایک جگہ رشتے کی بات ہوئی منگنی بھی ہوگئی دھوم دھام سے مگر پندرہ بیس دن بعد ہی لڑکے والوں نے بغیر کسی وجہ کے انکار کردیا۔

کچھ ماہ بعد پھر سر توڑ کوششوں کے بعد ایک جگہ رشتہ پکا ہوگیا۔ مگر یہاں بھی انہونی ہوگئی تھی۔

لڑکے نے خود حسن کو فون کرکے بتادیا کہ میں اپنی ماموں زاد کو پسند کرتا ہوں اور اسی سے شادی کروں گا۔ میرے گھر والوں نے زبردستی یہاں میرا رشتہ طے کیا ہے۔ یوں یہ دوسرا رشتہ بھی ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ ہر طرف چہ مگوئیاں شروع ہوگئی تھیں۔ طرح طرح کی باتیں، نور کے کردار تک پر باتیں بننا شروع ہوگئی تھیں۔

گھر والے بہت پریشان تھے۔ سال بھر بعد ایڑی چوٹی کا زور لگا کر ایک رشتہ پھر ڈھونڈا گیا تھا۔ منگنی ہوئی مگر ہفتہ بھر بعد ہی پتا چلا کہ لڑکا آوارہ مزاج ہے، نکھٹو۔ بے روزگار اور نشئی بھی۔ یوں یہ تیسرا رشتہ انہوں نے خود ہی توڑ ڈالا تھا۔ دنیا والوں کی باتیں تھیں کہ انہیں سننا دوبھر ہوگیا تھا۔ عجیب، پریشانی کا عالم تھا۔

اللہ اللہ کرکے کسی رشتہ کروانے والی کے توسط سے چوتھا رشتہ تلاش کیا۔ ہر طرح کی تحقیق کی گئی

''زبان بھی کوئی چیز ہوتی ہے بیٹا! بدنامی کا خوف نہ ہوتا تو لحہ لگاتی میں اس رشتے کو ختم کرنے میں، یہ بات اگر وہ بدفطرت انسان پہلے ہی کہہ دیتا تو...''

''چھوڑیں اماں! اب جلنے کڑھنے سے کیا ہوگا ایک دوست سے قرض کی بات کی ہے میں نے، صبح مل جائے گا ان شاء اللہ۔'' اس نے اماں کے غصے کے گراف کو کم کرنے کی کوشش کی تھی۔ مگر ناکام رہا تھا۔

''ہاں، جب اس بدبخت نے پہلے یہ کہا تھا کہ بارات میں سو بندے آئیں گے اور جہیز کی ضرورت نہیں ہے۔ تو تین دن پہلے چار سو بندوں اور ون ٹو فائیو کا پیغام کیوں دیا ہے۔ خدا کی قسم! اگر لڑکا اتنا قابل اور خوب صورت نہ ہوتا اور نور کی تین منگنیاں نہ ٹوٹ چکی ہوتیں تو میں فوراً انکار کردیتی۔ غضب خدا کا۔ فقیر غنی بن گئے ہیں یہ لڑکوں والے، دیکھ نہیں رہے کہ بن باپ کی بچی ہے اور تینوں بھائی تنخواہ دار ملازم ہیں۔''

بول، بول کے اماں کا سانس پھول گیا تھا۔ نور نے جلدی سے اٹھ کر پانی پلایا تو حالت سنبھلی تھی۔ حسن چپ بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا۔ پھر گہری سانس لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے لبوں پہ مسکراہٹ تھی۔ اماں نے اس کی مسکراہٹ کو عجیب سی نظروں سے گھورا تھا۔

''اماں آپ پریشان نہ ہوں میں نے نور کے



سسر سے حساب برابر کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔'' وہ مسلسل مسکرا رہا تھا۔

نور نے چونک کر اپنے بھائی کو دیکھا تھا۔ اماں خاموشی سے تسبیح کے دانے گرانے میں مشغول ہوگئی تھیں۔

''کیا فیصلہ بھائی؟'' نور نے حیرت سے استفسار کیا تھا۔

''بس دیکھتی جاؤ گڑیا!'' وہ اس کا سر تھپتھپاتا اور سب کے دل مطمئن ہوگئے۔ لڑکے کی طرف سے بھی اور اس کی فیملی کی طرف سے بھی، مگر پھر بھی دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کب کوئی انہونی ہوجائے۔

نور کے سسر نے کسی قسم کی کوئی ڈیمانڈ نہیں کی تھی۔ ان کے تین بچوں کی شادی تھی۔ دو بیٹوں اور ایک بیٹی کی۔ دن طے تھے۔ دونوں طرف شادی کی تیاریاں عروج پر تھیں۔ نور بھی مطمئن ہوگئی تھی اور خوشی خوشی اپنی شادی کی شاپنگ میں مشغول تھی تینوں بڑے بھائی اور نور سے بڑی سمیرا، سب بڑھ چڑھ کے حصہ لے رہے تھے۔ اپنی حیثیت سے زیادہ جہیز لیا گیا تھا اور بارات کے کھانے کا انتظام بھی بہت بہترین تھا۔ سب مطمئن تھے مگر یہ اطمینان اس وقت اڑنچھو ہوگیا۔ جب شادی سے تین دن پہلے سویرے، سویرے نور کے سسر نے فون کھڑکا کر اطلاع دی کہ بارات میں چار سو بندے ہوں گے اور بھاری بھرکم جہیز کے ساتھ 125 موٹر سائیکل کا ہونا نہایت ضروری ہے اگر منظور ہے تو ٹھیک، ورنہ میرے بیٹے کے لیے ارجنٹ رشتے بہت ہیں تم اپنی بیٹی کے لیے کوئی اور رشتہ ڈھونڈ لو۔ اللہ اللہ خیر صلا۔''

اب کی بار کوئی تصور بھی نہ کر پا رہا تھا کہ اس رشتے کو بھی ہاتھ سے نکل جانے دیں۔ انتہائی مجبوری کے عالم میں 125 اور چار سو بندوں کے کھانے کا انتظام کیا گیا۔ مگر جب بارات آئی تو وہ کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ پانچ سو باراتی تھے۔

حسن ٹھنڈہ آہ بھر کر چھوٹے بھائیوں کی طرف پلٹا اور سو باراتیوں کے کھانے کے آرڈر کے لیے انہیں دوڑایا۔ تیار شدہ کھانا مل تو گیا تھا مگر بہت مہنگا۔ وہ تینوں بھائی خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے تھے۔ ان کی حالت دیکھ کر نور کے سسر کے قریبی رشتہ دار نے انہیں چپکے سے بتایا کہ نور کا سسر انتہائی عیار اور فارغ بندہ ہے۔

تینوں بچوں کی شادیاں دو، دو دن کے وقفے سے طے کی ہیں۔ دونوں بیٹوں کے ولیمے میں بیٹی کو رخصت کردے گا اور اپنی بیٹی کی بارات میں اس نے صرف ساٹھ آدمی بلائے ہیں۔ وہ ہکا بکا رہ گئے تھے یہ سب سن کر، انتہائی ناگواری بھرے تاثرات چہرے پر سجا کر انہوں نے بارات کو رخصت کیا تھا۔ نور کا سسر حسن سے گلے مل کر پلٹا تو حسن اس کی پشت کو خونخوار نظروں سے گھور کے رہ گیا تھا، وہ اس سے حساب برابر کرنے کے بارے میں تو تین دن پہلے ہی سوچ چکا تھا مگر اب اس نے اس حساب میں مزید اضافہ کرلیا تھا۔ اگلی صبح نور کے لیے ناشتا لے کر جانے والوں کی تعداد پچاس تھی۔ اور یہ فیصلہ حسن کا تھا۔

ناشتا دے کر وہ لوگ جلدی واپس آگئے تھے۔ یہ بھی حسن کی تاکید تھی۔ ہاں اتنی دیر ٹھہرے تھے کہ ناشتا کرکے واپس آئے تھے۔ پچاس لوگوں کو انہوں نے پانچ، پانچ سو نقدی دے کر رخصت کیا تھا۔ پھر نور کو لے کر آنے کی باری آئی تو حسن نے پورے نوے لوگوں کو تیار کرلیا تھا۔ اور کسی کی ایک نہیں سنی تھی۔

جب نوے لوگوں کا قافلہ وہاں پہنچا تو نور کے سسر اڑی رنگت سمیت کھڑے رہ گئے تھے۔ پھر بھاگم بھاگ ان کے لیے کھانے کا انتظام کیا گیا تھا۔ حسن گھر آکر خوب ہنسا تھا۔ نور کے سسر کے چہرے کے زاویے یاد کرکر کے، اگلے دن وہ لوگ مکلاوے کے لیے آگئے تھے۔ حسن کا خیال تھا کہ پچاس سے کم تو کسی صورت بھی نہیں ہوں گے مگر وہ جب گیٹ پر ان کے استقبال کے لیے نکلا تو بمشکل اپنے قہقہے کو ضبط کر پایا تھا۔ ❁

شبنان ملک

# ہری مرچیں

اماں جب سالن پکاتیں تو سالن میں تین چار ثابت ہری مرچیں ضرور ڈالتیں۔ اگر ابا دیکھ لیتے تو وہ خوب خفا ہوتے اور کہتے۔

''اری نیک بخت ہزار بار بولا ہے ہری مرچیں اگر ڈالنی ہوں تو کاٹ کر ڈالا کرو۔ ثابت ہری مرچ دیکھ کر میرے منہ میں آگ لگ جاتی ہے۔'' اماں خاموشی سے سالن بھونتے جاتیں۔ ''کھمبے سے بول رہا ہوں کوئی اثر ہو رہا ہے تمہاری ماں پر اتنی مرچ ڈالے گی تو یہ ہی حال ہوگا۔'' ابا مجھے درمیان میں لے آتے میں ہوم ورک کرتے ہوئے تھوڑا سا مسکرا دیتی۔

اماں اور ابا کی اکثر نوک جھونک ہوتی رہتی تھی۔ ابا، اماں کو مذاق میں چڑاتے اور اماں چچ میں چڑ جاتیں۔ ایسے میں اگر حماد بھیا ہوتے تو وہ ماں کی سائیڈ لیتے اور اماں خوشی سے نہال ہو جاتیں ابا جان بوجھ کر خفا ہو جاتے۔ لیکن اماں نے ابا کی مرچوں والی بات پر کبھی بحث نہ کی تھی۔ وہ ہمیشہ خاموش ہو جاتیں۔

ابا سرکاری ملازم تھے۔ ساری زندگی ایمان داری سے کمایا اور ریٹائر ہوگئے۔ ابا کی قلیل تنخواہ میں اماں نے بہت سمجھ داری اور کفایت شعاری سے گزارا کیا۔ ابا کی محدود آمدنی میں اماں نے ہم چار بہن بھائیوں کو پڑھایا لکھایا اور بڑی دو بہنوں کی شادی کر دی۔ بڑی دونوں بہنوں کے بعد حماد بھیا تھے۔ جو تعلیم مکمل کرنے کے بعد جاب کی تلاش میں جوتیاں گھس رہے تھے۔ میں اماں اور ابا کی سب سے چھوٹی اور لاڈلی بیٹی تھی۔ میری عمر اٹھارہ سال تھی۔ میں میٹرک کا رزلٹ آنے کا انتظار کرتے ہوئے، اماں سے کھانا پکانا بھی سیکھ رہی تھی لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

☆☆☆

رزلٹ آنے سے پہلے میرے لیے ارسلان کا رشتہ آ گیا۔ میں نے خوب رونا دھونا مچایا کہ مجھے آگے پڑھنا ہے کوئی شادی کی بات نہ کرے۔ حماد بھیا نے بھی بہت رولا ڈالا۔

''ارے اماں! کیا ہو گیا ہے۔ اتنی سے بچی پر آپ کو ترس نہیں آ رہا۔ اس کی شادی کی عمر ہے بھلا۔''

لیکن اماں نے حماد بھیا کو بھی خاموش کروا دیا۔

''بس کرو حماد! خاموش ہو جاؤ۔ میرا دماغ خراب مت کرو۔ یہ ہی عمر ہوتی ہے شادی کی۔ تمہاری بڑی آپی کی شادی سترہ سال کی عمر میں ہوئی تھی۔ اچھے رشتے روز روز نہیں ملتے۔ تمہارے ابا نے سب پتا کر لیا ہے، شریف لڑکا ہے سرکاری نوکری ہے۔ اپنا گھر ہے۔ ایک بہن ہے شادی شدہ۔ ماں بھی بھلی عورت ہے۔ تم سمجھاؤ منال کو۔'' بڑی آپی بھی مجھے سمجھانے چلی آئیں۔ ارسلان سب کو پسند آیا تھا۔ ہماری طرف سے ہاں کر دی گئی۔ اماں شادی کی تیاریوں میں لگ گئیں اور میں منہ پھلائے سارا دن کام کرتی رہتی۔

''ناراض ہے مجھ سے میری بیٹی۔'' میں کچن میں سالن بنانے کی تیاری کر رہی تھی جب اماں چلی آئیں۔ میں نے نہ میں سر ہلا دیا۔

''اچھا تو پھر منہ کیوں لٹکایا ہوا ہے؟'' اماں نے ٹھوڑی سے پکڑ کر میرا چہرہ اوپر اٹھایا اور میری پیشانی چومی۔

''آؤ بیٹھو میرے پاس۔'' اماں مجھے بٹھا کر خود بھی میرے پاس بیٹھ گئیں۔

''بیٹیاں کبھی بھی ماں باپ پر بھاری نہیں ہوتی۔ بیٹیاں ماں باپ کے جگر کا ٹکڑا ہوتی ہیں۔ بیٹیوں کو خوش دیکھ کر ماں کا دل ٹھنڈا رہتا ہے۔ ارسلان اچھا لڑکا ہے۔ وہ تمہیں خوش رکھے گا۔ اب دیکھو، تمہاری بڑی آپی نے میٹرک کیا ہے لیکن اپنے گھر میں خوش ہے۔ چھوٹی نے انگلش میں ماسٹر کیا ہوا ہے لیکن وہ لوگ اس کی قدر نہیں کرتے۔ تم ہر پریشانی کو دل سے مٹا دو اور خوشی سے شادی کی تیاری کرو۔''

اور میں اماں کی باتیں سن کر مسکرا دی۔

''چلو اب سالن پکانا شروع کرو اور جب سالن بنانا تو اس میں دو تین ثابت ہری مرچیں ڈال دینا۔ عورت کے کام آتی ہیں۔''

امی کی یہ نصیحت سن کر میں مسکرا دی۔ لیکن شکر ہے وہاں ابو نہیں تھے۔

☆☆☆

وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا اور میں ارسلان کی دلہن بن کر اس کے گھر آ گئی۔ وہ لوگ بہت محبت کرنے والے تھے۔ ارسلان چاہتے تھے کہ میں آگے پڑھوں اور تعلیم مکمل کروں لیکن مجھے پڑھائی کا ٹائم ہی نہیں ملا۔ اللہ پاک نے میرے آنگن میں دو جڑواں پھول کھلا دیے۔

یہ میری ماں کی تربیت ہی تھی کہ میں بچوں کے ساتھ گھر بھی بہت اچھی طرح سنبھال لیتی۔ ارسلان کی تنخواہ میں ہمارا بہت اچھا گزارا ہو رہا تھا۔ جب دنیا میں خوف ناک وبا آ گئی۔ زندگی کی اچھی بھلی چلتی گاڑی ہچکولے کھانے لگی۔ ارسلان
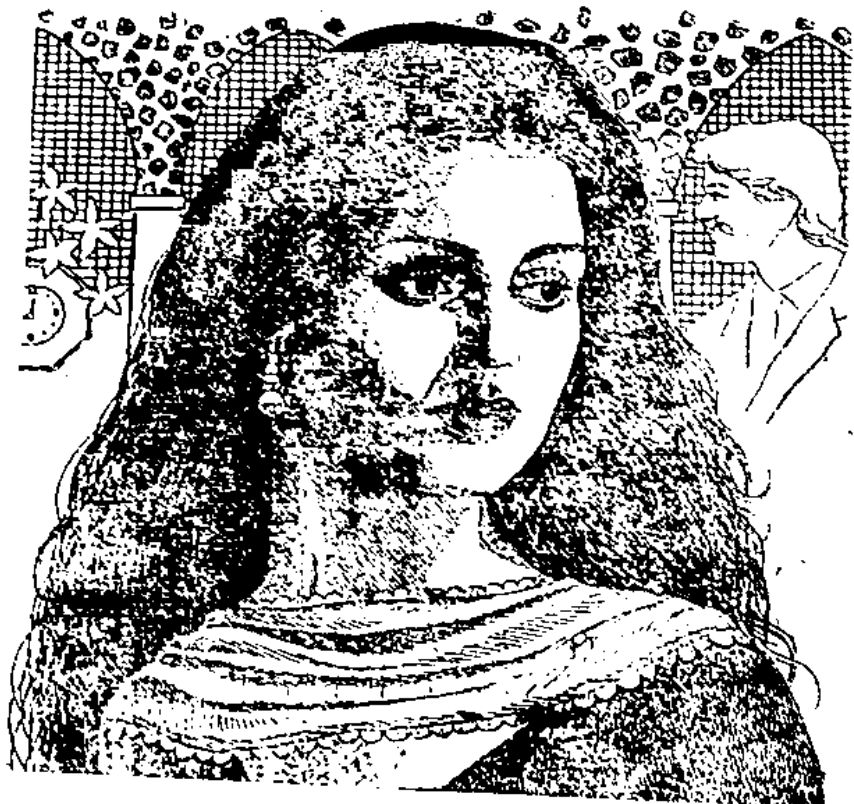
(ی) جاب چھوٹ گئی۔ میری ساس بیمار ہوگئیں۔ (ا)رسلان بہت کوشش کرتے کہ انہیں کوئی کام مل جائے لیکن ہر طرف لاک ڈاؤن تھا۔ کام کہاں ملتا، سب لوگ گھروں میں محصور ہوگئے تھے۔ لیکن پیسہ گھروں میں بیٹھے ہوئے بھی خرچ ہورہا تھا۔ پریشانی بڑھتی جارہی تھی۔

میرے دونوں جڑواں بیٹے پانچ سال کے ہوچکے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں پھر سے خوش خبری سے نوازا تھا۔ لیکن اس وقت تک ہمارے حالات بہت خراب ہوگئے تھے۔ کہیں سے کوئی آسرا نہیں بن رہا تھا۔

میرے بھیا کی بھی جاب چھوٹ گئی تھی۔ ابو بیمار تھے۔ اس دن بھی ارسلان بس ایک کپ چائے پی کر صبح گھر سے نکل گئے تھے۔ گھر میں راشن ختم ہوچکا تھا۔ اماں اور بچوں نے ناشتے میں بس ایک ایک رسک لیا تھا۔ اب انہیں بھی بھوک لگ رہی تھی۔ میں نے دیکھا تو تھوڑا سا آٹا تھا میں نے اسے گوندھا ڈبے میں سے تھوڑی سی دال بھی نکل آئی۔ میں نے جلدی سے دال ابلنے کے لیے رکھ دی۔

”منال! جب سالن پکایا کرو تو دو تین ثابت مرچیں ڈال دیا کرو۔ عورت کے کام آتی ہیں۔“

اماں کا یہ جملہ ذہن میں آیا تو دل بھر آیا۔ میں نے تین ثابت مرچیں دھو کر دال میں ڈال دیں۔ خالی کچن دیکھ کر پہلے ہی دل دکھ رہا تھا۔ ارسلان بچوں کی خوراک کا بہت خیال رکھتے تھے۔ ان کے کھانے کی ہر چیز لے آتے تھے لیکن اب کچھ دنوں سے، وہ صرف دال روٹی پر آ گئے تھے۔

”امی! بھوک لگی ہے۔“ چھوٹو نے میری قمیض پکڑی تو میں نے جلدی سے آنکھیں صاف کیں اور کہا۔

”آپ چلو میں ابھی کھانا بنا رہی ہوں۔“

مونگ کی پتلی سی دال اور پتلی پتلی چپاتی، اماں اور بچوں نے خاموشی سے کھالیں اور سو گئے۔

ارسلان تین بجے گھر لوٹے تو تھکے ہارے تھے۔ ان کے پاؤں مٹی میں اٹے ہوئے تھے۔ مجھے پتا تھا کہ ارسلان بھوکے ہیں اور میرے تو پیٹ میں بل پڑ رہے تھے۔

میں نے ہانڈی دیکھی تو اس میں تین ہری مرچیں پڑی ہوئی تھی۔ ان کے ساتھ دال لگی ہوئی تھی۔ وہ میں نے نکالی اور ساتھ دو چپاتیاں جو میں نے ارسلان کے لیے رکھی تھی۔ وہ ٹرے میں رکھ کر لے آئی۔ ارسلان کھانا دیکھ کر اٹھ بیٹھے۔ انہیں بہت شدید بھوک لگی تھی۔ وہ خاموشی سے نوالے توڑ کر ذرا سی دال لگا کر کھانے لگے۔ اور میں چھوٹے چھوٹے نوالے مرچوں سے کھانے لگی۔

اس وقت میرا ذہن کہیں بہت پیچھے چلا گیا مہینے کے آخر میں گزارا بہت مشکل ہوجاتا تھا تو اماں تھوڑی سی دال بناتی تھیں، جب ہمیں سالن ڈال کر دے دیتیں تو — صرف خالی دیگچی میں دو تین ہری مرچیں رہ جاتی تھیں۔ اچانک ارسلان نے مجھے پکارا تو میں واپس حال میں لوٹ آئی۔

”منال! تم پریشان مت ہو سب ٹھیک ہوجائے گا۔ مجھے کام مل گیا ہے۔ اور پیسے بھی۔“

ارسلان نے جیب سے ہزار کا نوٹ نکال کر دکھایا۔

”ابھی جا کر تھوڑا سا راشن لے آتا ہوں۔ دوپہر کو دکان بند تھی لیکن تم پریشان مت ہو۔ سب ٹھیک ہوجائے گا۔ یہ وبا چلی جائے گی اور ہم پھر سے زندگی شروع کریں گے۔“

میں مسکرانے لگی کہ ہاں یہ وبا بھی چلی جائے گی لیکن اب ماں کی نصیحت، میں کبھی نہیں بھولوں گی۔

”آج تم نے مرچیں بہت مزے کی بنائی تھیں۔“ میں نے کٹوری کی طرف دیکھا تو خالی تھی۔ ارسلان نے بھوک کے مارے، میرے حصے کی مرچیں بھی کھائی تھیں میں ہنس پڑی۔



## نظم

میرے بستر پر
نیند رکھی ہے
بس ذرا بستر پر جاؤں
تو سو جاؤں گی
یہی سوچ کر روز
بستر پر میں جاتی ہوں
تکیہ سیدھا کرتی ہوں
پھر کروٹ لے کر
لیٹ جاتی ہوں

نیند
اٹھ کر اسی وقت
میرے پہلو سے
نکل جاتی ہے
اور سامنے رکھی کرسی پر
پاؤں رکھ کر بیٹھ جاتی ہے
گھٹنوں پر بازو لپیٹ کر
مجھے دیکھتی ہے
مسکراتی ہے
میں رات آنکھوں میں
کاٹ لیتی ہوں
وہ کرسی پر اونگھتی ہے
اور سو جاتی ہے!

فرح بھٹو

چلو وہ عشق نہیں چاہنے کی عادت ہے
پر کیا کریں ہمیں ایک دوسرے کی عادت ہے

تو اپنی شیشہ گری کا ہنر نہ کر ضائع
میں آئینہ ہوں مجھے ٹوٹنے کی عادت ہے

میں کیا کہوں کہ مجھے صبر کیوں نہیں آتا
میں کیا کروں کہ تجھے دیکھنے کی عادت ہے

ترے نصیب میں اے دل! سدا کی محرومی
نہ وہ سخی، نہ تجھے مانگنے کی عادت ہے

وصال میں بھی وہی ہے فراق کا عالم
کہ اس کو نیند مجھے رت جگے کی عادت ہے

یہ مشکلیں ہیں تو پھر کیسے راستے طے ہوں
میں ناصبور اسے سوچنے کی عادت ہے

یہ خود اذیتی کب تک فراز تو بھی اسے
نہ یاد کر کہ جسے بھولنے کی عادت ہے

احمد فراز